آزادیٔ ہند کی جدّو جہد کے دو اہم کردار

جناح اور گاندھی

ایس۔ کے۔ موجمدار

بیرسٹر ایٹ لاء

ایڈووکیٹ پٹنہ ہائی کورٹ و سپریم کورٹ آف انڈیا
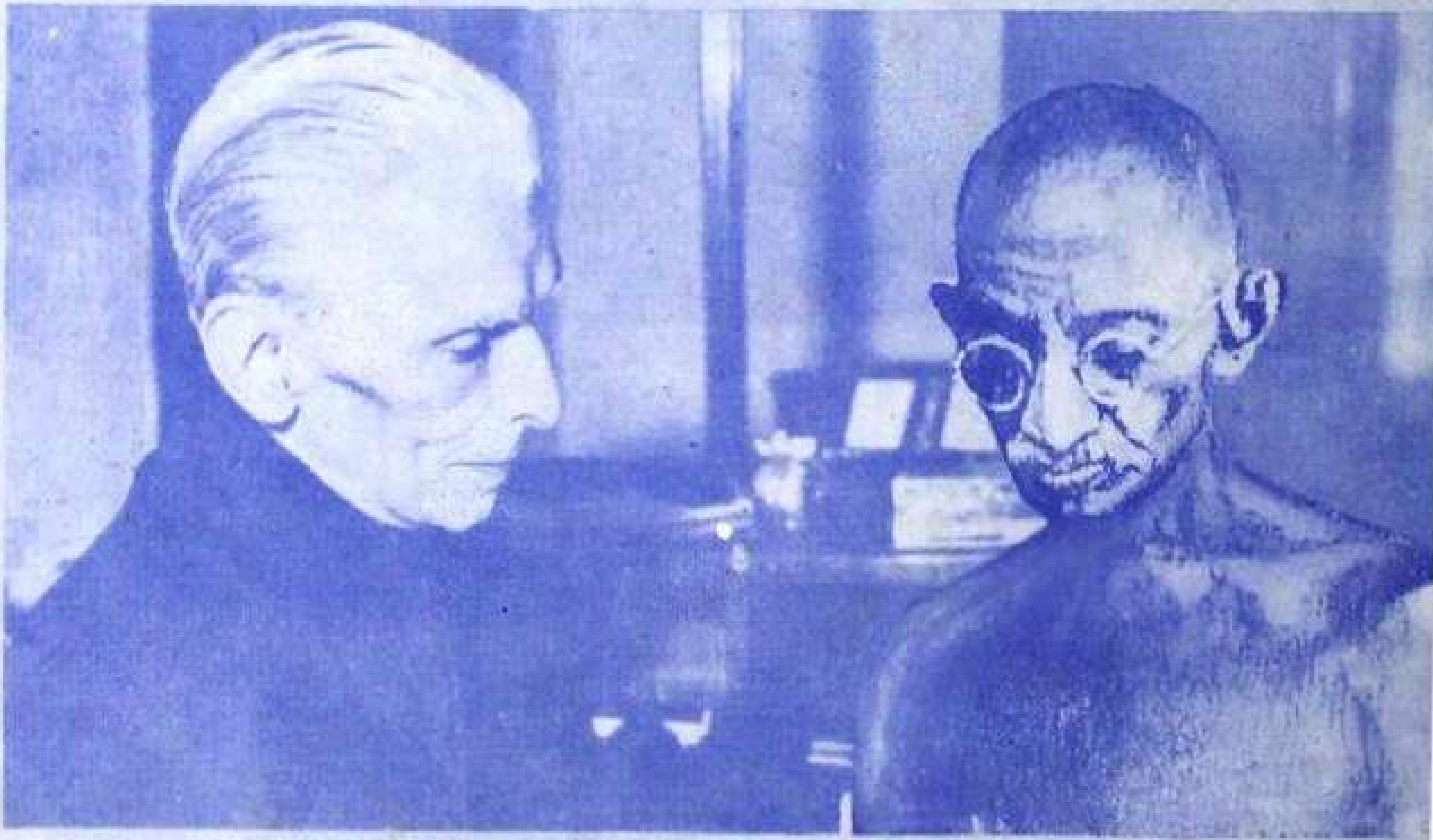
جناح اور گاندھی

جناح اور گاندھی

(ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی کے دو بڑے کردار)

ایس کے موجمدار

(بیرسٹرایٹ لاء - ایڈووکیٹ پٹنہ ہائی کورٹ اینڈ سپریم کورٹ آف انڈیا)

مترجم

ثوبیہ طاہر

سارنگ پبلیکیشنز

الاکومینشن، پٹیالہ گراؤنڈ۔ لاہور، فون: ۷۲۲۰۹۶۲

خوش ذوق قارئین کیلئے
تخلیقی و تحقیقی کتابوں کی اعلیٰ اشاعت

سارنگ پبلیکیشنز

تزئین و اہتمام

پروین ملک، وسیم گوہر

نام کتاب ———— جناح اور گاندھی
سرورق ———— ریاظ
سنِ اشاعت ———— ۱۹۹۶ء
پرنٹر ———— یاسر عمیر پرنٹرز
———— پٹیالہ گراؤنڈ۔ لاہور
پبلشر ———— سارنگ پبلی کیشنز
———— الاکو مینشن پٹیالہ گراؤنڈ لاہور
قیمت ———— ۲۱۰/- روپے

فہرست

حرف آغاز

چودھری جلیل احمد خاں نامور قانون دان اور ممتاز مسلم لیگی رہنما ہیں۔ انہوں نے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ قیام پاکستان کے وقت وہ دہلی میں تھے وہاں سے ہجرت کر کے کراچی آئے بعد ازاں گوجرانوالہ میں مستقل سکونت اختیار کی۔ وکالت کے ساتھ ساتھ سیاست میں سرگرم حصہ لیتے رہے۔ ایوب خاں کے دور میں قومی اسمبلی کے رکن بھی منتخب ہوئے۔ گوجرانوالہ ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کی صدارت کا اعزاز بھی متعدد مرتبہ حاصل کر چکے ہیں۔ چودھری جلیل احمد خاں کو قائداعظم محمد علی جناح کی ذات سے خصوصی لگاؤ اور عقیدت ہے یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے مغربی بنگال کے بیرسٹر ایس کے موجمدار کی کتاب "گاندھی اینڈ جناح" پڑھی تو اس کے اردو ترجمے کی شدید خواہش ظاہر کی۔ وہ تحریک آزادی اور قائد کی شخصیت کے ایسے پہلو قوم کے سامنے لانا چاہتے ہیں جن پر اس سے پہلے کسی نے روشنی نہیں ڈالی۔ زیر نظر کتاب کی سب سے قابل قدر خوبی یہی ہے کہ اس میں ایک غیر جانبدار مبصر اور تجزیہ نگار نے گاندھی جی اور جناح کے کردار اور طرز سیاست کا بے لاگ جائزہ لیا ہے۔ یہ تقابلی مطالعہ تاریخ و سیاسیات کے طالب علموں کے علاوہ دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لئے بھی نہایت علم افروز

ہے۔ بیرسٹر مو جمدار نے جناح کی اصول پرستی' دیانت اور صداقت کو نہایت ستائش کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ دوسری جانب گاندھی جی کے عیارانہ حربوں اور شاطرانہ ہتھکنڈوں نے انہیں شدید ذہنی و جذباتی ٹھیس پہنچائی ہے۔ بیرسٹر مو جمدار نے طویل اور مدلل بحث کے بعد گاندھی جی کو ایک ناکام سیاستدان اور تقسیم ہند کا سب سے بڑا ذمہ دار قرار دیا ہے جن کی تمام تر چالیں نہ صرف یہ کہ ہندوستان کی وحدت برقرار نہ رکھ سکیں بلکہ انہوں نے جناح جیسے بااصول اور ٹھنڈے دل و دماغ کے مالک انسان کو بھی ردعمل پر مجبور کیا کتاب کے انہی پہلوؤں سے متاثر ہو کر چودھری جلیل احمد خاں اسے اہل وطن کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے۔ انہی کی تحریک اور خواہش پر میں نے اسے اردو کے قالب میں ڈھالا۔ ان کے تعاون' حوصلہ افزائی اور شفقت پر میں ان کی شکرگزار ہوں۔

ثوبیہ طاہر

تعارف

بیسویں صدی کے پہلے نصف میں دو عظیم انسانوں' موہن داس کرم چند گاندھی اور محمد علی جناح نے ہندوستان کے سیاسی منظر نامے کو اپنی طاقتور شخصیات سے پر کیا۔ دونوں عوام کے عظیم رہنما اور ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے راہی تھے۔ سیاسی سرگرمیوں میں دونوں کے محرک عظیم مقاصد تھے لیکن دونوں کے درمیان بقائے باہمی کی کوئی گنجائش نہ تھی اس لئے کہ ان کے نظریات میں بعدالمشرقین تھا۔ ایک کی تربیت مغربی انداز سیاست میں ہوئی تھی اور دوسرا نہ صرف اس کا بری طرح مخالف تھا بلکہ خود مغربی تہذیب کو شدید نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا ان حالات میں دونوں کا ایک ہی پلیٹ فارم پر کام کرنا ناممکن تھا اور ان دونوں کے درمیان آویزش ناگزیر تھی لیکن یہ آویزش ہندوستان کے لئے تباہ کن ثابت ہوئی اور اس نے ہندوستان کی تاریخ کا دھارا موڑ ڈالا جو ہمیشہ تقسیم کی بجائے ادغام و اتحاد کا آئینہ دار رہا تھا آیئے امید کریں کہ یہ صورتحال عارضی ہے۔ گاندھی جناح کشمکش جو سیاسی حیثیت میں شروع ہوئی کیونکہ یہ مختلف سیاسی نظریات پر مبنی تھی آہستہ آہستہ انحطاط پذیر ہو کر ایک مہلک فرقہ وارانہ جنگ میں تبدیل ہو گئی۔ آخری مرحلے پر ہندوستان کی سیاسی کڑاہی فرقہ واریت کے شعلوں سے اس زہرناک انداز میں ابلنے لگی کہ گھٹن کی اس فضاء سے جو پورے ملک پر چھائی ہوئی تھی نکلنے کا بہترین ذریعہ ملک کی چیر پھاڑ ہی میں نظر آیا۔

آج کل ہندوستان کے سیاسی حلقوں میں عام تاثر یہی پایا جاتا ہے کہ اکیلے جناح ہی ہندوستان کی تقسیم کے ذمہ دار تھے۔ متعدد ہندوستانی مصنفین نے جناح کو ہلاکت آفریں فرقہ پرست کے طور پر پیش کیا ہے جنہوں نے ہندوستانی سیاست کے جسم میں فرقہ واریت کا وائرس منتقل کیا' ہندوستان کی تحریک آزادی کی مخالفت کی اور دو قومی نظریے کے پرچار سے ہندو مسلم اتحاد کو سوچے سمجھے انداز میں پارہ پارہ کیا۔ دوسری

جانب گاندھی جی کی تصویر کشی اس طرح کی جاتی ہے کہ وہ عقل و خرد' اخلاق اور محبت کا مجسمہ نظر آتے ہیں۔ اهنسا اور عدم تشدد جیسے ان کے نظریات کے ساتھ انہیں بدھ کا اوتار بنا کر دکھایا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دونوں تصویریں انتہا پسندانہ اور غلط ہیں اس کتاب میں میں نے ان کی سیاسی سرگرمیوں کا تذکرہ کیا ہے اور انہیں روبرو کھڑا کیا ہے تاکہ تقابلی جائزے سے ان کی تصویریں مناسب تناظر میں رکھی جا سکیں۔

گاندھی جی بلاشبہ ان عظیم انسانوں میں سے ایک تھے جنہیں روئے ارض نے آج تک دیکھا۔ ہندوستان کی آزادی کے لئے ان کی خدمات کو ہر جانب سے تسلیم کیا گیا ہے لیکن ساتھ ہی ایسے لوگ بھی ہیں جو گاندھی جی کی سیاست اور ان کی سیاسی تکنیک کو بھی تقسیم ہند کا اسی قدر ذمہ دار خیال کرتے ہیں جتنا کہ جناح کے دو قومی نظریے کو۔ متعدد مرتبہ گاندھی جی نے ہندو مسلم مسئلے سے غلط انداز میں نمٹنے کی کوشش کی۔ مثال کے طور پر ان کے تحریک خلافت میں سر کے بل کود پڑنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ تحریک خلافت کے حوالے سے ان کی سرگرمیوں کے مابعد اثرات بہت تباہ کن تھے کیونکہ انہوں نے مسلمانوں میں مذہبی اور فرقہ وارانہ جذبات کو ابھارنے میں مدد کی اور ان کے اور ہندوؤں کے درمیان منافرت کو بڑھایا۔

ان لاتعداد کتابوں میں' جن میں گاندھی جی کی زندگی اور عظیم الشان سرگرمیوں کا احاطہ کیا گیا ہے تندولکر کی مہاتما' پیارے لال کی مہاتما گاندھی آخری دور اور ڈاکٹر پتہ بھائی سیتارمیہ کی کانگریس کی تاریخ بہت ممتاز کتابیں ہیں۔ یہ کتابیں معلومات کی کانیں ہیں لیکن ان کے مصنفین مہاتما کی عظیم شخصیت سے اس بے طرح ڈر اور دب گئے کہ انہوں نے ان کے مقصد اور کارروائیوں پر معمولی سی تنقید کرنے کی بھی کبھی ہمت نہیں کی دوسری جانب جناح کی سرگرمیوں کو بھی ان ہندوستانی مورخوں کے ہاتھوں کبھی مناسب اور غیر جانبدارانہ نقد و نظر میسر نہیں ہوئی۔ اس سے معاصر ہندوستانی تاریخ کے مطالعے میں ایک ایسا عدم توازن پیدا ہو گیا جس نے صداقت کی

کاز کو نقصان پہنچایا۔ اس کتاب میں ایک نئے نقطہ نظر سے دونوں کی سرگرمیوں کا مطالعہ کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں اور جناح گاندھی آویزش کی تصویر کا دوسرا رخ پیش کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ یہ طریقہ کار تاریخی عدم توازن کو درست کرے گا اور آئندہ نسل کو ہندوستانی تاریخ کے ایک ہنگامہ خیز دور کے متعلق ایک واضح اور متوازن نتیجے پر پہنچنے کے قابل بنائے گا۔

II

گاندھی جی ۱۸۹۳ء میں جنوبی افریقہ گئے جہاں انہوں نے ہندوستانی آباد کاروں پر جنوبی افریقہ میں سفید فاموں کے مظالم کے خلاف جرات مندانہ جدوجہد کی۔ جنوبی افریقہ میں قیام کے ایام ہی میں وہ ٹالسٹائی، تھورو اور رسکن کی تحریروں سے شدید متاثر ہوئے۔ خصوصی طور پر رسکن کی تحریر "اس آخری حد تک" (Unto This Last) پڑھنے کے بعد انہوں نے کہ جدید شہری تمدن کو مٹانے اور اس کی جگہ ایک یو ورلڈ آرڈر یا نیا تمدن رائج کرنے کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا جس کا مرکزی خیال تھا--- "شہر سے گاؤں کی طرف مراجعت" فطرت کی طرف مراجعت' ان کے ذہن میں یہ پختہ عقیدہ پیدا ہوا کہ صرف اس طریقے سے دنیا سے تشدد ختم کیا جا سکتا ہے اور عدم تشدد یا اھنسا راج قائم ہو سکتا ہے۔ دنیا میں ایسے یوٹوپیا کا قیام گاندھی جی کا خواب تھا۔

III

مختلف نظریات پر مبنی یوٹوپیاؤں کے قیام کے لئے ماضی میں بھی کچھ عظیم مفکرین کوششیں کر چکے تھے۔ عظیم انگریز وکیل لارڈ بیکن جو ۴۰۰ برس قبل پیدا ہوئے تھے ایسے ہی خیال سے متاثر تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب "دی نیو اٹلانٹس" میں ان خیالات پر مفصل روشنی ڈالی جو ان کی موت سے دو برس قبل شائع ہوئی۔ ان کے خیالات انسانی

مقام اور انسانی صلاحیتوں پر ان کے ایمان سے پھوٹے ان کا نقطہ نظر تھا--- "سیکھنے میں ترقی اور علم کا فروغ انسانی ذہن کے خصوصی اوصاف ہیں۔ انسان محض سیدھے کھڑے ہونے والے جانور نہیں ہیں بلکہ لافانی دیوتا ہیں جو اپنی منزل مقصود کو صرف فروغ علم کی شاہراہ پر گامزن ہو کر پا سکتے ہیں۔ صرف اس راستے کے ذریعے وہ دنیا کو کنٹرول کر سکتے ہیں اور اس کی تشکیل نو کر سکتے ہیں۔" اپنے خیالات کی حمایت میں انہوں نے سب سے زیادہ اہمیت سائنس کے مطالعے اور سائنسی علم کے فروغ کو دی انہوں نے کہا---- "آیئے فطرت کے قوانین کو جان لیں اور پھر ہم اس کے مالک ہوں گے جیسا کہ ابھی ہم اپنی جہالت کی وجہ سے اس کے غلام ہیں۔ سائنس یوٹوپیا کی جانب جانے والی شاہراہ ہے۔ جب سائنس اشیاء کی ماہیت کو کما حقہ ڈھونڈ نکالے گی تو پھر دنیا وہ مقام اور مواد ہو گی جس سے انسان جو یوٹوپیا چاہے بنا لے۔ سائنس کی اس طرح تکمیل سے اور پھر سائنس کو کنٹرول کر کے سماجی ڈھانچے کی تکمیل، خود ہی یوٹوپیا کا روپ دھار لے گی' بیکن ۱۶۲۶ء میں انتقال کر گئے لیکن ان کے افکار نے ہم عصر برطانوی دانشوروں پر گہرے اثرات مرتب کئے اور ان کی موت کے ۴۰ برس کے اندر ۱۶۶۲ء میں رائل سوسائٹی قائم کی گئی جو دنیا کی عظیم ترین سائنسی تنظیم ہے۔ اس کے قیام پر رائل سوسائٹی کے اولین فیلوز نے بیکن کی یاد کو مودبانہ خراج عقیدت پیش کیا اور خصوصی طور پر انہیں اپنے لئے مثال اور محرک قرار دیا۔ ایک صدی سے کچھ زائد کے بعد فرانسیسی تحریک خرد افروزیت نے انہیں ایسا ہی خراج عقیدت پیش کیا اور اپنی دانش کے عظیم شہکار ردی انسائیکلو پیڈیا' کو بیکن کی یاد کو معنون کیا۔ بیکن کی جانب سے دی گئی تحریک کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ یورپ میں سائنسی علوم نے دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کی اور رفتہ رفتہ یورپ جدید تمدن کے ہراول دستے میں شامل ہو گیا جب کہ مشرق تاریکی اور جہالت میں ڈوبا رہا۔ ہندوستان کو سائنسی علم کی جھلک حاصل کرنے کے لئے بھی اس وقت تک انتظار کرنا تھا جب تک کہ انگریز اس کی حکمرانی سنبھالتے۔

IV

جو بیکن نے انگلستان کے لئے کیا وہی راجہ رام موہن رائے نے ہندوستان کے لئے کیا۔ ۱۹ ویں صدی کے ابتدائی حصے میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجویز پیش کی کہ ہندوستان کے عوام کو تعلیم مقامی خطوط پر سنسکرت' عربی اور فارسی زبانوں میں دی جانی چاہئے تو راجہ رام موہن رائے نے اس تجویز کی شدت سے مخالفت کی۔ ان کی رائے میں سائنس کا تعارف وقت کی فوری ضرورت تھا اور اس مقصد کے لئے یہ ضروری تھا کہ اعلیٰ تعلیم انگریزی زبان میں دی جائے حکومت نے ان کے خیالات کو منظور کر لیا اور ملک کے مختلف حصوں میں' مغربی خطوط پر آرٹس' سائنس اور طب کی تعلیم کے لئے کئی ادارے قائم کئے گئے۔ ملک کے نوجوانوں کے سامنے ایک نیا باب وا ہوا اور مغربی خیالات سے مملو' دانشوروں کا ایک نیا طبقہ ابھرا۔ انہوں نے سماجی و سیاسی اصلاحات کی تحریکیں شروع کیں۔ توہم پرستی' ابہام پرستی اور جہالت کے خلاف جو جنگ راجہ رام موہن رائے نے اپنی زندگی میں شروع کی تھی اس نے اپنا فاتحانہ مارچ ان کی موت کے بعد بھی جاری رکھا۔ یہی وہ جذبہ تھا جس نے ان مغربی خطوط پر تعلیم یافتہ نوجوانوں کی انڈین نیشنل کانگریس کی تشکیل کی جانب رہنمائی کی۔ مغرب کے ساتھ اپنے تقابل سے ہندوستان کا دانشور دماغ طویل المدت نیند سے جاگ کر اپنے نکتہ عروج پر پہنچا۔

V

راجہ رام موہن سے تقریباً ایک صدی بعد ہندوستانی منظرنامے پر ایک اور پیمبر یکسر مختلف خیالات کے ساتھ وارد ہوا۔ وہ موہن داس کرم چند گاندھی کے سوا کوئی اور نہیں تھا جن کے متعلق ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ وہ جنوبی افریقہ میں سفید فاموں کے مظالم کے خلاف اپنی عظیم جدوجہد سے شاندار نام اور شہرت کما چکے تھے یہ جدوجہد انہوں نے

جنوبی افریقہ میں ہندوستانی آبادکاروں کے لئے کی تھی۔ جب وہ ہندوستان آئے تو ان کی شخصیت کے گرد دیو مالا کا ہالہ تھا اور ان کے پاس اپنے ہم وطنوں کو دینے کے لئے ایک پیغام تھا انہوں نے کہا کہ ان تمام برسوں میں ہندوستان ایک غلط راستے پر چلتا رہا ہے اور اس کی نجات ان تمام علوم کو بھلا دینے میں مضمر ہے جو اس نے اب تک سائنس کے ذریعے سیکھے ہیں۔ ان کا پیغام تھا----- "فطرت کی جانب مراجعت" "شہروں کو رد کر دیں" اور دیہات کی جانب لوٹیں، سائنس اور ٹیکنالوجی کے راستے کو مسترد کردیں یورپی نظام طب کو رد کر دیں "مغربی تمدن کو یکسر دھتکار دیں کیونکہ یہ برائی اور تشدد کے سوا کچھ اور پیدا نہیں کرتا" انہوں نے اپنے نظریات کا اظہار اپنی کتاب "ہند سوراج" میں کیا جو ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی۔ یہاں اس کتاب میں سے کچھ اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔

"یہ انگریز نہیں ہیں جو ہندوستان پر حکمرانی کر رہے ہیں بلکہ یہ جدید تہذیب ہے جو اپنے ریلویز، ٹیلی گرافوں اور ان تمام ایجادات کے ذریعے (ہند پر حکمران ہے) جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ وہ تہذیب کی فتوحات ہیں۔ بمبئی، کلکتہ اور ہندوستان کے دیگر بڑے شہر اصلی طاعون زدہ علاقے ہیں۔

"طبی سائنس کالے جادو کا طاقتور نچوڑ ہے۔ اس کی نسبت عطائیت کئی گنا قابل ترجیح ہے۔ ہسپتال وہ آلات ہیں جنہیں شیطان اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ ہندوستان کی نجات ان تمام چیزوں کو فراموش کر دینے میں پنہاں ہے جو اس نے گذشتہ ۵۰ برس یا اتنے ہی عرصے میں سیکھے ہیں۔ ریلویز، ٹیلی گراف، ہسپتال، وکلاء، ڈاکٹروں اور ایسی تمام چیزوں کو جانا ہو گا۔"

(مہاتما گاندھی کے نظریات از ریورینڈ سی ایف اینڈریوز، صفحات ۱۸۸ - ۱۸۶)

جب گوکھلے نے گاندھی جی کی ہند سوراج پڑھی تو انہیں وہ کتاب اس قدر عامیانہ اور عجلت پسندانہ نتائج پر مبنی محسوس ہوئی کہ انہوں نے پیش گوئی کی کہ گاندھی ہندوستان میں ایک برس گزارنے کے بعد اپنی اس کتاب کو خود ہی تلف کر دیں گے (گاندھی جی کی

خود نوشت سوانح حیات' صفحہ ۴۶۷) لیکن گوکھلے کی پیش گوئی درست ثابت نہیں ہوئی۔ ۱۹۳۹ء میں گاندھی جی نے لکھا---- "ہند سوراج ۱۹۰۹ء میں لکھی گئی تھی۔ اس وقت سے اب تک اس کے متعدد ایڈیشن چھپ چکے ہیں اور اس کا دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ گزشتہ برس شریمتی سوفیہ واڈیا نے مجھ سے کہا کہ میں اس ایڈیشن کے لئے ایک حرف آغاز لکھ دوں جسے وہ شائع کر رہی ہیں۔ چنانچہ مجھے اسے دھیان سے دوبارہ پڑھنے کا خوشگوار موقع ملا۔ قاری یہ جان سکتا ہے کہ میں نے کسی ایک خیال پر بھی نظرثانی نہیں کی۔ یہ جاہلانہ تاریک ادوار میں واپس جانے کی کوشش نہیں ہے۔ بلکہ یہ حسن کو اس کی سادگی' غربت اور ست روی میں دیکھنے کی کوشش ہے۔ میں نے اس کی اپنے آئیڈیل (آورش) کے طور پر تصویر کشی کی ہے۔"

(تندولکر' جلد ۵' صفحہ ۱۷۵)

۲۵ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو گاندھی سیوا سنگھ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

"میں آپ سے کہوں گا کہ ہند سوراج کو میری آنکھوں سے پڑھیں اور اس میں وہ باب دیکھیں جس میں بتایا گیا ہے کہ ہندوستان کو غیر متشدد کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ آپ کارخانوں کی تہذیب میں عدم تشدد کی تعمیر نہیں کر سکتے آپ اسے صرف خود کفیل دیہات میں ممکن بنا سکتے ہیں۔"

(ایضاً' صفحات ۱۸۹ ـ ۱۸۵)

اکتوبر ۱۹۴۵ء میں انہوں نے جواہر لال کے نام خط میں لکھا: "میں اب ایک بوڑھا انسان ہوں چنانچہ میں نے آپ کا نام اپنے جانشین کے طور پر پیش کیا ہے۔ چنانچہ مجھے لازماً اپنے جانشین کو سمجھنا چاہئے اور میرے جانشین کو مجھے سمجھنا چاہئے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہندوستان کو آزادی حاصل کرنا ہے اور ہندوستان کے ذریعے دنیا کو بھی آزاد ہونا ہے تو جلد یا بدیر اس حقیقت کو لازماً تسلیم کرنا ہو گا کہ لوگوں کو شہروں میں نہیں بلکہ دیہات میں رہنا ہو گا۔ ہم صداقت اور عدم تشدد کو صرف دیہی زندگی کی سادگی میں سمجھ

سکتے ہیں اور یہ سادگی چرخے اور ان سب چیزوں میں تلاش کی جا سکتی ہے جو چرخے سے متعلق ہیں۔

(تندولکر، جلد ۷، صفحہ ۱۴)

وہ سائنس اور سائنسی ترقی سے قطعاً متاثر نہ تھے۔ انہوں نے لکھا "تنوع، ہوا میں پرواز اور ضروریات کی کثرت وغیرہ کے لئے جدید فنون میں میرے لئے کوئی کشش نہیں۔ یہ سب چیزیں ہمارے اندرونی وجود کو مردہ کر دیتی ہیں۔"

"رفتار زندگی کا مقصد نہیں ہے۔ میں نہ صرف ایسی تہذیب کا تصور کر سکتا ہوں بلکہ اس کے لئے کام کر رہا ہوں جس میں کار کی ملکیت کوئی اعزاز نہیں ہو گی۔ ریلویز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہو گی میرے لئے یہ کوئی ناخوشگوار واقعہ نہیں ہو گا اگر دنیا ایک مرتبہ پھر اتنی وسیع ہو جائے جیسا کہ یہ ایک وقت میں ہوا کرتی تھی۔

(تندولکر، جلد ۵، صفحہ ۱۷۵-۱۷۴)

گاندھی جی کی سائنس سے نفرت ان کے اس عقیدے کا نتیجہ تھی کہ سائنسی ترقی نے اس دنیا میں تشدد کی طاقتوں میں بے حد اضافہ کر دیا ہے۔ عدم تشدد ان کا فلسفہ حیات تھا اور وہ ہندوستان کو عدم تشدد کا مورچہ بنانا چاہتے تھے ان کے مطابق طاقت اور تشدد کو کسی بھی مشکل میں ہندوستان میں برداشت نہیں کیا جاتا تھا۔ حتی کہ اسے جارحین کے خلاف بھی ہرگز استعمال نہیں کیا جانا تھا ان کے مطابق خود تکلیف برداشت کرنا اور دیگر غیر متشددانہ ذرائع برے ذہن رکھنے والے افراد حتی کہ جارحین کو پگھلانے کے لئے بھی خاطر خواہ طاقتور ہتھیار تھے۔ جب گاندھی جی سے یہ سوال پوچھا گیا کہ اگر طاقت کو ختم کر دیا جائے اور عدم تشدد کو اپنا لیا جائے تو ریاست امن و امان اور جارحیت کے مسئلے سے کیسے نمٹے گی۔ ان کا جواب تھا: "اگر کانگریس طاقت کے استعمال سے گریز نہیں کر سکتی تو اسے اس وقت تک اقتدار طلب نہیں کرنا چاہیے جب تک کہ یہ عوام پر غیر متشددانہ کنٹرول

حاصل نہیں کر لیتی----۔ (غیر ملکی جارحیت کی صورت میں) یہ ہتھیاروں کو رد کرنے کی طرف عوام کی رہنمائی کرے گی تاکہ (اس ذریعے سے) غیر ملکی حملے کا مقابلہ کیا جا سکے اور غیر متشدد انسانوں کا ایک ایسا دستہ تیار کرے گی جو جارح کے خلاف زندہ دیوار بن جائیں گے----- (ستیا رمیہ' جلد ۲' صفحہ ۱۹۱)---- میں فوج نہیں چاہتا (صفحہ ۱۹۲)

جنگ عظیم دوم چھڑنے پر ہندوستان میں کمانڈر انچیف نے ریڈیو پر ایک گفتگو کی جس کا مقصد ہندوستانی سپاہیوں کی بھرتی تھا ۔ اس بات چیت کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے گاندھی جی نے کہا:

"میں اس خیال سے مکمل طور پر انحراف کرتا ہوں کہ ہندوستان ایک فوجی ملک ہے اور میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ میرے مطابق کسی قوم کی تشکیل و ترکیب میں دفاعی افواج سب سے کم اہمیت کی حامل ہیں-----۔ میں نے یہ امید نہیں کھوئی کہ عوام اپنے ملک کی عزت بچانے کے لئے اپنی تکلیف سہنے کی اہلیت پر بھروسہ کریں گے-----"

(تندولکر' جلد ۵' صفحات ۱۷۱-۱۷۰)

جنگ عظیم دوم کے دوران "ہر برطانوی کے نام خط' میں گاندھی جی نے اپنے اس خیال کو مزید آگے بڑھایا۔ یہاں اس خط کے کچھ مندرجات نقل کئے جا رہے ہیں۔

"میں ہر برطانوی سے اپیل کرتا ہوں خواہ اس وقت وہ کہیں بھی ہو کہ وہ مختلف اقوام کے درمیان تعلقات کی بحالی اور دیگر معاملات کے لئے جنگ کی بجائے عام تشدد کا طریقہ کار اختیار کرے-----

"میں آپ کو ایک شریفانہ اور جرات مندانہ طریقہ پیش کرنے کی ہمت کر رہا ہوں' ایک ایسا طریقہ جو بہادر ترین سپاہیوں کو زیب دیتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ نازی ازم سے اسلحے کے بغیر لڑیں اور اگر میں فوجی اصطلاح استعمال کروں تو آپ نازی ازم کے خلاف عدم تشدد کے ہتھیاروں سے لڑیں۔ میں چاہوں گا کہ آپ اپنے ہتھیاروں کو اپنے

اور انسانیت کے دفاع کے لئے بے کار خیال کرتے ہوئے رکھ دیں۔ آپ ہٹلر اور مسولینی کو دعوت دیں کہ وہ آپ کے ممالک سے جو چاہیں لے جائیں وہ سب اشیاء جنہیں آپ اپنی ملکیت کہتے ہیں۔ انہیں اجازت دے دیں کہ وہ آپ کی خوبصورت عمارتوں پر قبضہ کرلیں آپ انہیں اپنی روحوں اور ذہنوں کے علاوہ ہر چیز دے دیں گے اگر یہ شریف انسان آپ کے گھروں پر قابض ہونا چاہیں تو آپ خود کو اپنے مرد، عورت اور بچے کو کٹوا دیں گے لیکن آپ ان کی وفاداری سے انکار کردیں گے" "میں سچ کا پرجوش طلبگار ہونے کا دعویدار ہوں---- اسی تلاش کے دوران میں نے عدم تشدد کو دریافت کیا۔ یہ میری زندگی کے مشن میں پھیل گیا---- مجھے اس مشن کو بروئے عمل لانے کے علاوہ زندہ رہنے میں اور کوئی دلچسپی نہیں۔"

VI

مندرجہ بالا صفحات میں ہم نے گاندھی جی کے فلسفے اور گاندھی جی کی آئیڈیالوجی کا عمومی تصور پیش کیا ہے۔ اب ہم ان نظریات کا تذکرہ کریں گے جن کے زیراثر جناح کی تربیت و پرداخت ہوئی۔ جناح ۱۸۹۲ء میں قانون کے مطالعے کے لئے انگلستان گئے جب ان کی عمر بمشکل ۱۶ برس تھی۔ اس وقت دادا بھائی نوروجی بھی انگلستان ہی میں تھے۔ وہ کانگریس کے بانیوں میں سے ایک تھے۔ اس وقت وہ برطانوی پارلیمنٹ کے دارالعوام میں لبرل پارٹی کے رکن تھے۔ دادا بھائی نے نوعمر جناح کو اپنی عاطفت میں لے لیا اور فطرتاً جناح نے اپنی ابتدائی سیاست اسی عظیم استاد سے سیکھی۔ جناح دادا بھائی کے ہمراہ بکثرت دارالعوام اور مختلف سیاسی نشستوں میں جاتے تھے اس طرح وہ برطانوی سیاسیات کے ترقی پسندانہ نظریات سے مانوس ہوئے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ لندن میں اپنے ایام طالب علمی کے دوران گاندھی جی بھی دادا بھائی سے ملے تھے لیکن چونکہ دونوں کے درمیان کوئی بات مشترک نہ تھی اس لئے ان کے درمیان کوئی دوستی یا بے تکلفی فروغ نہ

پا سکی۔ یہ بات بھی بہت دلچسپ ہے کہ انگلستان میں مستقبل کے مہاتما نے سیاسیات اور کسی قسم کی ترقی پسندانہ سرگرمیوں میں کوئی دلچسپی نہیں لی تاہم وہ سبزی خوروں کی انجمن میں گہری دلچسپی لینے لگے اور اس کے سرگرم رکن بن گئے۔

ہندوستان آنے کے بعد جناح کانگریس کے دو مزید سرکردہ ارکان کے زیراثر آ گئے---- یہ سر فیروز شاہ مہتہ اور گوپال کرشن گوکھلے تھے۔ اس طرح جناح کو انڈین نیشنل کانگریس سے گہری دلچسپی ہو گئی اور ان میں اس کے تئیں شدید وفاداری پیدا ہو گئی۔ وفاداری کے اسی احساس کے تحت ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قیام کے بعد وہ اس میں شامل نہیں ہوئے۔ برسوں بعد جب انہیں اس میں شرکت کے لئے قائل کیا گیا تو وہ صرف اس خیال کے تحت مسلم لیگ میں شامل ہوئے کہ وہ دونوں جماعتوں کو ایک دوسرے سے قریب لائیں گے اور آخر کار دونوں کو باہم مدغم کر دیں گے وہ اپنی کوششوں میں کس عمدگی سے کامیاب ہوئے اس کا اندازہ کانگریس اور لیگ کے درمیان ۱۹۱۶ء کے میثاق لکھنؤ سے ہوتا ہے جس میں دونوں عظیم اداروں نے عہد کیا کہ وہ ہندوستان کی آزادی کے لئے مل کر کام کریں گے۔ جناح کی تحریک ہندو مسلم اتحاد اور لیگ کانگریس تعاون میں میثاق لکھنؤ ایک عظیم ذاتی فتح تھا۔ ہندو مسلم اتحاد کی خاطر ان کی خدمات اس قدر بلند پایہ تھیں کہ گوکھلے انہیں ہندو مسلم اتحاد کا بہترین سفیر کہا کرتے تھے۔

VII

گاندھی جی کانگریس اور لیگ کے درمیان میثاق لکھنؤ سے چند برس قبل ہندوستان لوٹ چکے تھے لیکن انہوں نے اس معاہدے اور ہندو مسلم اتحاد کے لئے جناح کی کوششوں میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ ان کا ذہن اپنے نظریات پر مرتکز تھا۔ اس طریقہ کار پر جس کے ذریعے ان نظریات کو عملی جامہ پہنایا جا سکے۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۹ء تک انہوں نے خود کو چمپاران اور دیگر جگہوں پر اپنے نظریات کے ساتھ معمولی تجربات کے لئے مخصوص

رکھا۔ اس دوران کانگریسی سیاست میں ان کی دلچسپی نیم دلانا تھی۔ انہوں نے ۱۹۱۹ء میں کانگریس کے اجلاس امرتسر میں کچھ حصہ لیا۔ اس وقت جلیانوالہ کے قتل عام پر کانگریس کے جذبات بہت مشتعل تھے لیکن گاندھی جی نے احتیاط اور ضبط کی ہدایت کی۔ لیکن اسی اثناء میں علی برادران---- محمد علی اور شوکت علی نے ترکی کی خودمختاری کے مسئلے پر تحریک خلافت شروع کی اور گاندھی جی کو اپنی تحریک میں شمولیت کی دعوت دی جس پر وہ فوراً رضامند ہو گئے۔ وہ اس تحریک میں مجنونانہ جوش و خروش کے ساتھ کود پڑے' انہیں یقین تھا کہ یہ تحریک انہیں اپنے نظریات کے ساتھ تجربات کا عظیم موقع فراہم کرے گی۔ گاندھی جی کی قیادت میں تحریک خلافت نے زبردست قوت حاصل کرلی اور ملک کے طول و عرض میں پھیل گئی اور اتنی بڑی طاقت بن گئی کہ خود حکومت خوفزدہ ہو گئی۔ تحریک خلافت کی چھتری تلے گاندھی جی نے یکم اگست ۱۹۲۰ء کو اپنی تحریک عدم تعاون شروع کی۔ گاندھی جی کی اس جنگ میں عدم تشدد کا پہلا گولا داغا گیا اور ہندوستان اپنی تاریخ کے ایک نئے دور میں داخل ہوا---- گاندھی جی کا دور

اس لمحے گاندھی جی ناقابل تسخیر نظر آتے تھے۔ ہندو عوام تو پہلے ہی مہاتما کے چرنوں میں گر چکے تھے اور خلافت تحریک کی بھرپور حمایت سے مسلم عوام بھی ان کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ اب ان کے سحر کے اسیر ہونے کی باری دانشور طبقے کی تھی۔ اب تک انڈین نیشنل کانگریس کو گاندھی جی کی مختلف تحریکوں سے کوئی واسطہ نہیں تھا جو شروع ہو چکی تھیں۔ تاہم اب گاندھی جی نے اپنی توجہ کانگریس کی جانب مبذول کی' وہ اپنے خیالات کے فروغ کے لئے اس عظیم ادارے پر گرفت حاصل کرنا چاہتے تھے تاکہ اسے اپنے نظریات کے آلہ کار کے طور پر استعمال کر سکیں۔ کانگریس پر ان کی چڑھائی بالکل طوفانی انداز میں تھی اور سی آر داس اور پنڈت موتی لال نہرو جیسے رہنماؤں نے ان کے سامنے فوراً ہتھیار ڈال دیئے۔ دسمبر ۱۹۲۰ء میں کانگریس کے اجلاس ناگپور میں خود کانگریس نے گاندھی جی کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور آئندہ سرگرمیوں کے لئے گاندھی جی کا

لائحہ عمل اپنالیا۔ اس کے بعد گاندھی جی عملاً" کانگریس کے آمر بن گئے۔ یہ صورتحال محمد علی جناح کے لئے سخت ناقابل برداشت اور ناقابل تسلیم تھی جو کانگریس کے اولڈ گارڈ اور اس پرانی انڈین نیشنل کانگریس کے عظیم محافظ تھے جو دادا بھائی نوروجی' فیروز شاہ مہتہ' گوپال کرشن گوکھلے' سریندر ناتھ بنیرجی اور دوسرے رہنماؤں کی تنظیم تھی۔ وہ آخری لمحے تک جنگ کئے بغیر کانگریس کو گاندھی جی کے حوالے کرنے پر تیار نہ تھے۔

جناح کو گاندھی جی کی آئیڈیالوجی سے کوئی ہمدردی نہ تھی اور وہ محسوس کرتے تھے کہ گاندھی جی ہندوستان کو بدنظمی کی دلدل کی طرف لے جا رہے ہیں جہاں ہر چیز تباہی پر منتج ہو گی۔ وہ اسے ہندوستان کے لئے بربادی تصور کرتے تھے کہ کانگریس پرانے عظیم رہنماؤں پر گاندھی جی کے پروگرام کو ترجیح دے کر اسے اپنا لے۔ ان کے خیال میں کانگریس کے لئے گاندھی جی کا راستہ اپنانا خودکشی کے مترادف تھا۔ ناگپور میں کانگریس کے کھلے اجلاس میں نیا لائحہ عمل اختیار کرنے پر جناح اپنا احتجاج بلند کرنے کے لئے اٹھے لیکن ان کی بات نہ سنی گئی اور انہوں نے دل گرفتگی کے عالم میں کانگریس چھوڑ دی۔

گاندھی جی کے نام ایک خط میں جناح نے وضاحت کی کہ وہ کانگریس کے لئے گاندھی جی کی قیادت کو قبول نہیں کر سکتے: "میں اس مخلصانہ مشورے کے لئے آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس نئی زندگی سے اپنا حصہ وصول کرنے کی دعوت دی جس کا در ہمارے ملک کے سامنے وا ہوا ہے لیکن اگر اس "حیات نو" کا مفہوم آپ کا پروگرام اور آپ کے طریقے ہیں' تو مجھے خدشہ ہے کہ میں انہیں اپنا نہیں سکتا۔ کیونکہ مجھے پورا یقین ہے کہ یہ ہمیں لازما" تباہی کی طرف لے جائیں گے----- آپ کے انتہا پسندانہ پروگرام نے وقتی طور پر ناتجربہ کار نوجوانوں' جاہلوں اور ان پڑھوں کے تخیل کو اسیر کر لیا ہے لیکن ان سب کا مطلب مکمل بدنظمی اور انتشار ہے۔ اس کا نتیجہ کیا ہو سکتا ہے میں سوچنے سے بھی کانپ اٹھتا ہوں۔"

کانگریس کے گاندھی جی کے کنٹرول میں جانے کے بعد جناح کے کانگریس چھوڑنے پر

جواہرلال نہرو نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں یوں تبصرہ کیا ہے:

"انہیں (جناح کو) کانگریس میں رونما ہونے والی نئی تبدیلیوں پر شدید اختلاف تھا وہ سیاسی بنیادوں پر غیر متفق تھے----- مزاجاً بھی وہ نئی کانگریس میں قطعاً ناموزوں تھے وہ خودکواس کھدرپوش ہجوم سے مکمل طور پر خود کو علیحدہ محسوس کرتے تھے جو ہندوستانی میں تقاریر کا مطالبہ کر رہا تھا۔ انہیں عوام کا جوش و خروش ہجوم کا پاگل پن (موب ہسٹریا) معلوم ہوتا تھا۔"

VIII

کانگریس چھوڑنے کے بعد مسلم لیگ وہ مرکزی پلیٹ فارم بن گئی جس کے ذریعے جناح نے اپنے خیالات کو فروغ دیا لیکن سوراج اور ہندو مسلم اتحاد کے متعلق ان کے خیالات حسب سابق ہی رہے۔ وہ واحد تبدیلی جو ان کی تقریروں میں محسوس ہوئی وہ یہ تھی اب وہ مسلمانوں کی پسماندگی اور ہندوؤں کی بھاری اکثریت کے پیش نظر مسلمانوں کے لئے کچھ خصوصی تحفظات کا مطالبہ کرنے لگے تھے۔ لیکن ساتھ ہی وہ ضبط کا مظاہرہ بھی کرتے رہے اور انہوں نے لیگ کو سوچا سمجھا کانگریس مخالف رویہ اپنانے کی اجازت نہیں دی۔ لیگ کے پلیٹ فارم سے انہوں نے کانگریس کو مائل کرنا چاہا اور دونوں کے درمیان پل بننے کی کوشش کی۔ انہوں نے ۱۹۳۷ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت کانگریس کی صوبائی وزارتوں کی تشکیل تک اپنا یہ مفاہمانہ رویہ کئی برس جاری رکھا حتی کہ انتخابی مرحلے کے دوران بھی لیگ اور کانگریس کے درمیان تعاون کا جذبہ برقرار رہا لیکن جب انتخابی نتائج سامنے آئے تو معلوم ہوا کہ کانگریس نے بھاری اکثریت حاصل کرلی ہے۔ اس سے کانگریس کا سر پھر گیا۔ اس شاندار کامیابی کے نشے میں کانگریس نے جناح اور مسلم لیگ کا نوٹس لینے میں شدید تکبر کا مظاہرہ کیا بعد ازاں کانگریس کی مختلف حکومتوں نے اپنی کارروائیوں سے مسلمانوں کے ذہنوں میں حقیقی یا خیالی خوف پیدا

کر دیا۔ اب کانگریس اور لیگ کے درمیان جنگ کا آغاز ہوا جس نے قدرتاً متشدد فرقہ وارانہ رخ اختیار کر لیا۔ جناح عسکری راہ پر گامزن تھے اور انہوں نے کانگریس کو شاندار سبق سکھانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ انہوں نے گاندھی اور گاندھیانہ کانگریس کے غاصبانہ قبضے یا کم از کم ہندوستان کے مسلم اکثریتی علاقوں پر ان کا تسلط روکنے کے لئے کچھ انتہائی اقدامات کرنے کے لئے اپنا ذہن بنا لیا۔ اب انہوں نے اپنے دو قومی نظریے کی تعمیر شروع کی جو کچھ عرصے سے ان کے ذہن میں کام کر رہا تھا۔ اس کے بعد مارچ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کے اجلاس لاہور میں انہوں نے مسلمانوں کے لئے علیحدہ ملک کے قیام کا رسمی مطالبہ کر دیا جہاں گاندھی اور گاندھیانہ کانگریس کا قانون نہ چلتا ہو۔ حالات اس کے بعد تیزی سے تبدیل ہوئے اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جناح کا یہ مطالبہ بار آور ہو گیا جب تقسیم ہند کے نتیجے میں دو علیحدہ، آزاد اور خودمختار ریاستیں پاکستان اور ہندوستان وجود میں آگئیں۔

IX

آزادی کے حصول سے جناح نے تو اپنا پاکستان پا لیا لیکن گاندھی جی کو کیا ملا؟ وہ ۱۹۱۵ء میں محض ہندوستانی جنگ آزادی لڑنے کے لئے ہند نہیں آئے تھے یہ آزادی ان کے لئے صرف ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا---- اپنے خواب کے یوٹوپیا کی آدھی راہ میں سانس لینے کا ایک مقام۔ کوئی سوچ سکتا ہے کہ اپنی خدمات کے بل بوتے پر آزادی کے حصول کے بعد ان کی پوزیشن نہایت منفرد اور ناقابل تسخیر ہو گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اب انہیں پہلے جیسا تحکمانہ مقام ہرگز حاصل نہیں تھا، اب نہرو پٹیل کی جوڑی اختیارات اعلیٰ کی مالک تھی تاہم کبھی کبھی وہ احتراماً گاندھی جی سے مشاورت کا نمائشی شو کر لیا کرتے تھے۔ پیارے لال کے الفاظ میں---- ''اس ناقابل بیان بوڑھے شخص کو علم پر متمکن کیا گیا، اس کی بصیرت اور منزہ عن الخطاء دانش کو سراہا گیا، اس سے مشاورت طلب کی گئی، اسے مودبانہ توجہ سے سنا گیا اور پھر پیچھے چھوڑ دیا گیا'' (مہاتما گاندھی---- آخری دور،

جلد ۲' صفحہ ۳۳) گاندھی جی کے اپنے الفاظ میں "پہلے میں ہر چیز کا سلطان ہو سکتا تھا۔ (لیکن) آج میرے بہت سے ہم منصب سلطان منظر عام پر آ چکے ہیں' اگر میں ابھی تک خود کو سلطان تصور کر سکوں تو۔ اگر میں ایسا کر سکتا ہوں تو میں ان میں سب سے زیادہ کم حیثیت ہوں۔"

(تندولکر' جلد ۸' صفحہ ۲۴۵)

گاندھی جی کا اثر و رسوخ اس وقت کم ہونا شروع ہوا جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان پہنچے۔ نہرو اور پٹیل نے ماؤنٹ بیٹن کا منصوبہ تقسیم گاندھی جی کی کسی مشاورت کے بغیر تسلیم کر لیا۔ بمبئی میں ۱۴ جون ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں سردار پٹیل نے ایک بے رحمی کی حد تک دو ٹوک تقریر کی جس میں گاندھی جی کے عدم تشدد اور اہنسا جیسے آدرشوں کو خیرباد کہا گیا تھا۔ انہوں نے وہ وجوہ بھی بیان کیں جن کی بنیاد پر وہ گاندھیانہ آئیڈلز کی مزید پیروی نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے کہا....

"آزادی آ رہی ہے۔ انہیں لازماً صنعتیں قائم کرنی ہیں۔ انہیں لازماً فوج قائم کرنی ہے اور اسے موثر اور مضبوط بنانا ہے۔"

(مہاتما گاندھی---- آخری دور' جلد ۲' صفحہ ۲۵۵)

نہرو کے خیالات بھی انہی خطوط پر سفر کر رہے تھے۔ عوام کا معیار زندگی بلند کرنے کے لئے انہوں نے ملک میں وسیع پیمانے پر صنعتیں لگانے پر زور دیا۔ انہوں نے مزید کہا کہ مغرب کا پس منظر جس میں مشین اور سائنس و ٹیکنالوجی کو اہم ترین گردانا گیا ہے۔ ہندوستان میں بھی اپنایا جانا چاہئے۔ چنانچہ یہ بے حد واضح تھا کہ اگرچہ انگریز جا چکے تھے لیکن نہرو اور پٹیل کے صاف اعلان کے بعد گاندھی جی کے یوٹوپیا کی تعمیر کا امکان نہایت موہوم تھا۔ اب گاندھی جی کی حیثیت بے حد غیر واضح تھی اور ان کے پاس اس کے علاوہ کرنے کے لئے کچھ نہ تھا کہ وہ دعائیہ اجتماعات میں اپنے خیالات کا پرچار کریں اپنے زندگی بھر کے مشن کو ترک کر دینے کا تصور ہی ان کے لئے ناقابل غور تھا۔ اب انہوں نے اپنے

پروگرام کا اگلا قدم اٹھانے کا تہیہ کر لیا تھا---- ایک مبنی بر دیہات ریاست کے قیام کی راہ ہموار کرنا جس کا مرکز ثقل شہروں کی بجائے دیہات میں مرتکز ہو۔ انہوں نے محسوس کیا کہ کانگریس اب ان کے لئے قطعاً" فائدہ مند نہیں رہی کیونکہ ان کے مطابق اس نے طاقت کا ذائقہ چکھ لیا تھا اور طاقت کے لئے پاگل ہو گئی تھی۔ چنانچہ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ کانگریس سے دامن جھاڑ لینا چاہئے اور اس کی جگہ وہ ایک آزمودہ گاندھیانہ تنظیم قائم کریں گے جس کا گاندھیانہ نظریات پر مکمل یقین رکھنا ضروری ہو گا۔ ۲۹ جنوری ۱۹۴۸ کی رات کو اپنی موت سے محض ۲۴ گھنٹے سے بھی کم پیشتر گاندھی جی نے اس ضمن میں اپنے منصوبے کا خاکہ اپنے ہاتھوں سے تیار کیا یہ منصوبہ تھا کہ عظیم قومی ادارے انڈین نیشنل کانگریس کو توڑ دینا اور اس کی جگہ لوک سیوک سنگھ کے نام سے ایک نئی تنظیم قائم کرنا جس کا آہنی ڈھانچہ گاندھی جی کے ان معتقدین پر مشتمل ہو گا---- آل انڈیا سپنرز ایسوسی ایشن' آل انڈیا ویلج انڈسٹریز ایسوسی ایشن' ہندوستانی تعلیمی سنگھ' ہریجن سیوک سنگھ اور گو سیوا سنگھ۔ (تندولکر' جلد ۸' صفحات ۲۸۵ - ۲۸۳) انڈین نیشنل کانگریس کی تحلیل کے متعلق سوچنا بھی ایک المیہ تھا' وہ جماعت جس نے وقت کے ساتھ ہمارے آگے بڑھنے اور جدوجہد آزادی میں اس قدر اہم کردار ادا کیا تھا اس کی جگہ آل انڈیا سپنرز ایسوسی ایشن یا گو۔ سیوا سنگھ جیسی تنظیموں کو لیتے ہوئے دیکھنا ایک بہت بڑا سانحہ ہوتا۔ اس تناظر میں جناح کی جانب سے گاندھی اور گاندھی ازم کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا ایک تاریخی ضرورت نظر آتا ہے۔

ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ نہرو اور پٹیل دونوں گاندھی جی کے آدرشوں کو ملک کے عملی انتظام و انصرام پر لاگو کرنے سے انکار کر چکے تھے۔ آیئے دیکھیں کہ عام آدمی نے ان کے تئیں کیا ردعمل ظاہر کیا۔ گاندھی جی اپنے خیالات کے ساتھ عملی تجربات کرنا چاہتے تھے۔ مثلاً گاندھیانہ نظام کے تحت ایک مثالی گاؤں کو کیسا ہونا چاہیے ؟ اسی مقصد کے پیش نظر اپنی زندگی کے آخری ایام میں وہ ضلع واردھا کے ایک گاؤں سیوا گرام میں آباد ہو

گئے۔ گاندھی جی کی زندگی میں اس گاؤں میں ہر قسم کی گاندھیانہ سرگرمیاں زور و شور سے جاری رہیں۔ ان کی موت کے لگ بھگ ۱۲ برس بعد ایک سرگرم سماجی کارکن نے سیوا گرام کا دورہ کیا اور جن حالات کا انہوں نے مشاہدہ کیا وہ مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کئے گئے ہیں:

"باپو کے وقت میں سیوا گرام کے ہر گھر میں ایک چرخہ ہوا کرتا تھا۔ آج پورے گاؤں میں ایک بھی چرخہ نہیں۔ جہاں تک اس بنیادی تعلیم کا تعلق ہے جس کا سیوا گرام مرکز تھا' اس کے متعلق وہ (سیوا گرام کے عوام) ڈھکی چھپی نفرت کے بغیر کہتے ہیں:

"ہم اپنے بچوں کو چوتھی جماعت (پرائمری) کے بعد آشرم سکول نہیں بھیجتے کیونکہ نئی تعلیم حاصل کرنے والوں کو نوکریاں نہیں ملتیں اس لئے ہمارے لڑکے واردہا شہر جاتے ہیں۔ وہ رسمی سکول میں پڑھنے کے لئے ۴ میل چلتے ہیں----- (دیہاتی) کہتے ہیں----- "ہم ہمیشہ زمین کے کاشتکار نہیں رہنا چاہتے۔ ہم بھی وکیل اور ڈاکٹر بننا چاہتے ہیں۔"

(دھول کے پھول از کسم نائیر' صفحہ ۱۸۷)

ان کی افادیت کو عملی تجربے سے پرکھنے کے بعد گاندھی جی کے آدرشوں کے متعلق یہ ایک عام آدمی کا فیصلہ ہے۔ اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ دیہی تعمیر نو سے متعلق گاندھی جی کے نظریات کبھی واضح اور مبنی بر حقیقت نہ تھے۔ آخر کار عام آدمی جان لیتا ہے کہ اس کا جوتا اسے کہاں کاٹ رہا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ وہ غلط ہے؟ اب اگر ہم گاندھی جی کی سرتوڑ کوششوں کے مجموعی حاصل کا تجزیہ کریں اور ان کی کبھی نہ ختم ہونے والی محنت اور روح کے کرب کے ماحصل کو دیکھیں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ ہندوستان نہ صرف گاندھی جی کے راستے سے دور ہٹ رہا ہے بلکہ یقیناً اسے مکمل طور پر مسترد کر رہا ہے۔

X

کیا جناح فی الحقیقت اس دو قومی نظریے پر یقین رکھتے تھے جس پر وہ مسلمانوں کے لئے علیحدہ ریاست کے مطالبے کے دوران اس قدر زور دیتے رہے؟ کیا وہ واقعی فرقہ واریت سے ہمدردی رکھتے تھے؟ کیا انہوں نے پاکستان صرف مسلمانوں کے لئے بنایا تھا؟ کیا وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اور ہندو الگ الگ اور منقسم خانوں میں رہیں؟ آیئے ان سوالوں کا جائزہ لیں۔ ۷ اگست ۱۹۴۷ء کو وہ ہمیشہ کے لئے دہلی سے رخصت ہو گئے۔ ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو انہوں نے پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کے سامنے پہلی تقریر کی جس میں انہوں نے مندرجہ ذیل اعلان کیا:

> "آپ آزاد ہیں، آپ اپنے مندروں میں جانے کے لئے آزاد ہیں، اس ریاست پاکستان میں آپ اپنی مساجد یا کسی بھی دوسری عبادت گاہ میں جانے کے لئے آزاد ہیں۔ آپ کسی بھی مذہب، ذات اور عقیدے سے تعلق رکھ سکتے ہیں---- اس کا اس بنیادی اصول سے کوئی واسطہ نہیں کہ ہم سب ایک ریاست کے شہری ہیں۔ اب میرے خیال میں ہمیں اس تصور کو بطور آئیڈیل اپنے سامنے رکھنا چاہئے اور آپ دیکھیں گے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ہندو، ہندو نہیں رہیں گے، مسلمان، مسلمان نہیں رہیں گے۔ مسلک کے مفہوم میں نہیں کیونکہ وہ ان کا ذاتی عقیدہ ہے بلکہ ریاست کے شہری ہونے کے ناطے سیاسی مفہوم میں۔"

(جناح کی زندگی، از ہیکٹر بولیتھو، صفحہ ۱۹۷)

مندرجہ بالا اعلان سے جناح کی سیاست کی اندرونی روح نمایاں ہوتی ہے۔ یہاں وہ پرانے جناح پھر موجود ہیں جو سفیر ہندو مسلم اتحاد تھے۔ وہ ہندو فرقے کے خلاف نہیں لڑے بلکہ ان کی جنگ گاندھی اور گاندھی زدہ کانگریس کے خلاف تھی۔ وہ خلوص دل

سے یقین رکھتے تھے کہ گاندھی نے کانگریس کو غلط راستے پر ڈال دیا ہے جو صرف انتشار کی طرف لے جا سکتا ہے انہوں نے خود کو نہایت پریشان کن پوزیشن میں پایا کہ نہ صرف ان پڑھ ہندو عوام نے بلکہ دانشور ہندو طبقے نے بھی اپنی عقل و خرد کو گاندھی ازم کے معبد میں لوبان جلانے کے لئے قربان کر دیا ہے۔ ان حالات میں سوائے فرقہ وارانہ قوت کے اور کوئی طاقت جنگ کے لئے دستیاب نہ تھی۔ جونہی انہوں نے ایک ایسی ریاست تخلیق کرنے کا اپنا مقصد پا لیا، جہاں گاندھی اور گاندھی زدہ کانگریس کا قانون نہ چل سکے تو انہوں نے فرقہ واریت کا وہ نقاب فوراً اتار پھینکا جو انہوں نے وقتی طور پر پہن لیا تھا۔

XI

یہ بات اب تمام اطراف میں تسلیم کی جا چکی ہے کہ تقسیم ہند تمام متعلقین کے لئے ناقابل برداشت برائی ثابت ہوئی ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی مسئلہ حل نہیں کیا بلکہ دوسری جانب اس نے سینکڑوں لاینحل مسائل کھڑے کر دیئے ہیں۔ ہر صاحب فہم کو لازماً" دو قومی نظریے کی اسی طرح مخالفت کرنی چاہئے جس طرح جناح نے خود پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کے سامنے اپنی پہلی تقریر میں کی تھی۔ دو قومی نظریے کا جواز کہاں ہے جب کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں میں ۹۰ فی صد مسلم آبادی اصلاً" و نسلاً" ہندو ہے اور اسلام قبول کر لینے والے ہندوؤں کی اولاد ہے۔ خود جناح ایک گجراتی ہندو برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ لسانی اعتبار سے بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کی بھاری اکثریت کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، ایک بستی میں دونوں ایک ہی مادری زبان بولتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ابھی تک ہندوستان میں ۵ یا ٦ کروڑ مسلمان باقی ہیں انہیں تقسیم سے کیا فائدہ پہنچا ہے؟ عوام تقسیم کے کبھی خواہاں نہ تھے۔ ان کا سیاست سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ یہ وہی ہیں جنہیں تقسیم سے سب سے زیادہ نقصان ہوا ہے۔ وہ تقسیم کی تنسیخ کا دلی خیر مقدم کریں گے۔

مزید برآں، برصغیر کا تحفظ بھی دوبارہ اتحاد کا متقاضی ہے۔ اس ضمن میں لارڈ ویول کا لائحہ عمل خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ انہوں نے تقسیم کے سوال کو ایک سپاہی کی آنکھ سے، دفاع کے نقطہ نظر سے دیکھا تھا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ دو قومی نظریے کی بنیاد پر ہندوستان کی تقسیم موقع پر اور بعد میں ہونے والے تمام واقعات کے ہمراہ، اس کے دفاع کو خطرناک حد تک کمزور کر دے گی اور اسے شمال اور شمال مغربی سمت سے حملے کا کھلا ہدف بنا دے گی۔ مسئلے کے اسی پہلو کو ذہن میں رکھتے ہوئے انہوں نے مرکزی مجلس قانون ساز کے ارکان سے مندرجہ ذیل الفاظ میں خطاب کیا تھا: "آپ جغرافیے کو نہیں بدل سکتے۔ دفاع، خارجی تعلقات اور متعدد اندرونی و بیرونی مسائل کے نقطہ نظر سے ہندوستان ایک فطری وحدت ہے۔ تاریخ متعدد شواہد فراہم کرتی ہے کہ فرقے اور حتیٰ کہ دو قومیں اپنی مختلف تہذیبوں اور مذاہب کے باوجود اکٹھی رہ سکتی ہیں۔"

ہم عصر تاریخ نے اس جری سپاہی۔ وائسرائے سے مناسب انصاف نہیں کیا جس نے اپنے اعلیٰ عہدے سے برطرفی قبول کر لی لیکن (ہندوستان کی) سرزمین، اس کے عوام اور اس کی عظیم الشان فوج کو دو حصوں میں توڑنے کی ذمہ داری نہیں لی۔ کسی نے بھی، نہ گاندھی، نہ جناح اور نہ کسی اور سیاستدان نے تقسیم کی برائیوں کو اس قدر واضح انداز میں نہیں دیکھا جیسا کہ لارڈ ویول نے دیکھ لیا تھا۔

گزشتہ ۱۹ برس کے اندر ہونے والے اندرونی اور بیرونی واقعات نے خصوصاً حالیہ مہینوں میں ہونے والے واقعات نے حکماً تقاضا کیا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو دوبارہ قریب آجانا چاہیے۔ پاکستان اور ہندوستان کی مع مشترکہ دفاع ایک دولت مشترکہ ہونی چاہیے لیکن جس میں تمام ترکیبی اکائیوں کو مکمل خود مختاری حاصل ہو۔ ہندوستان اور پاکستان کی باہمی رضامندی سے ترکیبی اکائیوں کی تنظیم نو ہونی چاہیے۔ جس میں کسی قسم کی بیرونی مداخلت نہ ہو۔ ہم نے آگ کی قربان گاہ عبور کی ہے جس سے ہمیں آلائشوں سے پاک ہو جانا چاہیے۔ ہندوستان بہت سے اقلیتی فرقوں کا ملک

ہے اور یہ پورے عجز و انکسار سے کہہ سکتا ہے کہ اس نے اپنی اقلیتوں سے ناانصافی نہیں کی۔ دوبارہ اتحاد کا کام بظاہر بہت مشکل نظر آتا ہے۔ لیکن یہ ناممکن نہیں ہے کیونکہ ہندوستان اور پاکستان کے عوام کے درمیان اس کے متعلق بے حد خیر سگالی پائی جاتی ہے۔ عوام کے مفادات ہماری اولین ترجیح ہونے چاہئیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنی سیاست کا از سر نو جائزہ لیں۔ اپنے اندر جھانکے بغیر ایسا کوئی جائزہ ممکن نہیں۔ امید ہے کہ یہ کتاب ----- ہندو اور مسلم دونوں قارئین کے ذہنوں کا رخ دروں بینی اور دوبارہ ملاپ کی طرف موڑے گی۔ دوبارہ ملاپ کا راستہ "تکلیف دہ تاریک اور موجودہ صورتحال سے انحراف کے مترادف ہو گا"۔

لیکن آیئے رکاوٹوں سے پریشان نہ ہوں اور اپنی ارض موعود کی اپنی تلاش میں حوصلہ نہ ہاریں۔ اگر ہندوستان اور پاکستان متحد ہو جائیں' اگر فرقہ پرستی سے گریز کیا جائے تو پاکستان اور ہندوستان کی دولت مشترکہ دنیا کی مضبوط ترین طاقتوں میں سے ایک ہو گی اور دنیا کی تقدیر بدل دینے کے قابل ہو گی۔

ایس کے موجمدار پٹنہ یکم بیساکھ' ۷۳' ۱۳' ۱۳ اپریل' ۱۹۶۶ء

اظہار تشکر

یہ کتاب ایک تحقیقی تحریر ہے جو ایک محقق طالب علم کے جذبے سے اس لئے لکھی گئی کہ ان وجوہات کا مطالعہ کیا جائے جو تقسیم ہند کا باعث بنیں اور یہ خالصتاً عوامی فریضے اور عوامی خدمت کے نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے۔ ایسی کتاب تحریر کرنے کے لئے اس موضوع پر موجود مواد سے مدد لینا نہایت ضروری ہے۔ یہاں میں مندرجہ ذیل کتب' مصنفین اور ادارہ جات کو تشکر پیش کرتا ہوں جن سے میں نے استفادہ کیا۔

1۔ "ایک خود نوشت سوانح عمری یا صداقت کے ساتھ میرے تجربات کی کہانی" از ایم۔ کے گاندھی' نوجیون پریس' احمد آباد (۱۹۴۰ء)۔

2۔ مہاتما از تندولکر، پبلی کیشن ڈویژن، گورنمنٹ آف انڈیا۔

3۔ مہاتما---- آخری دور از پیارے لال، نوجیون پبلشنگ ہاؤس، احمد اباد۔

4۔ محمد علی جناح از ایم ایچ سید، مطبوعہ شیخ محمد اشرف، لاہور، ۱۹۴۵ء

5۔ جناح از ہیکٹر بولیتھو، جان مرے، لندن، ۱۹۵۴ء

6۔ میری داستان حیات از ایم آر جے کر، ایشیاء پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۵۸ء

7۔ برطانوی راج کے آخری ایام از لیو نارڈ موز---- (وائیڈن فیلڈ اینڈ نکلسن، لندن)، ۱۹۶۱ء

8۔ ہندوستان کا حصول آزادی از مولانا ابو الکلام آزاد، اورینٹ لونگ منیز، ۱۹۵۹ء

9۔ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ مشن از ایلن کیمپ بیل۔ جانسن، رابرٹ ہیل لمیٹڈ لندن۔

10۔ انتقال اقتدار از وی۔ پی مینن، اورینٹ لونگ مینز۔

11۔ ہندوستان کی جدوجہد از سبھاش بوس، مطبوعہ برائے نیتاجی پبلشنگ کمپنی از تھیکر سپنک اینڈ کمپنی۔

12۔ اچھلتا ہوا شیر از ہف ٹوئے، الائیڈ پبلشر اینڈ کاسلز

13۔ "ایک خود نوشت سوانح حیات" از جواہر لال نہرو مطبوعہ جون لین، بوڈے ہیڈ، لندن، (دوبارہ طباعت، ۱۹۴۷ء)

14۔ انڈین نیشنل کانگریس کی تاریخ از ڈاکٹر پٹہ بھائی سیتا رمیہ، پدم پبلی کیشن لمیٹڈ، بمبئی۔

15۔ مہاتما گاندھی کے نظریات از سی۔ ایف اینڈریوز، جارج ایلن اینڈ انون لمیٹڈ، لندن، (۱۹۴۹)

16۔ گاندھی جی از ہارن مکرجی، نیشنل بک ایجنسی، کلکتہ ۱۹۵۸ء۔

17۔ مہاتما اور ازم از ای ایم ایس نمبودری پد (۱۹۵۸ء)

18- تقسیم کے قصور وار افراد از ڈاکٹر رام موہن لوھیا' کتابستان الہ آباد۔

19- جدید ہندوستان از سر پیری کل گر فتھس' بین' لندن۔

20- کراس روڈز' مولفہ نیتاجی ریسرچ بھون' ایشیاء پبلشنگ ہاؤس۔

21- نہرو از مائیکل بریشر' آکسفورڈ' ۱۹۵۹ء

22- لارڈ از مے کی یادداشتیں (ہائی مان) ۱۹۶۰ء

23- جب یادداشت کام کرتی ہے از لیفٹیننٹ جنرل سر فرانس ٹکر (کاسل) ۱۹۵۰ء

24- دھول کے پھول از کسم نائر۔

25- پاکستان از خالد بن سعید۔

26- پاکستان کی جانب شاہراہ از چودھری خلیق الزمان۔

ایس کے موجمدار

باب اول

ہندوستان میں تحریک آزادی کی ابتداء

ہندوستان میں تحریک آزادی اور جدیدیت کا آغاز حقیقی معنوں میں راجہ رام موہن رائے نے کیا۔ اگر وہ ناقابل فراموش استقامت اور پامردی سے اپنے دور کے مذہبی کٹر پن اور قدامت پسندی کا مقابلہ نہ کرتے تو اس ملک میں سماجی' سیاسی اور تعلیمی اصلاحات کبھی نہ ہوتیں لیکن وہ مغرب کے ایجنٹ ہرگز نہ تھے۔ باوجود اس کے کہ وہ مغربی فلسفے اور سیاسی نظریات پر گہری نظر رکھتے تھے انہوں نے ہندوستان کو مغربی رنگ میں رنگنے کی کبھی خواہش یا کوشش نہیں کی۔ وہ سنسکرت اور فارسی کے عظیم عالم تھے اور ہندوستانی کلچر کو اسلام' ہندومت اور جدید مغربی تعلیمات کا خوبصورت امتزاج بنانا چاہتے تھے۔ جہاں تک ہندوؤں کا تعلق تھا تو راجہ رام موہن رائے انہیں ویدوں اور اپنشدوں کا سچا پیرو کار دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کا مقصد حیات ہندو مذہب کو بت پرستی' توہم پرستی اور اس جہالت سے پاک کرنا تھا جو آہستہ آہستہ اس کا لازمی جزو بن گئی تھی۔ انہوں نے برہمو سماج تحریک کی بنیاد رکھ کر ہندو مذہب کو دوبارہ توحید پرستی کی جانب راغب کیا۔ تعلیمی میدان میں ان کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

انیسویں صدی کے آغاز میں برطانوی پارلیمنٹ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے احیاء کا قانون منظور کیا۔ اپنے علاقوں میں اپنی بنیادیں مستحکم کرنے کے لئے کمپنی کو تعلیم کی ترویج کی اشد ضرورت تھی۔ اس ضمن میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ شروع میں ہندوستانیوں کو انہی کی زبان اور روایات کے مطابق تعلیم دی جائے چنانچہ سب سے پہلے کلکتہ میں سنسکرت کی تعلیم کے لئے کالج قائم کیا گیا لیکن راجہ رام موہن رائے نے اس سرکاری فیصلے کی شدت سے مخالفت کی ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان کے عوام کو مغربی طرز تعلیم سے آشنا کیا جائے اور

انہیں جدید سائنسی علوم سے روشناس کروایا جائے۔ ۱۸۲۳ء میں وہ ہم خیال افراد کا ایک وفد لے کر گورنر جنرل لارڈ ایمرسٹ سے ملاقات کرنے گئے اور انہیں ایک عرضداشت پیش کی جس کا مسودہ کچھ اس طرح سے تھا۔

"اگر برطانوی مقننہ اپنی قانون سازی کے ذریعے ہندوستانی عوام کو ابدی تاریکی میں رکھنا چاہتی ہے تو اس کے لئے سنسکرت ذریعہ تعلیم یقیناً بہترین طریقہ ہے لیکن اگر اس کا مقصود عوام کی فلاح ہے تو اسے جدید اور روشن خیالی پر مبنی نظام تعلیم کو فروغ دینا چاہیے جس کے نصاب میں ریاضی' فزکس' کیمسٹری اور طب شامل ہوں۔ اس کام کے لئے برطانوی درسگاہوں کے فارغ التحصیل ماہرین تعلیم کی خدمات حاصل کی جائیں۔ کالجوں میں عمدہ کتب اور جدید سائنسی آلات موجود ہونے چاہئیں۔"

راجہ موہن رائے یہ جنگ جیتنے میں اس وقت کامیاب ہو گئے جب ۲ فروری ۱۸۳۸ء کے تاریخی دن لارڈ میکالے نے ان کی تجاویز منظور کر لیں۔ لارڈ میکالے کو حال ہی میں گورنر جنرل کی مشاورتی کونسل کا رکن مقرر کیا گیا تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اعلیٰ تعلیم کس زبان میں دی جائے اس دور کے دانشوروں کی اکثریت انگریزی زبان کے حق میں تھی۔ اس طرح ہندوستان میں مغربی تعلیم کا آغاز ہوا جس کا نظام ایک صدی سے زائد جاری رہا اور ہندوستانی عوام اس کے ثمرات سے بہرہ ور ہوئے۔

لارڈ میکالے نہایت زیرک اور دانا شخص تھا اس نے ہندوستان آنے سے پہلے ہی یہاں کے معاشرے پر انگریزی تعلیم کے اثرات کا اندازہ لگا لیا تھا۔ ۱۸۳۳ء میں دارالعوام کی ایک یادگار تقریر میں اس نے کہا تھا۔

"مجوزہ نظام تعلیم ہندوستانی عوام کے ذہنی افق کو وسیع کرے گا اور وہ طویل عرصے تک اسے مسترد نہیں کریں گے۔ اس بات کا امکان بھی غالب ہے کہ مغربی تعلیم سے روشناس ہونے کے بعد وہ مغربی اداروں کا تقاضا بھی کرنے

لگیں لیکن یہ دن کب آئے گا میں حتمی طور پر نہیں کہہ سکتا لیکن میں اس ارتقاء کی راہ میں حائل نہیں ہوں گا کیونکہ ایسا دن جب بھی آیا وہ انگریزوں کی تاریخ کا نہایت قابل فخر دن ہو گا۔ مملکتیں ادارے اور فتوحات ہمارے ہاتھ سے نکل بھی سکتی ہیں لیکن کچھ کامیابیاں اٹل اور انمٹ ہوتی ہیں جنہیں گردش ایام دھندلا نہیں سکتی ہماری ان کامیابیوں میں وحشت و بربریت پر عقل و خرد کی فتح شامل ہے۔ ہماری سربلند فتوحات میں ہمارے لازوال فنون' اخلاقی اقدار' ادب اور قوانین نمایاں ہیں۔"

میکالے ہندوستان کو اسلحے' قتل و غارت اور خونریزی کی مدد سے زیر کرنے کا خواہش مند نہ تھا بلکہ علم و دانش کے ذریعے یہاں اپنے قدم مستحکم کرنا چاہتا تھا تاکہ شہریوں کی آزادی پر بظاہر کوئی زد نہ آئے۔ میکالے کے ایک قریبی رشتے دار چارلس ٹریولین نے ایسے ہی خیالات کا اظہار ایک کتابچے میں کیا جو "ہندوستان میں تعلیم" کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس کتابچے میں اس نے لکھا ہے۔

"ہندوستان اور انگلستان جیسے الگ الگ ملکوں میں کوئی مستقل یا دائمی تعلق قائم نہیں رہ سکتا۔ جلد یا بدیر یہاں کے باشندے آزادی کا تقاضا ضرور کریں گے اور کوئی بھی پالیسی اس حقیقت کو وقوع پذیر ہونے سے نہیں روک سکتی۔ تاہم آزادی کا حصول دو طریقوں سے ممکن ہے ایک یک لخت انقلاب اور دوسرا بتدریج اصلاحات۔ پہلا طریقہ پر تشدد اور دوسرا پرامن ہے۔ خونریزی کو روکنے کا واحد طریقہ دیسی عوام میں انگریزی نظریات و افکار اور اداروں کو متعارف کروانا ہے۔ تاہم وہ خود بھی جدید تعلیم کی جانب کافی راغب ہیں چنانچہ اس ضمن میں ان پر کسی جبر کی ضرورت نہیں۔ اگر یہ طریقہ عمل اپنایا جائے تو ہندوستان اور انگلستان میں علیحدگی کو روکا جا سکتا ہے۔ اس کی مدد سے موجودہ عارضی اور تکلیف دہ تعلق ایک پائیدار اور سود مند رشتے میں بدل سکتا ہے۔"

وقت نے جو سچائی کا سب سے بڑا پیمانہ ہے میکالے اور ٹریولین کے نظریات کی پختگی کو ثابت کر دیا۔ لارڈ ڈلہوزی نے راجہ رام موہن رائے، ٹریولین اور میکالے کے خیالات کو کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں یونیورسٹیاں قائم کر کے عملی جامہ پہنا دیا۔ ان یونیورسٹیوں میں ذریعہ تعلیم انگریزی تھا۔ انگریزی کی تعلیم نے مقامی دانشوروں کو مغربی فلسفے سے روشناس کروایا۔ انگریزی کی اعلیٰ تعلیم سے ملک میں سیاسی ترقی کو بے حد فروغ حاصل ہوا اور دانشوروں کا ایک مخصوص طبقہ پیدا ہوا جس نے برطانوی سیاسی افکار کو کھلے دل سے اپنایا جن میں رواداری، روشن خیالی، جمہوریت، نمائندہ حکومت اور وفاقیت شامل تھے۔ انگریزی تعلیم نے ملک کے مختلف طبقات میں ایک مخصوص طرح کی وحدت، یگانگت اور یکجہتی پیدا کی اور انگریزی زبان ان کے مشترکہ سیاسی و قانونی خیالات کے اظہار کا ذریعہ بن گئی۔ اب وہ کسی ایسے پلیٹ فارم کی تلاش میں تھے جہاں وہ اپنے سیاسی نظریات کا تبادلہ کر سکیں یہی جذبہ انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کا محرک بنا۔ کانگریس کا وجود میں آنا، ہندوستان کی آزادی کی جانب انتہائی بڑا، موثر اور طاقتور قدم تھا۔

باب دوم

انڈین نیشنل کانگریس کا قیام (۱۸۸۵ء)

انڈین نیشنل کانگریس کا قیام ۱۸۸۵ء میں عمل میں آیا اور ۱۹۲۰ء تک یہ مکمل طور پر مغربی خیالات کے زیر اثر رہی۔ تاہم اس کے بعد موہن داس کرم چند گاندھی نے اس میں ہندوستانیت کا رنگ بھرا۔ کانگریس کو ۱۹ویں صدی کے ہندوستان میں مشرق و مغرب کے نظریات کا حسین امتزاج کہا جا سکتا ہے۔ بہرطور مغربی تہذیب و تمدن' جدید خیالات' سائنسی ایجادات اور ٹیکنالوجی نے ہندوستان کی جامد اور غیر متحرک زندگی میں ارتعاش بلکہ بے چینی بھی پیدا کی۔ لیکن جن لوگوں نے انگریزی تعلیم سے فیض حاصل کیا ان کا ذہنی افق بے حد وسیع ہوا۔ انگریزی تعلیم یافتہ افراد نے ہی ہندوستان کے مزاج میں انسان پرستی اور رواداری پیدا کی۔ جیسا کہ پہلے تذکرہ ہو چکا ہے کہ ہندوستان میں جدیدیت اور مغربی تعلیم کو متعارف کروانے کا سہرہ راجہ رام موہن رائے کے سر ہے۔ وہ محض مذہبی' معاشرتی اور تعلیمی میدانوں میں ہی اصلاحات کے بانی نہ تھے بلکہ سیاسی میدان کے بھی شہسوار تھے وہ پہلے انسان تھے جو ہندوستانی عوام کے مسائل کی نشاندہی کے لئے برطانوی پارلیمنٹ تک پہنچے۔ اسی کے نتیجے میں برطانوی پارلیمنٹ میں امور ہند کے متعلق پارلیمانی کمیٹی کا قیام عمل میں آیا اور ۱۸۳۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر کا احیاء کیا گیا۔ انہی کی انتھک کوششوں کے نتیجے میں مذکورہ چارٹر ۱۸۳۳ء میں مندرجہ ذیل مراعات کا اعلان کیا گیا۔

"ہندوستان کے کسی بھی دیسی باشندے کو مذہب' علاقے' حسب نسب اور رنگ و نسل کی بنیاد پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت یا عہدے سے محروم نہیں رکھا جائے گا"

لیکن راجہ رام موہن رائے اپنے ہم وطنوں کی اس قدر خدمت کے بعد زندہ اپنی مٹی پر نہ لوٹ سکے اور ۱۸۳۳ء میں انگلستان ہی میں انتقال کر گئے لیکن جدید ہندوستان

اپنے اس معمار اول اور تحریک احیائے علوم کے بانی کو کبھی فراموش نہیں کر سکے گا۔ ان کی دکھائی ہوئی راہ پر ۱۹ ویں صدی کے تمام سیاستدان گامزن رہے۔

کمپنی کے چارٹر پر ۲۰ برس کے بعد نظر ثانی ضروری تھی اس کے مطابق چارٹر کی تشکیل نو ۱۸۵۳ء میں ہونا تھی اس مقصد کے لئے بنگال کے سیاستدان ایک ایسی تنظیم قائم کرنا چاہتے تھے جہاں عوام کے مسائل پر غور و خوض کیا جا سکے اور ان کی آواز برطانوی پارلیمنٹ تک پہنچ سکے۔ "برٹش انڈین ایسوسی ایشن" کے نام سے اس تنظیم کا قیام ۱۸۵۱ء میں عمل میں آیا اور اس کے ہراول دستے میں بابو رام گوپال گھوش' ڈاکٹر راجندر لال مترا اور ایک نوجوان صحافی ہریش چندر مکرجی شامل تھے۔ ہریش چندر کو ہندوستان میں جدید صحافت کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کا اخبار "ہندو پیٹریاٹ" عوام کی آواز تھا۔ بمبئ کے سیاستدانوں نے بنگال کی آواز پر لبیک کہا اور ۱۸۵۲ میں دادا بھائی نوروجی اور جگن ناتھ شنکر سیٹھ نے بمبئ ایسوسی ایشن قائم کی۔ بعدازاں پونا سردا جانک سبھادر اور دورلس مہاجن سبھا قائم ہوئیں لیکن برٹش انڈین ایسوسی ایشن پر بنگال کے بارسوخ جاگیرداروں کا غلبہ تھا اس لئے یہ متوسط طبقے' تعلیم یافتہ افراد اور عوامی خواہشات کی درست ترجمانی سے قاصر تھی چنانچہ بنگال میں ایک اور سیاسی تنظیم کی ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگی۔ اسی کے تحت ۱۸۷۶ء میں کلکتہ میں انڈین ایسوسی ایشن قائم کی گئی۔ اس کی روح رواں سریندر ناتھ بنیرجی' آنند موھن بوس اور من موھن گھوش تھے۔ من موھن گھوش کلکتہ کے نامور وکیل تھے جبکہ سائسر کمار گھوش امرت بازار پتریکا کے ایڈیٹر تھے۔ ۱۸۵۳ء کے چارٹر ایکٹ کی منظوری کے بعد ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی جیسا اہم واقعہ پیش آیا۔ اسے کچلنے کی کوشش میں ایسٹ انڈیا کمپنی خود بھی ختم ہو گئی اور ہندوستان براہ راست تاج برطانیہ کے زیر نگیں ہو گیا بورڈ آف کنٹرول ختم کر دیا گیا اور اس کا کام برطانیہ کے وزیر برائے امور ہند نے سنبھال لیا۔ ملکہ وکٹوریہ نے ہندوستان کو براہ راست سلطنت کا حصہ بنانے کا اعلان اپنی درج ذیل تاریخی تقریر میں کیا۔

"تاج برطانیہ پر ہندوستان کے عوام کے تئیں بھی وہی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جسے وہ دیگر غلام ریاستوں میں سنبھالنے کا پابند ہے۔ ہم ان ذمہ داریوں کو خدا کے فضل و کرم سے دیانتداری کے ساتھ پورا کریں گے۔ تاج کے زیر نگیں افراد کو بلا تخصیص رنگ و نسل ہر عہدے تک رسائی حاصل ہو گی۔ ہر ملازمت کی شرط صرف تعلیم' اہلیت اور دیانت ہو گی۔ یہ ہماری شدید ترین خواہش ہے کہ ہندوستان میں صنعتوں کو فروغ دیا جائے اور عوامی فلاح و بہبود پر خصوصی توجہ دی جائے۔ ہماری حکومت کا مقصد ہندوستان کے ہر شہری کی بہتری ہے کیونکہ ان کی خوشحالی میں ہی تاج برطانیہ کی مضبوطی مضمر ہے۔ ان کا اطمینان ہمارے تحفظ کا ضامن ہے اور ان کا تشکر ہمارا بہترین صلہ ہے۔"

ہندوستان کے عوام نے ملکہ کی تقریر کی بے حد پذیرائی کی۔ دریں اثناء اندرونی شورشوں اور بدامنی کے ستائے ہوئے شہریوں نے انگریز راج کو نعمت الہی سمجھ کر قبول کیا۔ اس کے بعد ملک کے بڑے بڑے شہروں میں تیزی سے یونیورسٹیاں قائم کی گئیں اور انگریزی تعلیم عام ہوئی۔ اس کا اوّلین اثر خواب آور دوا کی مانند تھا ہندوستان کے عوام نے اسے بلا رد و کد قبول کر لیا۔ ان کا پہلا رد عمل بالکل اندھی تقلید کا سا تھا۔ انہوں نے مغربی افکار اور معیارات کو فوراً اپنا لیا۔ نامور انگریزی مفکرین' ہابز' لاک' ہیوم برک اور جے ایس مل کے خیالات نے ان کے ذہنوں پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ ان لبرل (روشن خیال) فلسفیوں کے علاوہ ہندوستان کے تعلیم یافتہ افراد روسو اور والٹیئر سے بھی متعارف ہوئے جو انقلاب فرانس کے پیغمبر مانے جاتے ہیں اور جن کی تحریروں نے عوام کو سیاسی شعور کی دولت سے مالا مال کیا۔ آہستہ آہستہ تعلیم یافتہ ہندوستانی پارلیمانی اداروں کی افادیت سے آشنا ہونے لگے۔ برطانوی تاریخ پڑھ کر انہیں یقین ہو گیا کہ ملٹن اور برک کے هم وطن کبھی ان کے سیاسی حقوق غصب نہیں کریں گے اور جب بھی مناسب موقع آیا ہند میں پارلیمانی ادارے قائم کر دیئے جائیں گے لیکن بدنصیبی سے ان آدرشوں پر بھی

بھی صحیح معنوں میں عمل نہ ہو سکا جن کا تذکرہ ملکہ وکٹوریہ نے اپنے خطبے میں کیا تھا۔ ہندوستان کی دولت سے جب برطانیہ میں مادی آسودگی کا دور دورہ ہوا تو وہاں کے باشندے نسلی برتری کے احساس میں مبتلا ہو گئے۔ قدامت پسند برطانوی وزیر اعظم ڈزرائیلی کے عہد حکومت میں امپریلزم کے جذبات کو مزید ہوا ملی اور انگریزوں نے خود کو منتخب قوم تصور کر لیا جنہیں ہندوستانیوں پر حکومت کرنے کا پیدائشی حق حاصل تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے انہیں خوف کا شکار بھی بنا دیا چنانچہ انہوں نے ہندوستانیوں کو کچلنے کے لئے نت نئے حربے استعمال کرنے شروع کر دیئے۔ وائسرائے لارڈ لٹن نے آرمز ایکٹ کے تحت مقامی باشندوں پر آتشیں اسلحہ رکھنے پر پابندی عائد کر دی اور پریس ایکٹ کے ذریعے اخبارات پر بھی متعدد پابندیاں لگا دیں دریں اثناء سول سروس میں ہندوستانیوں کی شرکت میں بھی کئی رکاوٹیں حائل کی گئیں۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۸۵۳ء کے ذریعے اس امر کو یقینی بنایا گیا تھا کہ انڈین سول سروس میں شمولیت مقابلے کے امتحان کے ذریعے ہو گی اور کسی ہندوستانی کو اس میں شرکت سے نہیں روکا جائے گا۔ مقابلے کے پہلے امتحانات ۱۸۵۵ء میں منعقد ہوئے۔ ۱۸۶۴ء میں سیتندر ناتھ ٹیگور مقابلے کا امتحان پاس کر کے سول سروس میں شامل ہونے والے پہلے ہندوستانی تھے۔ ۱۸۷۱ء میں تین دیگر بنگالیوں نے بھی سول سروس میں شمولیت اختیار کی۔ سرکاری عہدوں پر ہندوستانیوں کی تعیناتی سے حکمران طبقے کے سینے پر سانپ لوٹنے لگا اور اینگلو انڈین پریس نے شور و غوغا کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا۔ حکمران طبقہ دیسی عوام کو اپنا ہمسر نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ اس سے اس کے نسلی تفاخر کے احساس کو ٹھیس پہنچتی تھی۔ اس ضمن میں بنگال کے گورنر سر ایشلے ایڈن نے ۸ مارچ ۱۸۷۷ء کو ہندوستانی حکومت کو ایک خط بھی لکھا جس میں موصوف نے وضاحت کی کہ یہ خیال یکسر غلط ہے کہ ہر ہندوستانی کو سول سروس میں شرکت کی اجازت ہو گی۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اس غلط فہمی کو دور کیا جائے۔ ہندوستانیوں کی ترقی سے قدامت پسند انگریز سیاستدان

بھی سخت نالاں تھے۔ برطانوی وزیر خارجہ برائے امور ہنڈیوک آف آرگلے نے کھلے الفاظ میں سرکار ہندوستان کو تنبیہہ کی کہ "اس امر کو کبھی فراموش نہ کیا جائے کہ ہندوستانی عوام کی اولین ذمہ داری ہماری سلطنت سے وفاداری اور اس کی حفاظت ہے۔ ہماری پالیسی کا پہلا نکتہ اپنی حکومت اور بالادستی کا تحفظ ہے اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ اہم اور کلیدی عہدوں کی اکثریت برطانوی اہلکاروں ہی سے پر کی جائے۔" آرگلے کے خیالات کو عملی جامہ اس کے جانشین لارڈ سالسبری نے پہنایا جس نے سول سروس میں شرکت کے لئے ہندوستانی امیدواروں کی عمر میں امتیازی تبدیلی کی اور عربی' فارسی اور سنسکرت کی اہمیت کو لاطینی' یونانی اور دیگر مغربی زبانوں کے مقابلے میں کم کر دیا۔ ان بدنیتی پر مبنی اقدامات کا مقصد صریحاً ہندوستانی عوام کو اعلیٰ سرکاری ملازمتوں سے دور کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ شاہی محل سے ہندوستانیوں کے لئے حقوق اور مساوات کے منافقانہ نعرے بھی ہر وقت بلند کئے جاتے رہے۔ انڈین سول سروس کے ممتاز رکن سرجوھن سٹریچے نے کھلے دل سے اعتراف کیا ہے کہ "ہمیں یہ بات تسلیم کرتے ہوئے قطعاً ہچکچانا نہیں چاہئے کہ ہمارا مقصد اعلیٰ انتظامی عہدوں پر اپنی اجارہ داری قائم رکھنا ہے کیونکہ انہی پر ہماری سیاسی' فوجی اور حقیقی طاقت کا انحصار ہے۔"

ان سب باتوں کے رد عمل میں ہندوستانی عوام میں بھی جذبہ قوم پرستی بیدار ہوا جسے ایک اور واقعے نے عروج تک پہنچا دیا۔ رجعت پسند اور بدنیت لارڈ لٹن کی جگہ لارڈ رپن کو فائز کیا گیا جو نسبتاً ہمدردانہ نقطہ نظر کا مالک تھا اور اس نے سرکار برطانیہ کی بے لچک پالیسیوں میں کافی نرمی پیدا کی۔ اس کی حکومت نے پرانی مجلس قانون ساز میں ایک بل بھی پیش کیا۔ یہ ۱۸۸۳ء کا ایک اہم واقعہ تھا۔ اس بل کو البرٹ بل کیا جاتا ہے کیونکہ اسے سر کورٹنے البرٹ نے تیار کیا تھا جو وائسرائے کونسل کے قانونی رکن تھے۔ اس قانون کا مقصد ایک ایسے عدالتی سقم کو دور کرنا تھا جس کے ذریعے ہندوستانیوں پر بے جا پابندیاں عائد کی گئی تھیں۔ بڑے شہروں کے علاوہ عدلیہ کے اہلکاروں کو بے لگام اختیارات حاصل

تھے وہ "جسٹس آف پیس" کی ذمہ داریاں بھی انجام دیتے تھے اور ایسے مجرموں کو سزا دینے کے مجاز بھی تھے جنہوں نے انگریزوں کے خلاف جرائم کا ارتکاب کیا ہو۔ لیکن سول سروس کے ذریعے ہندوستانی شہری خود بھی عدلیہ کے اعلیٰ عہدوں تک پہنچ چکے تھے چنانچہ لارڈ رپن نے سوچا کہ ہندوستانی ججوں کو بھی یہ اختیار ہونا چاہئے کہ وہ بلاتخصیص قومیت ہر فرد کو انصاف دے سکیں لیکن اس بل سے انگریزوں میں اشتعال کی لہر دوڑ گئی انہوں نے دیسی ججوں سے انصاف کا حصول اپنے لئے توہین قرار دیا اور اسے اپنی مراعات پر ڈاکے کا نام دیا۔ سر ایشلے ایڈن کے مطابق یہ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں اس شدت سے بھڑکنے والی نسلی تصادم کی سب سے بڑی آگ تھی۔ کلکتہ میں مقیم انگریزوں نے ٹاؤن ہال کے ایک جلسے میں لارڈ رپن کی شدید مذمت کی۔ نسلی تفاخر کی انتہا یہ تھی کہ کچھ انگریزوں نے عزم کیا کہ اگر یہ قانون منظور ہوا تو وہ وائسرائے کو چاندپال گھاٹ پر سٹیمر میں پھینک کر واپس انگلستان دفعان کر دیں گے۔

سرکار اپنے ہم نسلوں اور بالادست طبقات کا دباؤ برداشت نہ کر سکی اور قانون میں ایسی ترامیم کر دی گئیں جن سے اس کی حقیقی روح گھٹ کر مر گئی۔ انگریزوں کے اس رویے اور بالخصوص قانون کی واپسی نے ان اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو سخت مایوس اور دل گرفتہ کیا جو لبرل برطانوی فلسفے سے متاثر ہو کر نہ صرف اعلیٰ سرکاری عہدوں پر پہنچنے کے متمنی تھے بلکہ آزادی اور خودمختاری کے بھی شدت سے خواہش مند تھے لیکن اس بدترین نسل پرستی نے ان پر ایک بات اچھی طرح واضح کر دی کہ برطانوی تسلط سے چھٹکارہ طویل کڑی اور جانکاہ جدوجہد کے بغیر ہرگز ممکن نہ ہو گا۔

اس منظرنامے میں ایک اور اہم کردار ایلن ہیوم سامنے آیا جو برطانوی سول سروس کا ایک نمایاں اور قابل اہلکار تھا۔ اس نے ہندوستانیوں کی بے چینی کم کرنے کے ایک صحتمند فارمولا پیش کیا۔ ۳۰ برس تک سرکار ہندوستان میں خدمات انجام دینے کے بعد وہ تہہ دل سے ہندوستانیوں کے لئے کچھ کرنا چاہتا تھا۔ ہیوم کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ

برطانیہ کی قائم کردہ بیوروکریسی عوامی مسائل سے یکسر بے بہرہ ہے اور ایسا کوئی طریقہ کار جلد وضع کرنا چاہئے جس کے ذریعے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مضطرب ہندوستانی شہریوں کو اپنے اظہار کا آئینی اور صحتمند موقع مل سکے۔ اسی خیال کے زیراثر ہیوم نے ایک ایسی قومی جماعت قائم کرنے کا ارادہ کیا جہاں پڑھے لکھے باشعور ہندوستانی اکٹھے ہو سکیں۔ اس خیال کا اظہار اس نے کلکتہ یونیورسٹی کے گریجوایٹس کے نام ایک خوبصورت اور دلگداز خط میں کیا۔ یہ خط یکم مارچ ۱۸۸۳ء کو لکھا گیا۔ اس خط میں فارغ التحصیل طلبہ پر زور دیا گیا کہ وہ ہندوستان کی اخلاقی، سیاسی اور ذہنی نشاۃ ثانیہ کے لئے ایک موثر تنظیم قائم کریں۔ اس نے شروع میں صرف ۵۰ ایسے افراد کی طلب کی جو اچھے سچے، بے غرض، ثابت قدم اور مستقل مزاج ہونے کے ساتھ اپنے جذبات پر قابو اور عوامی فلاح کی تڑپ رکھتے ہوں۔ ہیوم کے مطابق "اگر رہنما خود ہی کردار کی خوبیوں سے محروم اور بندگان حرص و ہوس ہوں تو وہ ہم وطنوں کی بھلائی کے لئے کیا خاک کریں گے ہر حکومت شہریوں کے اخلاق اور مزاج کی عکاس ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لئے آپ جیسے منتخب اور اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کو سہل کوشی اور خود غرضی ترک کرنا ہو گی۔ آپ کو اپنے اور اپنے ہم وطنوں کے لئے آزادی کے حصول کی خاطر پامردی سے جدوجہد کرنا ہو گی صرف ایسی صورت ہی میں آپ آزادی، غیر جانبدارانہ انتظامیہ اور حق خودارادیت کے اہل ہو سکتے ہیں۔ بصورت دیگر آپ کو موجودہ برطانوی سرکار سے بہتر حکومت میسر نہیں آسکتی کیونکہ اخلاق و کردار کی موجودہ سطح پر آپ سب اسی کے مستحق ہیں۔"

"اس بات کی بے جا شکایت کا کوئی مصرف نہیں کہ انگریزوں نے آپ کو اعلیٰ عہدوں سے محروم کر رکھا ہے۔ انگریز آج جہاں ہیں وہ ان کی محنت، حب الوطنی اور اصول پرستی کا نتیجہ ہے اگر آپ مشترکہ فلاح اور عوامی اشتراک عمل کے جذبے پر آرام طلبی اور ذاتی تساہل کو ترجیح دیتے رہیں گے تو لازماً انگریزوں کو بھی آپ پر ترجیح دی جاتی رہے گی۔ ایسی صورت میں انگریز بدستور آپ پر حکمران رہیں گے۔ غلام و آقا کے اس

بندھن کو توڑنے کے لئے قربانی اور بے غرضی کے ہتھیاروں سے خود کو مسلح کرلیں۔ اس سے قبل کہ غلامی کا طوق آپ کے شانوں کو مفلوج کردے، شانے سے شانہ ملا کر کھڑے ہو جائیں اور ابدی صداقت، حقیقی مسرت اور سچی آزادی کی راہ پر گامزن ہوں۔ یاد رکھیں کہ اس کا واحد راستہ ایثار اور بے لوث عمل ہے۔"

دریں اثناء سریندر ناتھ بنیرجی بھی ہر محاذ پر بے حد متحرک تھے۔ ہم پہلے بھی تذکرہ کرچکے ہیں کہ انہوں نے آنند موھن بوس کے ساتھ مل کر انڈین ایسوسی ایشن کے نام سے ۱۸۷۶ء میں ایک تنظیم قائم کی تھی۔ اگلے برس سریندر دھلی دربار میں شریک ہوئے جہاں ہندوستانی عوام اور راجے مہاراجے بڑی تعداد میں اکٹھے ہوئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آل انڈیا پولیٹیکل اسمبلی کے قیام کی تحریک بھی انہیں دہلی دربار ہی سے ملی۔ اس اسمبلی میں وہ عوامی نمائندوں کی شرکت کے خواہش مند تھے جو ملک کے ہر کونے اور خطے سے تعلق رکھتے ہوں۔ یہی وہ قدم تھا جس نے پہلی مرتبہ ہندوستان کے عوام میں جذباتی یگانگت پیدا کی اور "ہندوستانی قوم" کے قیام کی راہ ہموار کی۔ اپنے خیالات کی ترویج و اشاعت کے لئے انہوں نے بمبئی اور مدراس کے طوفانی دورے بھی کئے۔ سریندر ناتھ اپنے مقصد میں بے حد کامیاب رہے اور ۱۸۸۳ء میں جب انہوں نے انڈین نیشنل کانفرنس کا انعقاد کیا تو ملک کے ہر حصے کا نمائندہ وہاں موجود تھا۔ امبیکا چرن موجمدار بھی اس کانفرنس میں شریک ہوئے وہ بعد ازاں انڈین نیشنل کانگریس کے صدر بھی بنے۔ انہوں نے اپنی کتاب بعنوان "ہندوستان میں قومیت کا ارتقاء" میں لکھا ہے "وہ ایک ناقابل فراموش منظر تھا جو راقم الحروف کی یادداشت میں آج بھی تازہ ہے۔ کانفرنس کی نشستیں ۳ روز تک جاری رہیں جن میں شامل ہر شخص جوش و خروش اور سرشاری سے معمور تھا۔ کانفرنس کے اختتام پر ہر فرد نے خود کو نئی روشنی اور تحریک سے مملو پایا۔" اس طرح ایک آل انڈین پولیٹیکل آرگنائزیشن کی راہ ہموار ہوئی۔

اسی اثناء میں ہیوم اپنی طرز کا کام کر رہے تھے۔ وہ شدت سے لارڈ ڈفرن کی حمایت

حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے جو لارڈ رپن کی جگہ وائسرائے بن کر آئے تھے۔ ہیوم نے ۱۸۸۵ء کے آغاز میں لارڈ ڈفرن سے ملاقات کی اور انہیں ہندوستانی عوام کے اضطراب سے آگاہ کیا اور کہا کہ اس سے پیشتر کہ عوام کی بے چینی خطرے کے نشان کو چھولے اس کے اظہار اور بہاؤ کے لئے آئینی ذرائع کی موجودگی بے حد لازم ہے۔ لارڈ ڈفرن نے اس بات کو گہری دلچسپی سے سنا اور خاطر خواہ غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندوستان میں بھی انگلستان کی طرز پر ایک جماعت ہونی چاہئے جو اپوزیشن کا کردار ادا کرے اور حکومت کو نہ صرف اس کی خامیوں اور کوتاہیوں سے آگاہ کرے بلکہ اصلاح کی تجاویز بھی پیش کرے جب کہ اب تک ہندوستان میں ایک بھی ایسا فرد یا جماعت موجود نہ تھی۔ لارڈ ڈفرن نے خیال ظاہر کیا کہ ہندوستان کے سیاستدانوں کو سال میں ایک مرتبہ اکٹھے ہو کر حکومت کی خوبیوں اور خامیوں کا تجزیہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اصلاحات کے لئے بھی مشاورت کرنی چاہئے۔ ہیوم سے تبادلہ خیالات کے بعد لارڈ ڈفرن نے اپنے نظریات کو حتمی شکل دی اور اس ضمن میں ایک سرکلر شائع کیا گیا جس کا متن درج ذیل ہے۔

"۲۵ سے ۳۱ دسمبر ۱۸۸۵ء تک پونا میں انڈین نیشنل یونین کا اجلاس ہو گا۔ کانفرنس میں نامور سیاستدانوں کو مدعو کیا جائے گا جو انگریزی زبان سے خاطر خواہ واقفیت رکھتے ہوں ان کا تعلق بنگال' مدراس اور بمبئی کے تمام علاقوں سے ہو گا۔ کانفرنس کے مقاصد کچھ اس طرح سے ہوں گے۔ (ا) قومی ترقی کے خواہش مند افراد اور کارکنوں کا باہمی تعارف۔ (ب) سال کے اختتام تک کئے جانے والے سیاسی اقدامات پر بحث و تمحیص"

اسی دوران ہیوم انگلستان گئے جہاں انہوں نے ایسے بارسوخ افراد کی کمیٹی تشکیل دی جو ہندوستانی عوام کی امنگوں سے ہمدردی رکھتے تھے۔ اس کمیٹی کے نامور ارکان میں جوین برائٹ' ہنری فاسٹ اور چارلس بریڈلے شامل تھے۔ سال کے آخر میں وہ ہندوستان

لوٹے جہاں مجوزہ کانفرنس کا انعقاد کرسمس (۲۵ دسمبر) کو ہونا قرار پایا تھا لیکن یہ کانفرنس سابق پروگرام کے مطابق پونا میں نہ ہو سکی کیونکہ وہاں ہیضے کی وبا پھوٹ پڑی تاہم یہ ۲۷ دسمبر ۱۸۸۵ء کو بمبئی میں شروع ہوئی اس کانفرنس میں توقع کے عین مطابق ہندوستان کے سبھی ممتاز سیاسی و عوامی نمائندے موجود تھے اور اسی تاریخ اور مقام پر اسے انڈین نیشنل کانگریس کا نام دیا گیا کانگریس سے خطاب کرنے والے پہلے مقرر ایلن ہیوم خود تھے جنہیں بلاشبہ کانگریس کا بانی قرار دیا جا سکتا ہے دیگر شرکاء میں دادا بھائی نوروجی' کاشی ناتھ ترمبک تلنگ' فیروز شاہ مہتہ' دین شاہ ایدول جی واچہ' بیرام جی مالواڑی اور نارائن گنیش چنداورکر بمبئی سے تشریف لائے۔ پونا کے ایک جج مادھو گووندا ران دے بھی کانگریس کے اجلاس میں آئے وہ بعدازاں بمبئی ہائی کورٹ کے جج بھی مقرر ہوئے۔ مدراس کی نمائندگی پی رانا سنگھ نائیڈو' ایس سُبرامنیہ ایر' پی آنند چارلو' جی سبرامنیہ ایر' ایم ویرا رگھوا چرائر اور پی کیشو پلائی نے کی۔ کلکتہ سے ڈبلیو سی بونرجی' سریندر ناتھ بنیرجی اور نریندر ناتھ سین تشریف لائے۔ سین ان دنوں "انڈین مرر" کے مدیر تھے۔ لکھنؤ سے گنگا پرشاد ورما نے کانگریس میں شرکت کی۔ ڈبلیو سی بونرجی نے اس تاریخی اجلاس کی صدارت کی اور اس طرح وہ انڈین نیشنل کانگریس کے پہلے صدر کے عہدے پر متمکن ہوئے۔

ایلن ہیوم کے علاوہ کچھ اور نیک دل اور باشعور انگریز بھی انڈین نیشنل کانگریس کے استحکام کے لئے تگ و دو میں مصروف رہے۔ ان میں سرولیم ویڈ برن بھی ایک تھے جو انڈین سول سروس کے معروف رکن ہونے کے علاوہ بمبئی ہائی کورٹ کے جج بھی رہے۔ عدلیہ سے ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے اپنی زندگی کانگریس کی ترقی کے لئے وقف کر دی اور دو مرتبہ اس کے صدر چنے گئے۔ ایلفنسٹن کالج بمبئی کے پرنسپل ورڈزورتھ کا نام بھی اس ضمن میں بے حد قابل ذکر ہے وہ کانگریس کے پہلے اجلاس میں بھی شامل ہوئے۔ کانگریس کے کھلے اجلاس سے پہلے اس کی ایک نجی نشست ورڈزورتھ کے گھر پر بھی ہوئی جہاں کانگریس کے رہنما سرولیم ویڈبرن بھی موجود تھے۔

بہرحال انڈین نیشنل کانگریس ایلن ہیوم کا قرض کبھی چکا نہ پائے گی۔ وہ اینگلو انڈین دوستی کے زبردست چیمپئن تھے۔ ان کا پختہ اعتقاد تھا کہ ہندوستانی اور برطانوی عوام کے مفادات یکساں ہیں اور ایمپائر ہندوستان کے اندر اپنی حکومت اس طرح بھی قائم رکھ سکتی ہے کہ کسی کے حقوق پر آنچ نہ آئے لیکن بدنصیبی سے ہیوم کی یہ خواہش اور امید پروان نہ چڑھ سکی کیونکہ بیشتر برطانوی عہدیدار ان کی انسانیت پرستانہ اور لبرل پالیسیوں سے اتفاق نہ رکھتے تھے۔ ان میں قدامت پسندی، تعصب اور نسل پرستی بے حد راسخ تھی اور ان کا پہلا ہدف ہندوستان کو بدستور غلام رکھنا اور کانگریس کو بدنام کرنا تھا۔ پروپیگنڈہ کے پہلے دور میں انہوں نے کانگریس کو ایک بددیانت اور دغاباز تنظیم قرار دیا لیکن ان سب منفی کارروائیوں کے باوجود ہیوم کا بویا ہوا یہ بیج ایک تناور درخت بنا اور کانگریس ہندوستان کی موثر ترین سیاسی جماعت ثابت ہوئی۔

باب سوم

ہندوستان میں مسلم سیاست کا پس منظر

غیر منقسم ہند میں مسلمانوں کی تعداد کل آبادی کا پانچواں حصہ تھی۔ پنجاب اور شمالی ہند کے کچھ علاقوں کے علاوہ بیشتر مسلمان غیر ملکی فاتحین کی اولاد تھے۔ مسلمانوں کا بڑا حصہ اسلام قبول کرنے والے ہندوؤں پر مشتمل تھا جن کے قبول اسلام کی بڑی وجہ اونچی ذات کے بالادست ہندوؤں کے مظالم سے نجات پانا تھی۔ بہرطور یہ لوگ اپنے ہندو ہم وطنوں اور بھائیوں کے ہمراہ بڑی پرامن زندگی گزار رہے تھے۔ جہاں تک عوام کا تعلق ہے ان کے طرز زندگی میں اس قدر یکسانیت تھی کہ انہیں ایک دوسرے سے ممیز کرنا آسان نہ تھا۔ ملک میں کبھی فرقہ وارانہ یا مذہبی تصادم نہیں ہوا تھا۔ یہ تقدیر کا ایک ہولناک مذاق تھا کہ ۲۰ ویں صدی کے پہلے حصے میں ہونے والے ہندو مسلم فسادات کی جڑیں عوامی ہرگز نہیں تھیں بلکہ یہ ان رہنماؤں اور دانشوروں کی باہمی مخاصمت کا نتیجہ تھے جو آپس میں عہدوں اور اقتدار کی ذاتی جنگ لڑ رہے تھے۔

ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) میں مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف بھرپور مزاحمت کی تھی۔ دھلی کا کٹھ پتلی مغل تاجدار اپنی تمام تر بے کسی کے باوجود اس عوامی بغاوت کا سربراہ تسلیم کیا گیا لہٰذا یہ کوئی باعث حیرت امر نہیں کہ جنگ آزادی کو کچلنے کے بعد انگریزوں نے اپنے غم و غصے اور انتقام کا نشانہ ہندوؤں کی نسبت مسلمانوں کو زیادہ بنایا۔ مسلمانوں کے اونچے طبقات کو اس قدر استحصال کا نشانہ بنایا گیا کہ وہ اپنے خول میں بند ہو کر رہ گئے ان میں سے زیادہ تر کا تعلق شمالی ہند سے تھا۔ یہ لوگ اپنی قدیم اور فرسودہ روایات سے چمٹے رہے اور انہوں نے ترقی اور انگریزی تعلیم پر قطعاً کوئی توجہ نہیں دی اس کے برعکس ہندوؤں نے تعلیمی اداروں سے بھرپور استفادہ کیا' جدید نظریات سے فائدہ اٹھایا اور ملک کے بیشتر حصوں میں اعلیٰ عہدے حاصل کئے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ

نکلا کہ ایک نیا تعلیم یافتہ ہندو متوسط طبقہ پیدا ہوا جو تمام سرکاری عہدوں پر چھایا ہوا تھا یہ لوگ پیشہ ورانہ تعلیم میں بھی بہت آگے نکل چکے تھے جب کہ مسلمانوں میں ایسے متوسط طبقے کا سرے سے کوئی وجود نہ تھا۔ اس کی بڑی وجہ مسلمانوں کا تعلیم سے دور رہنا' تجارت و صنعت کو نہ اپنانا اور بوسیدہ جاگیرداری طرز زندگی سے گہری وابستگی تھی۔ چنانچہ مسلمان تعلیم' سیاست اور اقتصادیات الغرض ہر میدان میں بے حد پسماندہ رہ گئے۔

لیکن خوش قسمتی سے جہالت کے ان تاریک ایام میں ایک بڑا مسلمان رہنما پیدا ہوا جسے دنیا آج سرسید احمد خاں کے نام سے جانتی ہے۔ سرسید نے سب سے پہلے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنیاد رکھی جو بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کر گیا۔ سرسید وہ پہلے رہنما تھے جنہوں نے مسلمان نوجوانوں کو انگریزی تعلیم کی جانب راغب کیا۔ ان کی اولین ترجیح یہ تھی کہ حکمران طبقے کے دل میں مسلمانوں کا کھویا ہوا اعتماد بحال ہو سکے اور سرکار کے ساتھ ان کے تعلقات بہتر ہو سکیں اس مقصد کے پیش نظر انہوں نے مسلمانو کو ہدایت کی کہ وہ سیاست سے کنارہ کش رہیں اور اپنی پوری توجہ تعلیم پر مرکوز رکھیں یہ وہی دور تھا جب کانگریس نے ہندوستان میں فروغ قوم پرستی اور حکومت پر تنقید کا آغاز کیا لیکن سرسید نے اپنے مخصوص نقطہ نظر کے تحت مسلمانوں کو اس رجحان سے دور رہنے کا مشورہ دیا۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے سیاست میں حصہ لینے کا مناسب وقت ابھی نہیں آیا تھا کیونکہ انہیں اپنے تعلیمی پروگرام کے لئے سرکاری اعانت کی ضرورت تھی اور وہ اس مرحلے پر حکومت پر تنقید کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

علی گڑھ کالج کا بیشتر سٹاف انگریزوں پر مشتمل تھا جو کانگریس کے لئے اچھے جذبات نہیں رکھتے تھے۔ ان کی موجودگی سے علی گڑھ اینٹی کانگریس افکار و نظریات کا مرکز بن گیا۔ اس کے نتیجے میں ایک الگ طرز کی تعلیم یافتہ مڈل کلاس پیدا ہوئی جو ملک کے قومی دھارے سے قطعاً جدا تھی اور علیحدگی پسند رجحانات کی حامل تھی۔ علی گڑھ کالج کے قیام کے باوجود مسلمانوں میں شرح تعلیم بہت کم اور سست رفتار تھی اور ہندو اب بھی ہر میدان

میں ان سے کوسوں آگے تھے۔ چنانچہ مسلمان نوجوانوں کے دل میں ہندوؤں کے لئے برادرانہ جذبات کی جگہ حسد' تعصب اور بغض نے لے لی۔ مسلمانوں کے اس احساس محرومی کا انگریزوں نے خاطر خواہ بلکہ پورا پورا فائدہ اٹھایا کیونکہ ان کے مفادات کا تحفظ ہندوستانی عوام کے انتشار میں مضمر تھا۔

یہاں ایک بات کی وضاحت اشد ضروری ہے وہ یہ کہ سرسید کوئی مذہبی جنونی' فرقہ پرست یا ہندوؤں سے نفرت کرنے والے انسان نہ تھے۔ ان کا سیاست سے دور رہنا ان کی مصلحتوں کا نتیجہ تھا۔ وگرنہ وہ کہا کرتے تھے کہ ہندو اور مسلمان ہندوستان کے چہرے کی دو آنکھیں ہیں جن میں سے کسی ایک کی خرابی بھی چہرے کو مسخ کر سکتی ہے۔ ایک موقع پر انہوں نے کہا "یاد رکھیں کہ ہندو اور مسلمان صرف دو لفظ ہیں جو ایک مذہب کو دوسرے مذہب سے جدا کرتے ہیں لیکن کوئی بھی فرد خواہ وہ مسلمان ہو' ہندو یا عیسائی! ہندوستان کا باشندہ ہے اور ایک ہی قوم کا حصہ ہے۔"

اگرچہ انڈین نیشنل کانگریس ہندوستان کے تمام عوام کی نمائندگی کے لئے بنائی گئی تھی یہ کوئی نسلی یا طبقاتی جماعت نہ تھی لیکن اس کے باوجود وہ مسلمانوں کے اس حصے کی حمایت حاصل کرنے میں یکسر ناکام رہی جو علی گڑھ کے زیر اثر تھا۔ تاہم جو لوگ علی گڑھ سے متاثر نہ تھے وہ نہایت ذوق و شوق سے کانگریس میں شامل ہوئے۔ موخر الذکر حضرات میں بدرالدین طیب جی اور رحمت اللہ سیانی قابل ذکر ہیں یہ دونوں بعد ازاں کانگریس کے صدور بھی بنے۔ محمد علی جناح تو ہندوؤں سے بھی بڑھ کر سرگرمی اور جوش و خروش سے کانگریس کے رکن بنے لیکن علی گڑھ کے اثرات مسلمانوں میں علیحدگی' اجنبیت اور فرقہ واریت کے بیج بہت گہرے بو چکے تھے۔ بدنصیبی سے حکمرانوں کی پالیسی بھی "لڑاؤ اور راج کرو" ہی تھی۔ ۱۹۰۵ء کی تقسیم بنگال بھی انگریزوں کی اسی سوچی سمجھی حکمت عملی کا نتیجہ تھی اس کا مقصد مسلمانوں کو ایک بڑے اکثریتی صوبے کی مراعات دینا تھا۔ انگریز اپنے مقاصد کے لئے مسلمانوں سے اچھے تعلقات قائم کرنا چاہتے تھے۔

تقسیم بنگال پر ہندوؤں نے سخت پر تشدد رد عمل کا مظاہرہ کیا اور احتجاجا" برطانوی مصنوعات کا بائیکاٹ کر دیا۔ حکومت نے اس موقعے سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور منٹو۔ مورلے اصلاحات نافذ کر دیں جنہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خلیج کو مزید گہرا کر دیا۔ ان اصلاحات سے صرف ایک ماہ قبل یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو مسلمانوں کا ایک وفد سر آغا خان کی قیادت میں وائسرائے لارڈ منٹو سے ملنے گیا جہاں اس نے لارڈ موصوف سے مسلمانوں کے لئے جداگانہ طرز انتخاب کا مطالبہ کیا جس پر وائسرائے نے گہری ہمدردی سے غور کرنے کا وعدہ کیا۔ مسلمانوں کا یہ مطالبہ تو پہلے ہی انگریزوں کے من کی مراد تھا۔ یہ سنتے ہی ان کے دل کی کلی کھل گئی۔ لیڈی منٹو نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے "مسلمانوں کا یہ مطالبہ ساڑھے چھ کروڑ متحد عوام کی طاقتور اپوزیشن سے بچنے کے لئے اس قدر شاندار تھا کہ سرکار نے اسے عطیہ الٰہی تصور کیا" ۱۹ ویں صدی تک مسلمانوں کے پاس ایک بھی علیحدہ سیاسی تنظیم نہ تھی۔ سرسید کی قائم کردہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس وہ واحد نیم ترقی پسند پلیٹ فارم تھا جس پر اکٹھے ہو کر کچھ لوگ سیاسی گفتگو کر سکتے تھے۔ تقسیم بنگال کے بعد ۱۹۰۶ء کے اختتام میں ڈھاکہ میں کانفرنس کا اجلاس بلایا گیا۔ ڈھاکہ نو قائم شدہ صوبے مشرقی بنگال اور آسام کا مشترکہ دارالحکومت تھا۔ اس اجلاس میں شامل ممتاز ارکان میں ڈھاکہ سے نواب سلیم اللہ، دہلی سے حکیم اجمل خان، نواب محسن الملک اور علی گڑھ سے وقارالملک کے نام قابل ذکر ہیں۔ کانفرنس کے اختتام پر "آل انڈیا مسلم لیگ" کے نام سے ایک علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا مسلم لیگ کے مقاصد کچھ اس طرح بیان کئے گئے۔

ا مسلمانوں کے دلوں میں سرکار برطانیہ کے لئے وفاداری پیدا کرنا اور حکومت سے متعلق ان کی غلط فہمیوں اور شکوک و شبہات کا ازالہ کرنا۔

ب مسلمانوں کے سیاسی حقوق و مفادات کا تحفظ کرنا اور اپنی خواہشات اور عرضداشتیں مودبانہ انداز میں سرکار کو پیش کرنا۔

ج مسلمانوں کے دلوں سے دیگر مذاہب کے لئے تعصب یا نفرت ختم کرنا اور ان میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کرنا۔

منٹو مارلے اصلاحات کو حتمی شکل انڈین کونسلز ایکٹ ۱۹۰۹ء کے تحت دی گئی اور مسلمانوں کو ان کی خواہش کے مطابق جداگانہ حق انتخاب دے دیا گیا جس کی مدد سے انہیں ان کی آبادی کے تناسب سے ہر ادارے میں زیادہ نشستیں مل سکتی تھیں۔ آغا خان جنہیں مسلم سیاست میں غیر معمولی مقام حاصل ہو گیا تھا انہوں نے جداگانہ طرز انتخاب کے ذریعے منتخب ہونے والے اراکین سے خطاب کرتے ہوئے انہیں کونسلوں میں مثالی رویہ اپنانے کا درس دیتے ہوئے کہا۔

"منتخب نمائندوں کو ہندوستانی شہری ہونے کے ناطے دیگر ہندوستانی باشندوں سے تعاون کرنا چاہئے اور ملک میں تعلیم، تجارت اور زراعت کے فروغ کے لئے انتھک محنت کرنی چاہئے۔ زراعت کے فروغ کے لئے قرضوں کی فراہمی کی خاطر کوآپریٹو سوسائٹیاں قائم کرنی چاہئیں تاکہ ہندوستان میں موجود قدرتی ذرائع پیداوار میں اضافہ ممکن ہو سکے۔ ان تمام امور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مل کر کام کرنا چاہئے ہمارے نمائندوں کو ایسے سماجی اقدامات خصوصاً کرنے چاہئیں جن سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچے لیکن ہم اس ضمن میں ہندوؤں سے بھی تعاون کی توقع رکھتے ہیں کیونکہ ہماری بعض ضروریات سے وہ آگاہ نہیں ہیں۔"

اسی دوران مسلمانوں کا ایک بڑا رہنما ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہوا سیاسی منظرنامے پر اجاگر ہو رہا تھا وہ محمد علی جناح کے سوا کوئی اور نہیں تھا جسے آگے چل کر ہندوستانی سیاست میں اہم کردار ادا کرنا تھا۔

باب چہارم

محمد علی جناح ○ ابتدائی سیاست ○ سفیر ہندو مسلم اتحاد

محمد علی جناح کرسمس کے دن ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء کو کراچی کے ایک تاجر خاندان میں پیدا ہوئے جو کھوجہ / برادری سے تعلق رکھتا تھا۔ ان کے آباؤ اجداد گجرات کے کاٹھیہ واڑی ہندو تھے۔ انہوں نے کراچی اور بمبئی سے تعلیم حاصل کی وہ ۱۸۹۲ء میں قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان گئے اور لنکز ان میں داخلہ لیا۔ ۱۸۹۷ء میں انہیں قانون کی سند عطا ہوئی اور وطن واپس آکر وہ بمبئی ہائی کورٹ سے وابستہ ہو گئے۔

انگلستان میں قیام کے دوران ہی جناح کے قریبی مراسم دادا بھائی نوروجی سے استوار ہو گئے جو نہ صرف انڈین نیشنل کانگریس کے بانیوں میں سے ایک تھے بلکہ برطانوی پارلیمنٹ کے لبرل رکن بھی تھے۔ جناح نے سیاسیات کے ابتدائی درس دادا بھائی ہی سے لئے جن سے ان کی ملاقات بکثرت دارالعوام اور لبرل سیاستدانوں کے اجلاسوں میں ہوتی تھی۔ آہستہ آہستہ سیاست اور لبرل ازم ان کی زندگی کا حصہ بن گئے۔ وہ ایک بڑے پارلیمنٹرین بننا چاہتے تھے' اس خواہش کی کونپل ان کے اندر قیام انگلستان کے دوران ہی پھوٹی تھی جب وہ بے حد نو عمر تھے لیکن عدلیہ سے وابستہ ہونے کے بعد پہلے ۳ برس انہیں شدید دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مالی مشکلات کے باعث ۱۹۰۰ء میں انہیں پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی نوکری قبول کرنی پڑی لیکن جلد ہی وہ مستعفی ہو کر وہ دوبارہ بار کی جانب لوٹ گئے۔ انہیں قانون کی ہر شاخ پر غضب کا عبور حاصل تھا اس لئے جلد ہی ان کی حیثیت ہائی کورٹ میں بے حد مستحکم ہو گئی۔ مالی معاملات پر گرفت حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اپنی توجہ از سر نو سیاست کی جانب مبذول کی۔ چونکہ ان کی سیاسی تربیت لبرل ازم کے مدرسۂ فکر میں ہوئی تھی اس لئے فطری طور پر وہ اس راہ پر گامزن ہوئے جس پر سر فیروز شاہ مہتہ اور گوپال کرشن گوکھلے رواں تھے۔ جناح سیاست میں بال گنگا دھر تلک جیسی انتہا

پسندی کے خلاف تھے۔ ۱۹۰۶ء میں دادا بھائی نوروجی کانگریس کے اجلاس کی صدارت کے لئے انگلستان سے ہند تشریف لائے۔ یہ اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا۔ جناح مہمان کے طور پر اجلاس میں شریک ہوئے اور انہوں نے دادا بھائی کے پرائیوٹ سیکرٹری کے فرائض انجام دیئے۔ جناح نے مسلم لیگ کے قیام اور اس کی سرگرمیوں کو کئی برس درخور اعتناء نہیں گردانا۔ وہ اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریاں نبھانے کے ساتھ امپریل لیجسلیٹو کونسل کے رکن کے طور پر کام کرتے رہے جس میں ان کا انتخاب ۱۹۰۹ء میں ہوا تھا۔ یہ ایک قابل ذکر امر ہے کہ کونسل میں اپنی پہلی تقریر میں انہوں نے جنوبی افریقہ میں گاندھی جی کے فلاحی کاموں کو سراہا۔ اس اجلاس کی مختصر کارروائی درج ذیل ہے۔

محترم رکن ایم اے جناح!

مائی لارڈ میں بلا ہچکچاہٹ کہوں گا کہ یہ آج کا سب سے دردناک سوال ہے جس امر کے متعلق میں بات کرنے والا ہوں اس نے ہر ہندوستانی کو شدید کرب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ یہ ہے جنوبی افریقہ میں ہندوستانی شہریوں کے ساتھ ہونے والا سخت انسانیت سوز سلوک۔"

صدر مجلس (لارڈ منٹو' وائسرائے)

"میں یہاں محترم رکن مقننہ سے کچھ نرم الفاظ استعمال کرنے کی خواہش رکھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ "انسانیت سوز" نہایت سخت لفظ ہے اور معزز رکن کو یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ وہ ایمپائر کی دوست اکائی کے متعلق بات کر رہے ہیں لہٰذا انہیں اپنے الفاظ کے انتخاب میں محتاط رہنا چاہئے۔"

محترم رکن ایم اے جناح!

"بہت بہتر مائی لارڈ اگرچہ میں اس سے بھی زیادہ شدید اور موثر الفاظ استعمال کرنا چاہتا ہوں لیکن میں اس کونسل کی آئینی حدود سے آشنا ہوں جنہیں توڑنا میں ہرگز پسند نہیں کروں گا لیکن میں اپنے اس موقف پر بدستور قائم ہوں کہ

جنوبی افریقہ میں ہندوستانی شہریوں کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے وہ بدترین ہے جس کے خلاف عوام کا ردعمل بالکل بجا ہے۔"

اس سے قبل کسی بھی فرد کو وائسرائے کے سامنے اس قدر بے جگری اور جرات مندی سے بولنے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔ لہٰذا اخبارات نے کونسل کی کارروائی میں جناح کے خطاب کو شاندار کوریج دی اور راتوں رات ان کی شہرت ملک بھر میں پھیل گئی۔ عوام میں یہ خیال بیدار ہوا کہ ان کی امنگوں کو بے خوفی سے بیان کرنے والی آواز پیدا ہو چکی ہے۔ اس کے بعد جناح کا نام اخبارات کے صفحات اول سے کبھی محو نہیں ہوا۔

جب جناح امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے رکن بنے اس کے سب سے موثر غیر سرکاری رکن گوکھلے تھے۔ نوجوان جناح گوکھلے کے پرستار بن گئے۔ گوکھلے اور جناح کونسل میں طاقتور اپوزیشن کا حقیقی کردار ادا کرتے رہے۔ دونوں ایک دوسرے پر بھروسہ کرتے تھے اور انہوں نے ملک و قوم کی بہتری کے لئے نہایت محنت سے کام کیا۔ مسز سروجنی نائیڈو نے اپنی کتاب "اتحاد کا سفیر" میں لکھا ہے کہ جناح اکثر کہا کرتے تھے کہ اس دور میں ان کی زندگی کا مقصد گوکھلے کے نقوش پا پر چلنا تھا۔ ۱۹۱۰ء میں سرکار برطانیہ نے ملک میں انتشار پیدا کرنے کے لئے ایک اور کوشش کی جس کے تحت بلدیاتی اداروں میں مذہبی بنیادوں پر جداگانہ طرز انتخاب متعارف کروایا گیا۔ اسی برس کانگریس کا سالانہ اجلاس الہ آباد میں منعقد ہوا جس کی صدارت سر ولیم ویڈر برن نے کی۔ اس اجلاس میں جناح نے ایک قرارداد پیش کی اور جداگانہ طرز انتخاب کی مخالفت کی۔ ان کا کہنا تھا کہ بلدیاتی سطح تک اس طرز انتخاب کو فروغ دینے سے مذہبی مناقشت میں مزید اضافہ ہو گا۔ ایک اور ممتاز مسلمان رہنما مولانا مظہر الحق نے بھی جناح کی حمایت بے حد زور و شور سے کی۔ اجلاس کے اختتام پر سر ویڈر برن نے

ایک کانفرنس طلب کی جس میں دونوں مذاہب کے رہنماؤں سے شرکت کی استدعا کی گئی کانفرنس کا مقصد ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کرنا تھا جناح اس کانفرنس کے انتظامات میں بے حد سرگرم رہے۔ اگرچہ کانفرنس اپنے مقاصد حاصل نہ کر سکی لیکن جناح کی کوششوں کو ہر حلقے میں سراہا گیا۔

ہم پہلے بھی تذکرہ کر چکے ہیں کہ جناح نے مسلم لیگ کے آغاز میں اس پر کوئی توجہ نہیں دی لیکن جب وہ آئی ایل سی کے رکن کی حیثیت سے بے حد نامور ہو گئے تو ان پر مسلمانوں کا دباؤ اس قدر بڑھ گیا کہ بالآخر انہیں مسلم لیگ میں شرکت کرنا پڑا۔ ۱۹۱۳ء میں وہ اپنے ہم مذہبوں کے شدید اصرار پر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے لیکن کانگریسی آدرش ان کے دل و دماغ میں بدستور سمائے رہے جس کا اظہار مندرجہ ذیل اقتباس سے ہوتا ہے۔ اس میں مسلم لیگ کے مقاصد اس طرح بیان کئے گئے ہیں۔

"تاج برطانیہ کی سرپرستی میں ہندوستان میں ایسی خودمختار حکومت کا قیام جو آئینی ذرائع سے حاصل کی گئی ہو اور ہندوستانی عوام کے مزاج سے بھی مطابقت رکھتی ہو۔ اس حکومت کا قیام موجودہ انتظامیہ کی بتدریج اصلاح اور جذبہ قومیت و وحدت کی ترویج ہی سے ممکن ہے۔ اس کی خاطر ہندوستانی عوام میں جمہوری جذبات کو فروغ دینا ہو گا جو مختلف مذاہب کے افراد کے درمیان تعاون ہی سے ممکن ہے۔"

(جناح از ایم۔ ایچ۔ ایس صفحہ ۸۴)

کہا جاتا ہے کہ حقیقتاً" جناح کو مسلم لیگ میں لانے کا سہرہ محمد علی اور وزیر حسن کے سر ہے۔ سروجنی نائیڈو نے جناح کی مسلم لیگ میں شرکت کے متعلق کہا ہے۔

"جناح نے آل انڈیا مسلم لیگ میں نہایت رسمی انداز میں شمولیت اختیار کی جس کے نقطہ نظر کی وسعت میں ان کے افکار کا بہت دخل پہلے سے حاصل

تھا۔ ان میں اپنے وقار اور عزت و افتخار کا احساس اس قدر زیادہ تھا کہ کسی جماعت کی رکنیت حاصل کرنے جیسا معمولی کام بھی انہوں نے بڑے اعلیٰ طور طریقے سے انجام دیا۔ مسلم لیگ کی حمایت کے لئے انہیں قائل کرنے والے حضرات (وزیر حسن، محمد علی) نے انہیں تہہ دل سے یقین دلایا کہ مسلمانوں کی جماعت میں شرکت کرنے سے وہ قومی دھارے سے کٹیں گے نہیں اور ان کے کردار پر فرقہ واریت کی پرچھائیں تک نہیں پڑے گی۔ وہ اپنے اس مقصد سے ہمیشہ وابستہ رہیں گے جس کے لئے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی۔

(محمد علی جناح ایک سفیر اتحاد، صفحہ ۱۱)

مسلم لیگ میں شرکت کرتے ہی انہوں نے مندرجہ ذیل قرارداد منظور کی (جناح از ایم ایچ ایس، صفحہ ۸۵)

"آل انڈیا مسلم لیگ کا پختہ عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے عوام کی ترقی کا انحصار ان کے باہمی تعاون پر مبنی ہے جس کے لئے انہیں فرقہ وارانہ اختلافات کو پس پشت ڈالنا ہو گا۔ اس مقصد کے لئے فریقین کے رہنماؤں کو گاہے گاہے ملاقات کرتے رہنا چاہئے تاکہ مشترکہ اقدامات کے لئے لائحہ عمل تیار کیا جا سکے اور عوامی فلاح کو ممکن بنایا جا سکے۔"

ہندو مسلم اتحاد کے لئے ان کی مساعی اور کانگریس اور مسلم لیگ کو قریب تر لانے کے لئے تگ و دو کو ہر حلقے میں سراہا گیا۔ گوکھلے نے درج ذیل الفاظ میں جناح کو خراج تحسین پیش کیا جو تاریخ کے اوراق میں سنہری حروف میں رقم کئے جا سکتے ہیں۔

"جناح صداقت کی دولت سے مالامال تھے اور فرقہ وارانہ تعصب سے پاک ہونا ان کی ایسی بڑی خوبی تھی جس نے انہیں ہندو مسلم اتحاد کا سچا سفیر بنا دیا۔" (جناح از ایم ایچ ایس، صفحہ ۸۶)

جونہی جناح نے مسلم لیگ میں باقاعدہ اور رسمی شمولیت اختیار کی، کانگریس اور لیگ

میں کشیدگی رفتہ رفتہ تحلیل ہونے لگی۔ کانگریس نے مسلم لیگ کی جانب سے ظاہر کردہ نیک جذبات کا فوری اور مثبت جواب دیا۔ ۱۹۱۳ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس کراچی میں ہوا جس کی صدارت نواب سید محمد نے کی۔ اس اجلاس میں بھوپیندر ناتھ باسو نے ایک قرارداد پیش کی جس میں مسلم لیگ کے عمدہ خیالات کو سراہا گیا اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی ضرورت پر زور دینے کی تعریف کی گئی۔ دونوں جماعتوں کے رہنماؤں کی خواہش اور جناح کی تحریک پر کانگریس اور لیگ نے اپنے اپنے سالانہ اجلاس ۱۹۱۵ء میں اکٹھے بمبئی میں منعقد کئے۔ اس موقع پر کانگریس کے منتخب صدر سرپی سنہا (بعدازاں لارڈ سنہا) قرار پائے جب کہ مسلم لیگ میں یہ عہدہ بہار کے مظہرالحق کو حاصل ہوا۔ اس موقع پر کانگریس اور مسلم لیگ میں اس قدر محبت اور وحدت دیکھنے میں آئی کہ مولانا محمد علی مزاحیہ انداز میں یہ سطور لکھنے پر قائل ہو گئے۔ (از ایم ایس ایس، صفحہ ۱۲۰)

"مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان محبت کی شدت کا یہ عالم تھا کہ لارڈ سنہا نے اسی ٹرین سے بمبئی کا سفر کیا جس میں ان کے بہاری پڑوسی اور برادر وکیل مظہرالحق سفر کر رہے تھے۔ اس دوران انہوں نے موازنے کے لئے اپنے اپنے خطبۂ صدارت کا تبادلہ کیا لیکن انہیں واپس لینا بھول گئے۔ تقدیر کے دلچسپ مذاق کے تحت مولانا مظہرالحق نے ایک پرجوش بنگالی کا تند اور چبھتا ہوا خطبہ پڑھ دیا اور لارڈ سنہا نے کانگریس کے اجلاس میں مظہرالحق کی متین اور نرم رو تقریر پڑھی جو ایک محتاط اور وفادار مسلمان کی تحریر تھی۔"

کانگریس اور لیگ نے بمبئی میں اپنے اجلاس نہایت گرمجوشانہ اور خوشگوار ماحول میں ختم کئے اس موقع پر یہ فیصلہ بھی ہوا کہ آئندہ اجلاس لکھنؤ میں ہوں گے۔ بمبئی میں کانگریس کے ارکان کو یہ اختیار بھی دیا گیا کہ وہ مسلم لیگ کے ساتھ ملک میں خودمختار حکومت کا فارمولا بھی تشکیل دیں۔ اگلے برس (۱۹۱۶ء) کانگریس اور لیگ نے اپنے اپنے اجلاس لکھنؤ میں منعقد کئے۔ کانگریس کے اجلاس کی صدارت بابو امبیکا چرن موجمدار نے کی جب کہ جناح مسلم لیگ کے اجلاس کے صدر تھے۔ اس موقعے پر باہمی تعاون کی مزید

تجاویز پر غور کیا گیا اور ایسی اصلاحات پر تبادلۂ خیال ہوا جو دونوں مذاہب کے عوام کے لئے قابل قبول ہوں۔ اسی دوران ایک کانفرنس کا انعقاد بھی کیا گیا جس میں مسلم لیگ کی ترجمانی جناح نے کی۔ کانفرنس کے نتائج کانگریس کے ایک کھلے اجلاس میں پیش کئے گئے جس کی صدارت سرسندر ناتھ بنیر جی نے کی۔ اپنے خطبۂ صدارت میں انہوں نے کہا۔

"مجھے آج کانگریس کے اس اجلاس میں ان تجاویز پر غور کرتے ہوئے فخر محسوس ہو رہا ہے جو مسلم لیگ اور کانگریس کے نمائندوں نے پیش کی ہیں۔ ان میں باہمی تعاون اور عقلیت پسندی کا جو خوبصورت امتزاج نظر آ رہا ہے وہ ایک خود مختار جمہوری حکومت کا خصوصی طرۂ امتیاز ہے۔ تجاویز کا مجموعہ آپ کے سامنے ہے جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان اتحاد اور اتفاق روز بروز بڑھ رہا ہے۔ آج مسلمانوں کے رہنماؤں نے کانگریس کی جانب یگانگت کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ انہوں نے کھلی بانہوں سے ہمارا خیر مقدم کیا ہے-----"

(میری داستان حیات از ایم آر جے کار صفحہ ۱۵۶)

اجلاس لکھنؤ کے صدارتی خطبے میں جناح نے ملک میں سیاسی ترقی کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان باہمی تعاون پر زور دیا۔ ان کے الفاظ درج ذیل ہیں۔

"ہمیں ہندوؤں کے تئیں برادرانہ اور نیک جذبات کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔ اپنے ملک ہندوستان کے مفادات ہمیں ہر دم پیش نظر رکھنے چاہئے۔ ہندوستان کی ترقی کا راز ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد میں پنہاں ہے۔"

(جناح از ایم ایچ ایس، صفحہ ۱۳۱)

مسلم لیگ اور کانگریس نے لکھنؤ میں اپنے اپنے اجلاس کے دوران ایک معاہدے پر دستخط کئے جسے تاریخ نے "میثاق لکھنؤ" کے نام سے یاد رکھا ہے۔ میثاق لکھنؤ سے پیدا ہونے والی امید کا تذکرہ ایم آر جے کار نے اپنی کتاب (میری داستان حیات" کی جلد اول

میں صفحہ ۱۶۰ پر اس طرح کیا ہے۔

"میثاق لکھنؤ کے نتائج نہایت یادگار اور تاریخ ساز تھے۔ اس سے یہ امید مستحکم ہوئی کہ ہندو اور مسلمان اکٹھے ہو کر سرکار برطانیہ پر موثر دباؤ ڈال سکتے ہیں۔ اس میں مسلمانوں کے جذبات کا پورا پورا احترام کیا گیا تھا۔ مسلمانوں کے ۳ مطالبات بہت اہم تھے جن میں جداگانہ طرز انتخاب، مسلمانوں کی نمائندگی میں اضافہ اور تحفظات شامل تھے۔ کانگریس نے اس امر سے اتفاق کیا کہ ملک کی تمام اقلیتوں کو انتخابات کے ذریعے مناسب نمائندگی ملنی چاہئے اور مسلمانوں کو جداگانہ حق انتخاب دیا جانا چاہئے۔"

میثاق لکھنؤ میں ہونے والا سمجھوتہ اس بنیاد پر ہوا کیونکہ جناح نے یہ واضح کر دیا تھا کہ وہ خصوصی تحفظات اور جداگانہ طرز انتخاب کا مطالبہ عارضی طور پر محض اس مقصد کے لئے کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کی موجودہ پسماندگی اور جمود کو ختم کیا جا سکے مسلمانوں میں سیاسی ارتقاء کے ساتھ مناسب وقت آنے پر ان کی ضرورت خود بخود ختم ہو جائے گی۔ اس خیال کا اعادہ جناح نے بعد میں بھی کئی مرتبہ کیا۔ موٹیگ چمسفورڈ اصلاحات کے موقع پر قائم ہونے والی پارلیمانی کمیٹی کے رکن میجر آر مزبائی گور سے بات چیت کرتے ہوئے بھی جناح نے یہی خیالات دہرائے۔ اس مکالمے کو ایم آر جے کار نے اپنی کتاب "میری داستان حیات" کے صفحہ نمبر ۱۶۱ پر اس طرح نقل کیا ہے۔

میجر آر مزبائی!

کیا آپ حقیقی ہندوستانی قوم پرست ہیں؟

جناح: جی ہاں۔

میجر آر مزبائی: اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ سیاسی میدان میں ہندو مسلم کی تفریق سے بالاتر ہو کر کام کرنا چاہیں گے۔

جناح: جی ہاں! وہ دن میری زندگی کا خوشگوار ترین دن گا (جب مذہبی تخصیص سیاسی

میدان میں ختم ہو جائے گی)

لکھنؤ کانگریس کا ایک خوش کن پہلو یہ بھی تھا کہ اس کے دوران اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں کی وہ خلیج بھی پر ہو گئی جو ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئی تھی۔ دونوں دھڑوں کو احساس ہو گیا کہ اب وقت آن پہنچا ہے کہ پرانے اختلافات کو پس پشت ڈال کر تفرقات فراموش کر دیئے جائیں۔ سب سے زیادہ حیران کن امر یہ تھا کہ لوک منیا تلک نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان معاہدہ کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔ کانگریس کی استقبالیہ کمیٹی کے سربراہ پنڈت جگت نرائن نے اس امید افزاء معاہدے کا تذکرہ مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے۔

"موجودہ سال سیاسی ارتقاء کی تاریخ میں یاد رہے گا کیونکہ کانگریس میں وہ دھڑے بندی دور ہو گئی جو سورت کے اجلاس (۱۹۰۷ء) میں پیدا ہوئی تھی۔ کانگریس کے اتحاد کے علاوہ ہندوؤں اور مسمانوں کے خیالات کی یگانگت بھی سیاسی میدان میں بڑی پیش رفت ہے۔"

باب پنجم

گاندھی جی کی جنوبی افریقہ سے واپسی (۱۹۱۵ء)

۱۹۱۵ء کے آغاز میں ۹ جنوری کو ہندوستان کا ایک بطل جلیل ۲۰ سالہ غیر حاضری کے بعد جنوبی افریقہ سے واپس لوٹا جہاں وہ بے جگری سے اپنے ہم وطنوں کی عزت و ناموس کے لئے لڑا تھا۔ یہ آدمی گاندھی جی کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ وہ وکیل کی حیثیت سے ۱۸۹۴ء میں پیشہ ورانہ امور کی انجام دہی کے لئے جنوبی افریقہ گئے تھے اور جلد ہی ہندوستان لوٹ آنا چاہتے تھے لیکن وہاں ہندوستانی تارکین وطن کی حالت دیکھ کر انہوں نے اپنے قیام میں توسیع کر دی۔ وہ اپنے ہم وطنوں کی حالت بہتر بنانا چاہتے تھے۔ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کی حالت زار کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ملک کے کسی حصے میں بغیر اجازت نامے کے سفر نہیں کر سکتے تھے' رات کو کھلے عام گھوم پھر نہیں سکتے تھے اور ریلوے کے صرف تیسرے درجے میں سفر کر سکتے تھے۔ انہیں سیر و تفریح کے لئے پارکوں میں جانے کی اجازت بھی نہیں تھی اور ان پر بہت سی دوسری غیر انسانی پابندیاں عائد تھیں۔ ان کی حالت جانوروں سے بد تر تھی۔ گاندھی جی نے انہیں حقوق دلانے کے لئے مردانہ وار جدوجہد کا فیصلہ کر لیا۔ پہلے تو انہوں نے سرکار ہند اور سرکار برطانیہ کی توجہ مبذول کرنے کے لئے قانونی و آئینی ذرائع اختیار کئے لیکن ان کی تمام کوششیں ناکامی پر منتج ہوئیں۔

چنانچہ گاندھی جی نے فیصلہ کیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ انہیں پوری قوت سے مزاحمت کرنی چاہئے اور انہوں نے خاموش مزاحمت کا راستہ اختیار کیا۔ اس سے ساری دنیا ان کی جانب متوجہ ہوئی۔ اس وقت ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ہارڈنگ نے جنوبی افریقہ کے ہندوستانی عوام کے مسئلے پر گاندھی کے موقف کی بے حد حمایت کی۔ انہوں نے اس قدر عوامی خدمات کے صلے میں گاندھی جی کو قیصر ہند گولڈ میڈل عطا کیا۔ ۱۹۱۵ء

میں جب گاندھی جی ہندوستان پہنچے تو ان کا شاہانہ استقبال کیا گیا۔ جناح نے بھی گاندھی جی کو خراج تحسین پیش کرنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا۔ ایک گجراتی اجتماع میں جناح نے خوبصورت انگریزی زبان میں گاندھی جی کو دل کھول کر سراہا۔ وہ نہایت قیمتی مغربی لباس پہنے ہوئے تھے جب کہ گاندھی جی روایتی گجراتی لباس میں ملبوس تھے اور انہوں نے گجراتی زبان ہی میں اظہار خیال کیا۔ بلکہ انہوں نے گجراتی مجمعے سے انگریزی میں خطاب کرنے پر گزشتہ مقررین پر ہلکا پھلکا شائستہ طنز کیا جس پر مجمع کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ گاندھی جی نے کہا۔

اس اجتماع کو دیکھ کر مجھے بے حد حوصلہ ہوا اور میں نے محسوس کیا کہ مجھے اپنے خیالات اپنے ہم وطنوں کے سامنے پیش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہونی چاہئے۔"

(گاندھی جی کی خودنوشت سوانح حیات' صفحہ ۴۵۶)

گاندھی جی نہایت ٹھوس افکار اور لائحہ عمل لے کر ہندوستان آئے تھے۔ مذکورہ بالا تقریر سے انہوں نے ہندوستان میں اپنی تحریک کا آغاز کیا۔ اس تقریر کے ذریعے انہوں نے ملک کے مغرب زدہ سیاستدانوں پر پہلی چوٹ لگائی۔ انہوں نے ایسے سیاستدانوں پر عدم اعتماد کا اظہار کیا جن کی جڑیں عوام میں نہیں تھیں۔ وہ تجربے سے یہ جان چکے تھے کہ طاقت کا حقیقی سرچشمہ عوام ہیں۔ وہ عوام کی تائید سے رہنما بننا چاہتے تھے۔ انہوں نے پہلے ہی دن سے کام کاج کا آغاز منظم انداز سے کیا۔ ان کا پہلا ہدف ہندوستان سے انگریزی زبان کا خاتمہ تھا اپنے اس منصوبے کے ذریعے وہ ہندوستان کے انگریزی زدہ دانشوروں کو بے نقاب کرنا چاہتے تھے ان کا خیال تھا کہ اس قسم کے رہنماؤں نے ہندوستان کی روح کو دھندلا دیا ہے اور اب وقت آگیا ہے کہ مغربی اثرات کو دھو کر ہندوستان کی اصل شناخت کو اجاگر کیا جائے۔ یہاں یہ بات دلچسپی بلکہ طنز سے خالی نہیں کہ بعد میں گاندھی جی نے جو عدم تعاون اور سول نافرمانی جیسی تحریکیں شروع کیں ان کا

تصور انہوں نے ممتاز مغربی اور امریکی دانشوروں سے لیا تھا جن میں رسکن، ٹالسٹائی اور تھورو شامل ہیں۔

ہندوستان کے تمام سیاستدانوں میں گاندھی جی گوکھلے کا سب سے زیادہ احترام کرتے تھے۔ گوکھلے ہی کے زبردست اصرار پر وہ جنوبی افریقہ سے ہندوستان واپس آئے تھے۔ اپنی سوانح حیات میں گاندھی جی نے لکھا ہے-----

"میں اسی پرجوش امید کو لے کر ہند واپس لوٹا تھا کہ گوکھلے ہی میں ضم ہو جاؤں"

لیکن یہ ہندوستان اور گاندھی جی دونوں کی بد نصیبی تھی کہ ان کی آمد کے محض چند ہفتے کے بعد ہی گوکھلے فروری ۱۹۱۵ء میں انتقال کر گئے۔ گاندھی جی ٹالسٹائی اور رسکن سے بے حد متاثر تھے اور انقلابی خیالات سے لبریز ہو کر ہندوستان لوٹے تھے۔ گاندھی جی ولولے اور آدرشوں سے اس طرح مملو تھے کہ ان سے خود پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا جب کہ ملکی صورتحال نہایت محتاط طرز عمل کی متقاضی تھی۔ ان حالات میں اگر کوئی گاندھی جی کی صحیح رہنمائی کر سکتا تھا تو وہ صرف گوکھلے تھے۔ اگر گوکھلے کچھ عرصہ مزید جیتے تو گاندھی جی اپنے سیاسی کیریئر کی فاش غلطیاں نہ کرتے۔ شاید گوکھلے، گاندھی اور جناح کے درمیان رابطے اور قربت کا ذریعہ بھی ثابت ہوتے اس صورت میں گوکھلے، گاندھی اور جناح کی طاقتور تکون ہندوستان کی تقدیر بدل سکتی تھی----- مگر یہ ہو نہ سکا! گوکھلے نے پونا میں سرونٹس آف انڈیا (حذام ہند) سوسائٹی قائم کر رکھی تھی جس کے وہ صدر تھے۔ گاندھی جی بھی اس سوسائٹی میں شمولیت کے متمنی تھے لہٰذا وہ ہندوستان آتے ہی پونا چلے گئے اور کچھ دیر وہیں مقیم رہے لیکن گاندھی جی سوسائٹی کے مناسب رکن ثابت نہ ہو سکے کیونکہ سوسائٹی کے نظریات اور طریقہ کار کا گاندھی جی کے افکار سے بالکل فرق تھے۔ کئی مرتبہ سوسائٹی کے دیگر ارکان اور گاندھی جی کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہوئے اور انہیں یوں محسوس ہوا کہ گاندھی جی کی سوسائٹی میں موجودگی اس کے مقاصد کو نقصان

پہنچا سکتی ہے۔ گاندھی جی کی خود نوشت سوانح عمری کے کچھ اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ گوکھلے خود بھی اپنی سوسائٹی کے دیگر ارکان کی رائے سے متفق تھے۔ صفحہ ۸۔ ۴۵۷ پر گاندھی جی لکھتے ہیں۔

"جب میں پونا گیا، گوکھلے اور سوسائٹی کے ارکان نے مجھ پر شفقت اور محبت کی بارش کر دی۔ میں ان سے ہر موضوع پر بے تکلفی سے گفتگو کرتا تھا۔ گوکھلے کی شدید خواہش تھی کہ میں سوسائٹی میں شامل ہو جاؤں لیکن دیگر ارکان کا خیال تھا کہ میرے اور ان کے نظریات اور طریقہ کار میں بعد المشرقین ہے چنانچہ میری سوسائٹی میں شرکت مناسب نہیں ہو گی۔ جب کہ گوکھلے کا خیال تھا کہ میں اپنی کٹر اصول پرستی کے باوجود ان کے نظریات سے مطابقت پیدا کر سکتا ہوں لیکن ان کے دوسرے ساتھی میرے متعلق ان کے برابر پر امید نہ تھے۔ تاہم گوکھلے کا خیال تھا کہ وہ آہستہ آہستہ مجھے قبول کرلیں گے تاہم اگر وہ ایسا فوری طور پر نہ کر پائیں تو مجھے یہ ہرگز نہیں سوچنا چاہئے کہ وہ میری عزت نہیں کر رہے یا انہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔ وہ صرف خطرہ مول لینے سے گھبراتے ہیں۔ بہر طور گوکھلے نے یہ وضاحت کی کہ خواہ میں سوسائٹی کا رسمی رکن بنوں یا نہیں "میرے اور ان کے تعلقات میں کوئی فرق نہیں آئے گا اور وہ مجھے بدستور چاہت اور احترام کی نظر سے دیکھتے رہیں گے"۔

پونا سے گاندھی جی، رابندر ناتھ ٹیگور کے پاس بولپور چلے گئے۔ جہاں وہ شانتی نکیتن میں مقیم تھے لیکن فوراً ہی گوکھلے کا انتقال ہو گیا جس پر گاندھی جی کو الٹے قدموں پونا لوٹنا پڑا۔ ان کی آخری رسومات کی ادائیگی کے بعد گاندھی جی نے سوسائٹی کے ارکان کو قائل کرنا شروع کیا اور اپنے متعلق ان کے خوف کا ازالہ کیا لیکن سوسائٹی کے ارکان کے شبہات دور نہ ہو سکے اور انہوں نے اپنی رکنیت کی عرضی واپس لی۔ گاندھی جی اپنی

خودنوشت سوانح میں لکھتے ہیں۔

"گوکھلے نے میرے لئے ایک آزمائشی عرصہ مقرر کیا جس کے اندر مجھے پورے ہندوستان میں گھومنے پھرنے کی اجازت دی لیکن مجھے عوامی مسائل پر کوئی بھی رائے ظاہر کرنے سے منع کیا۔ گوکھلے میرے خیالات پر ہنسا کرتے تھے ان کا کہنا تھا کہ ایک برس ہندوستان میں رہنے سے تمہارے نظریات خود بخود درست ہو جائیں گے۔"

گاندھی جی کا بے لوث عمل اور ان کی سادہ زندگی اگرچہ گوکھلے کے لئے بے حد متاثر کن تھی لیکن وہ ہندوستان میں ان کی آئندہ سرگرمیوں کے متعلق کچھ ذہنی پریشانی میں مبتلا تھے۔ انہیں خدشہ تھا کہ کہیں گاندھی جی عجلت میں ہندوستان میں انقلاب لانے کی غلطی نہ کر بیٹھیں۔ جے کار اور گوکھلے کی ملاقات موخرالذکر کی وفات سے چند روز قبل پونا میں ہوئی جس میں انہوں نے گاندھی جی کے متعلق تبادلہ خیال کیا۔ گوکھلے نے کہا کہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ گاندھی جی کی شخصیت ہندوستان کے مستقبل میں فیصلہ کن کردار ادا کرلے گی لیکن "میں شاید وہ دن دیکھنے کے لئے زندہ نہ ہوں لیکن میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ ہمارے بعد گاندھی آزادی کی اہم تحریکوں کے ہراول دستے میں شامل ہوں گے۔ اگر عوام کے جذبات کو جگا کر انہیں قربانی کے لئے تیار کرنا ہو تو اس کام کے لئے گاندھی سے کامیاب رہنما کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک آدرش وادی انسان ہیں جن کے اندر غریب آدمی کو توجہ مبذول کرنے کی غیر معمولی اہلیت ہے۔ گاندھی پسماندہ اور کم حیثیت کے انسان سے بہت جلد محبت پیدا کر سکتے ہیں لیکن بعض نازک معاملات ایسے ہوتے ہیں جو بات چیت سے بہتر انداز میں حل ہو سکتے ہیں جہاں جذبات پر قابو پانا' احتیاط' صبر اور تحمل جلد بازی سے اچھے نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ ایسے مواقع کے لئے گاندھی مناسب رہنما نہیں ہیں۔ گاندھی کو اس بات کا احساس نہیں ہے کہ آدھی چپاتی بھی بھوکے رہنے سے بہتر ہے۔ وہ جنوبی افریقہ میں بہت عمدہ خدمات سرانجام دے چکے ہیں۔ انہوں نے ہندوستان کے مختلف طبقات کو قریب لا کر ان میں

حب الوطنی پیدا کی۔ لیکن مجھے خدشہ ہے کہ جب مورخ' تاریخ رقم کرے گا تو گاندھی جی کی کامیابیاں ان کی مقبولیت سے بہت کم ہوں گی۔"

(میری داستان حیات از ایم آر جے کاڑ جلد اول' صفحہ ۳۱۷)

گاندھی جی کا اگلا ہدف اپنے آشرم کے لئے مناسب جگہ تلاش کرنا تھا جہاں وہ اپنے وفادار جنوبی افریقی پیروکاروں کے ساتھ رہ سکیں۔ بالآخر انہوں نے احمد آباد کے قریب سابرمتی میں جگہ پسند کی۔ جس کے متعلق انہوں نے اپنی سوانح حیات کے صفحہ ۴۸۲ پر لکھا ہے۔

"مجھے احمد آباد سے خصوصی محبت رہی ہے۔ گجراتی ہونے کے ناطے میں سوچتا ہوں کہ ملک کی بہترین خدمت گجراتی زبان ہی میں کر سکتا ہوں۔ احمد آباد چرخے پر سوت کاتنے کا پرانا مرکز ہے لہٰذا میرا یہ شدید خواہش تھی کہ اسے گھریلو صنعت کے طور پر دوبارہ زندہ کروں۔ چونکہ گجرات احمد آباد کا دارالحکومت ہے اس لئے یہاں کے متمول شہریوں سے عطیات بھی باآسانی لئے جا سکتے ہیں۔"

جلد ہی گاندھی جی نے دو اخباروں "ینگ انڈیا" اور "نو جیون" کا آغاز کیا۔ انہی اخبارات میں انہوں نے اپنے تمام نظریات کا اعلان کیا جن میں ستیہ گرہ' سردہ ڈایا' عدم تشدد اور سودیشی شامل ہیں۔ سودیشی میں انہوں نے غیر ملکی مصنوعات کے بائیکاٹ کا اعلان کیا جس سے احمد آباد کے سوتی کپڑے کے صنعتکاروں کو بے حد فائدہ پہنچا گجرات کے سرمایہ داروں نے گاندھی جی کی حمایت کا اعلان محض حب الوطنی اور خیرات کے جذبے کے تحت نہیں کیا۔ درحقیقت گاندھی جی ان کے مفادات کے بڑے محافظ تھے جس پر وہ وسیع رقوم انہیں چندے میں دینے سے دل نہیں چراتے تھے۔

کچھ عرصہ بعد انہوں نے بہار کے ایک ضلع میں ستیہ گرہ کی تکنیک کو اپنایا۔ یہ تحریک یورپ کے نیل کے تاجروں کے خلافِ چلائی گئی تھی۔ یہ ہندوستان میں گاندھی جی کی پہلی عوامی جدوجہد تھی۔ اگرچہ اس کا احاطہ وسیع نہ تھا۔ بہار میں گاندھی جی کی ملاقات پہلی

مرتبہ ڈاکٹر راجندر پرشاد سے ہوئی جو بعد ازاں بھارت کے پہلے صدر بنے۔ جب احمد آباد کے صنعتکاروں اور مزدوروں میں تصادم ہوا تو گاندھی جی نے مزدوروں کے حق میں ستیہ گرہ کا مظاہرہ کیا جس سے بالآخر صنعتکاروں نے شکست تسلیم کر لی۔

جونہی احمد آباد کا مسئلہ حل ہوا گاندھی جی نے ایک اور جدوجہد کا آغاز کیا۔ کھیدا ضلع میں قحط پڑنے سے وہاں کے مزارعین نے درخوست کی کہ اس برس ان کا مالیہ معاف کر دیا جائے۔ حکومت کا رویہ اس ضمن میں شدید بے حسی اور ظلم پر مبنی تھا۔ چنانچہ گاندھی جی نے مزارعین کے ہمراہ ستیہ گرہ شروع کر دیا۔ اس مرتبہ گاندھی جی ولبھ بھائی پٹیل سے ملے جنہوں نے گاندھی جی کا پیرو کار بننے کے لئے وکالت کی شاندار پریکٹس ترک کر دی تھی۔ رفتہ رفتہ ہندوستانی عوام گاندھی جی کو تہہ دل سے چاہنے لگے اور گاندھی جی کی جراتمندی میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ فروری ۱۹۱۶ء میں لارڈ ہارڈنگ کو بنارس ہندو یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھنا تھا اس شاندار تقریب میں شرکت کے لئے پورے ہندوستان سے راجوں مہاراجوں اور شہزادوں کو دعوت دی گئی تقریب میں مسز اینی بیسنٹ کو بھی مدعو کیا گیا جو سنٹرل ہندو کالج بنارس کی بانی تھیں اور یونیورسٹی کے قیام میں بھی ان کی کوششیں قابل ستائش تھیں۔ گاندھی جی کو بھی تقریب سے خطاب کے لئے بلایا گیا۔ اس موقع پر خیرہ کن ہیرے جواہرات سے لدے ہوئے راجکمار ڈائس پر تشریف فرما تھے۔ مہاراجہ دھیرج ڈھر بھنگہ نے اجلاس کی صدارت کی۔ گاندھی نے رسمی خطاب انگریزی زبان میں کیا جس کا آغاز کچھ یوں ہوا۔

> "میرے لئے یہ امر نہایت شرم اور توہین کا باعث ہے کہ میں اس مقدس شہر اور عظیم کالج کی زمین پر کھڑا ہو کر ایک ایسی زبان میں بات چیت کر رہا ہوں جو اس ملک کے عوام اور میرے لئے اجنبی ہے----"

(مہاتما از تندولکر' جلد اول' صفحہ ۱۸۰)

یہ سنتے ہی کانگریس کے اعلیٰ تعلیم یافتہ رہنماؤں کو سخت دھچکا پہنچا۔ مجمعے نے ہو کے

عالم میں یہ سب کچھ سنا اور اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ مجمعے کے رد عمل سے گاندھی جی نے مزید ہمت حاصل کی اور ایسی شدید اور سخت باتیں بھی بے دھڑک کہہ دیں جو موقع کی مناسبت سے میل نہیں کھاتی تھیں۔ انہوں نے چمکتے دمکتے شہزادوں کو مخاطب کر کے کہا۔

راجکمارو اٹھو اور ان ہیروں کو بیچ ڈالو۔ جب تک تم ان زیوروں کے بوجھ سے نجات نہیں پاؤ گے تب تک یہ مفلس ملک غربت کی تاریکیوں سے نجات نہیں پائے گا۔ ملکی مفادات کے لئے ان جواہرات کو تج دو۔"

انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مزید کہا

"پولیس کی اس قدر نفری اور وائسرائے کی حفاظت دیکھ کر مجھے حیرت ہو رہی ہے کیا آپ ہندوستان کے عوام سے اس قدر بد ظن ہیں۔ میرے خیال میں وائسرائے کو پورے شہر کو اس قدر پولیس کی موجودگی سے ہراساں کرنے کی نسبت گولی سے اڑ جانا پسند کرنا چاہئے تھا۔"

اس موقع پر مسز بیسنٹ بے چینی محسوس کرنے لگیں کیونکہ یہ تقریب یہ سب باتیں کرنے کے لئے مناسب نہ تھی۔ اس تقریر کا کافی شدید رد عمل ہوا۔ شہزادے اٹھ کر چلے گئے، چیئرمین رخصت ہو گیا اور تقریب بدمزگی پر منتج ہوئی (مہاتما از تندولکر' جلد اول صفحہ ۱۸۴)

اسی شب پولیس نے ایک حکم نامہ جاری کیا جس کے تحت گاندھی جی کو فوری طور پر بنارس سے نکال دینے کی ہدایت کی گئی تھی۔ پنڈت مدن موہن نے پولیس پر بے حد دباؤ ڈالا کہ اس حکم کو واپس لیا جائے لیکن ایسا نہ ہو سکا اور صبح صادق کے وقت گاندھی جی کو بنارس بدر کر دیا گیا۔

باب ششم

جناح اور گاندھی ○ اختلافات کا آغاز (۱۹۱۹ء)

مسز اینی بیسنٹ ۱۸۹۳ء میں ہندستان آئیں جہاں وہ تھیوسوفیکل سوسائٹی کی مستقل رکن بن گئیں۔ مذکورہ سوسائٹی کو ۱۸۸۶ء میں مدراس کے قریب کرنل اولکوٹ اور میڈم بلفاٹسکی نے قائم کیا تھا۔ ہندوستان آنے سے قبل انہوں نے یہاں کے فلسفے' مذہب اور کلچر کا بالتفصیل مطالعہ کیا ان کا دل ہند کے عوام اور قدیم علوم کی محبت سے معمور تھا انہوں نے بنارس میں سنٹرل ہندو کالج قائم کیا جو بعد ازاں بنارس ہندو یونیورسٹی کی شکل اختیار کر گیا۔ جلد ہی ہندو نوجوان اور دانشور ان کے گرویدہ ہو گئے۔ وہ ہندوستان میں محض مذہبی و تعلیمی خدمات انجام دینے کی خواہش مند نہ تھیں بلکہ وہ ہندوستان کے لئے مکمل سیاسی آزادی اور عوام کے یکساں حقوق کی متمنی تھیں۔ ان کی دلی آرزو تھی کہ ہندوستان اور برطانوی دولت مشترکہ کی دیگر اکائیوں میں خودمختار حکومتوں کا قیام عمل میں لایا جائے۔ وہ ہندوستان کے سچے پرستاروں میں سے ایک تھیں جو اس کے لئے جیتی رہیں' دکھ سہتی رہیں اس کے لئے جدوجہد میں ان کی عمر گزر گئی اور اسی کے لئے مر گئیں۔

دم واپسیں کے موقع پر بھی ان کی آخری خواہش یہی تھی کہ ان کی میت کو نذر آتش کر کے راکھ گنگا میں بہا دی جائے ان کی متحرک روح کو کانگریس کا سست رو اور نپا تلا طریقہ کار پسند نہ تھا۔ انہیں ایک طاقتور' مضبوط اور باعمل سیاسی جماعت کی ضرورت شدت سے محسوس ہوئی جس کے تحت انہوں نے ۱۹۱۶ء میں ہوم رول لیگ قائم کی جس کی صدر وہ خود تھیں۔ مسز اینی بیسنٹ کی شاندار قیادت میں ہوم رول موومنٹ کی مقبولیت جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ مدراس میں لارڈ پینٹ لینڈ نے اس تحریک کی طاقت سے خوفزدہ ہو کر مسز بیسنٹ اور ان کے رفقاء جی ایس ارون ڈال اور بی پی واڈیہ کو

گرفتار کر لیا۔ مسز بیسٹ کی گرفتاری پر ہندوؤں اور مسلمانوں نے یکساں طور پر انتہائی شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ جناح نے یہ خبر سنتے ہی ہوم رول لیگ میں بطور صدر شمولیت اختیار کر لی اور ایم آر جے کار اس کے سیکرٹری بن گئے۔

جناح نے ہوم رول لیگ کے صدر کی حیثیت سے اپنے پہلے خطاب میں کہا۔

"میرا مسلمانوں کے نام یہی پیغام ہے کہ وہ اپنے ہندو بھائیوں سے تعاون کریں جب کہ ہندوؤں سے میری درخواست ہے کہ اپنے پسماندہ مسلمان بھائیوں کی فلاح کے لئے کام کریں۔ اسی جذبے سے ہوم رول لیگ کی بنیادیں مستحکم ہو سکتی ہیں۔ اس کام کے لئے ہمیں ہرگز خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔"

بمبئی ایسوسی ایشن کے ایک پر ہجوم اجلاس منعقدہ ۳۰ جولائی ۱۹۱۷ء کو جناح نے کہا۔

"ہم مسز بیسنٹ اور ان کے کارکنوں کی گرفتاری پر اصولی بنیادوں پر احتجاج کرنے کا حق محفوظ رکھتے ہیں کیونکہ یہ اس خودمختار حکومت کے خلاف سازش ہے جس کی سکیم کانگریس اور مسلم لیگ نے لکھنؤ میں تیار کی تھی لیکن ہم اس سکیم پر سختی سے ڈٹے رہیں گے ہم اور جنگ کے خاتمے پر اس پر عمل درآمد کے لئے ہر ممکن کوشش کریں گے۔"

اس دور میں مخلص سماجی اور سیاسی کارکن کے طور پر گاندھی جی کی شہرت عروج پر تھی اور خود جناح نے ہوم رول لیگ کے ایک اجلاس میں ان کا نام لیگ کی صدارت کے لئے تجویز کیا۔ لیکن ہوم رول لیگ کے سیکرٹری جے کار نے اس عہدے کے لئے گاندھی جی کی اہلیت کو شک وشبے کی نظر سے دیکھا۔ انہوں نے اس کی وجوہات بتاتے ہوئے گاندھی جی کو خط میں لکھا۔

"ہم جانتے ہیں کہ جلد ہی آپ ہم سے ہمارے مقاصد و عزائم میں تبدیلی کا مطالبہ کریں گے اور فوراً ہمارے منشور میں اپنے پسندیدہ نظریات داخل کرنے کی کوشش کریں گے جنہیں ہم تخیل کی اختراعات سے زیادہ نہیں گردانتے۔"

(میری داستان حیات از جے کار' جلد اول' صفحہ ۳۱۸)

گاندھی جی نے اس کے جواب میں لکھا۔

"اگرچہ آپ نے میرے نظریات کو تخیل کی اختراع قرار دے کر مجھے شدید ٹھیس پہنچائی ہے اس کے باوجود آپ کے خط کا بیشتر متن مجھے اچھا لگا۔ میں صرف ایک امر کی وضاحت کو ضروری خیال کرتا ہوں وہ یہ کہ اگر میں نے آپ کی جماعت میں شمولیت کا فیصلہ کیا تو میں اپنے ایک نظریے پر اصرار ضرور کروں گا وہ ہے ایک مشترکہ لیگ کا قیام جس کے تمام اصول و ضوابط ہندوستانی روایات کے مطابق ہوں گے اس کے علاوہ آپ کو کسی دوسری چیز سے پریشان یا خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے خیالات آپ پر کبھی مسلط نہیں کروں گا۔"

جے کار نے گاندھی جی کو یوں جواب دیا۔

"آپ کے خط سے ہمارے بہت سے شبہات دور ہو گئے ہیں اور ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ نہ صرف ہوم رول لیگ میں شمولیت اختیار کرلیں بلکہ اس کے سربراہ بھی بن جائیں۔"

گاندھی جی نے یہ دعوت قبول کرلی اور ہوم رول لیگ کا صدر بننے کے بعد انہوں نے منشور جاری کیا جس میں انہوں نے وضاحت کی کہ انہوں نے یہ عہدہ کیوں قبول کیا ہے اور وہ اس منصب کے تحت کیا کیا کام انجام دینا چاہتے ہیں۔

"ایک خالص سیاسی جماعت میں شرکت کر کے زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے اپنے اصولوں سے انحراف کیا ہے لیکن یہ فیصلہ میں نے گہرے غور و خوض اور اپنے احباب کی مشاورت کے بعد کیا ہے۔ بعض دوستوں کا خیال تھا کہ مجھے سیاسی تنظیموں سے دور رہنا چاہئے کیونکہ اس سے میری موقر انفرادیت پر حرف آئے گا مجھے اعتراف ہے کہ اس تنبیہہ نے مجھ پر خاطر خواہ اثرات مرتب کئے لیکن ساتھ ہی مجھے احساس ہوا کہ اگر میں اس تنظیم میں شرکت کرلوں تو اس کے

مقاصد کے ساتھ ساتھ اپنے نظریات کو فروغ دینا بھی ہرگز غلط نہ ہو گا چنانچہ مجھے اس پلیٹ فارم کو "استعمال" کرنا چاہئے۔"

(مہاتما از تندولکر' جلد اول' صفحہ ۲۸۸)

یہ اس تحریری معاہدے کی کھلی خلاف ورزی تھی جو گاندھی جی نے جے کار سے کیا تھا۔ عہدۂ صدارت کا حلف اٹھاتے ہی گاندھی جی نے لیگ کا جنرل اجلاس طلب کیا جس کا مقصد جماعت کا نام اور منشور تبدیل کرنا تھا انہوں نے ہوم رول لیگ کا نیا نام سوراجیہ سبھا تجویز کیا۔ جناح اور چند دوسرے بانی ارکان نے گاندھی جی کی تجاویز سے شدید اختلاف کیا لیکن گاندھی جی نے اجلاس کے چیئرمین کی حیثیت سے تمام اعتراضات رد کر دیئے اور نہایت آمرانہ انداز میں اعلان کیا۔

"ہر رکن کے لئے یہ دروازے کھلے ہیں کہ چاہے تو تاحیات رکن بن جائے اور اگر اسے سبھا کے تبدیل شدہ آئین سے اتفاق نہیں ہے تو فوراً استعفیٰ دے دے۔"

گاندھی جی کے اس غیر جمہوری اور غیر اصولی طرز عمل سے جناح اور بعض دیگر ارکان کو سخت صدمہ پہنچا۔ وہ گاندھی جی کو ہرگز اس امر کا مجاز نہیں سمجھتے تھے کہ وہ لیگ کا نام یا منشور تبدیل کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے احتجاجاً فوری استعفیٰ دے دیئے۔ اس احتجاجی خط پر جناح' جے کار' جمنا اس دوار کا داس' منگل داس پکواس' ناگن داس ماسٹر اور کے۔ ایم منشی نے دستخط کئے۔ اس خط کا متن درج ذیل ہے۔

"لیگ کے زیر دستخطی ارکان اعلان کرتے ہیں کہ مرارجی ہال میں ہونے والے اجلاس میں جو منشور پیش کیا گیا ہے وہ لیگ کے حقیقی مقاصد و عزائم سے براہ راست متصادم ہے۔ لیگ کے آئین میں تبدیلی کا طریقہ کار بھی قواعد و ضوابط کے خلاف ہے۔ زیر دستخطی ارکان بلا ہچکچاہٹ کہتے ہیں کہ آپ (گاندھی جی) کی جانب سے اپنایا گیا لائحہ عمل غیر قانونی' غلط' شخصی اور آمرانہ ہے۔ اس لئے ہم انتہائی افسوس سے فوری طور پر لیگ کی رکنیت اور اپنے موجودہ عہدوں

سے مستعفی ہوتے ہیں۔"

مسز بیسنٹ اور جناح نے تاعمر گاندھی کو ہوم رول لیگ کی تباہی اور اس کے مقاصد کو خاک میں ملانے جیسے ناقابل تلافی جرم پر معاف نہیں کیا۔

(میری داستان حیات" از جے کار' جلد اول صفحہ ۴۰۵)

باب ہفتم

جنگ عظیم اول میں گاندھی جی کا سرگرم کردار

۱۹۱۸ء میں وائسرائے لارڈ چیمس فورڈ نے گاندھی جی کو ایک وار کانفرنس میں مدعو کیا۔ یہ دعوت نامہ کافی سرکاری گفت و شنید کے بعد جاری کیا گیا۔ ۱۷ اپریل کو وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری نے ہوم ممبر کے نام خط میں لکھا۔

"عزت ماب وائسرائے نے مجھے ہدایت کی ہے کہ فوراً آپ کو خط لکھ کر اس معاملے میں آپ کی رائے حاصل کروں کہ آیا گاندھی جی کو وار کانفرنس میں بلانا اور وائسرائے سے ان کی ملاقات سود مند رہے گی یا نہیں یہ اس لئے بھی بہتر محسوس ہوتا ہے کہ کانفرنس میں شرکت سے ان کی بے چین طبیعت کو اظہار کے مفید ذرائع مل جائیں گے جب کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینے سے وہ سرکار کے لئے پریشانی کا باعث بن سکتے ہیں۔ مجھے یہ بھی اطلاع ملی ہے کہ گاندھی جی عراق اور فرانس میں جنگی خدمات انجام دینے کے بے حد متمنی ہیں۔ چنانچہ اگر انہیں کوئی بھی فریضہ سونپ کر فرانس روانہ کر دیا جائے تو ہندوستان میں بہت آرام ہو جائے گا۔

(تندولکر، جلد اول، صفحہ ۲۲۶)

گاندھی جی نے نہ صرف بڑے شوق سے وار کانفرنس میں شرکت کی بلکہ انہوں نے فوجی بھرتی کی مہم میں بھی بے حد جوش و خروش سے حصہ لیا حالانکہ ان کی اس حرکت سے ان کے مداح احباب کو شدید دھچکا پہنچا اور انہوں نے گاندھی جی کو اس سے منع بھی کیا ان حضرات میں رابندر ناتھ ٹیگور، ریورنڈ اینڈریوز اور دیگر ممتاز دانشور شامل تھے۔ گاندھی جی نے نوجوانوں کو فوج میں شمولیت پر اکسانے کے لئے متعدد پمفلٹ شائع کیے۔ ایک پمفلٹ میں وہ لکھتے ہیں۔

"سوراج کو حاصل کرنے کا بہترین طریقہ ایمپائر کے دفاع کو مضبوط بنانا ہے کیونکہ اگر ایمپائر ختم ہو گئی تو ہماری امیدوں اور تمناؤں کا محور بھی ختم ہو جائے گا۔"

(مہاتما از تندولکر' جلد اول صفحہ ۲۲۹)

دنیا بھر میں گاندھی جی امن پسندی اور عدم تشدد کے چیمپئن مانے جاتے تھے لیکن اپنے ایک پمفلٹ میں انہوں نے ایسے خیالات کا اظہار کیا جو ان کے عقائد سے یکسر متصادم تھے۔

"سرکار برطانیہ کے کالے قوانین میں سے ایک آرمز ایکٹ بھی ہے جس کے تحت ہندوستانیوں کو آتشیں اسلحہ رکھنے کی ممانعت ہے لیکن اگر ہم اس آرمز ایکٹ کا خاتمہ اور اسلحہ رکھنے کی آزادی چاہتے ہیں تو یہ اس کے لئے سنہری موقع ہے۔"

مہاتما از تندولکر' جلد اول' صفحہ ۲۳۱)

گاندھی کا جذبہ بھرتی نہایت بے لگام تھا وہ اسے کانگریس کے امور پر بھی ترجیح دینے لگے تھے۔ اس موقع پر کانگریس کا ایک خصوصی اجلاس بمبئی میں ہونا قرار پایا جب کہ ۲۵ اگست ۱۹۱۸ء کو گاندھی جی نے تلک کو لکھا۔

"میں گانگریس کے اجلاس میں شرکت کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا میں اعتدال پسندوں کی کانفرنس میں بھی شریک نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس میرا پختہ یقین ہے کہ ہم بھرتی کا کام کر کے ہندوستان کی زیادہ خدمت کر سکتے ہیں اس طرح لاکھوں عوام کی تائید و حمایت ہمیں حاصل ہو گی-----

گاندھی جی نے کانگریس کے اعتدال پسند ارکان کے ممتاز ترین رکن سریندر ناتھ بنیر جی کو لکھا۔

"میرے بعض نہایت راسخ نظریات سے بہت سے ہمعصر رہنما متفق نہیں ہیں

لیکن میرا آج بھی پختہ یقین یہی ہے کہ اگر ہم اپنی تمام توجہ فوجی بھرتی پر مرکوز کر دیں تو ہمیں مکمل آزادی ایک برس سے بھی کم عرصے میں میسر آ سکتی ہے۔"

(ایضاً" صفحات ۳۳۶ - ۲۳۱)

بعد ازاں انہوں نے گجرات کے تمام دیہات کا دورہ کیا اور ہر گاؤں سے ۲۰ جوان سوراج اور ایمپائر کی خاطر "بلی" (قربانی) کے لئے طلب کئے۔ انہوں نے وائسرائے کو لکھا۔

اگر میں اپنے ہم وطنوں کو اپنے اقدامات واپس لینے کے لئے قائل کر سکوں تو یقیناً میں کانگریس کی تمام قراردادیں بھی منسوخ کروا دوں اور انہیں کہوں کہ جنگ کے دوران خودمختار حکومت کا نام بھی نہ لیں۔ میں اس کڑے وقت میں ہندوستان کے ہر فرزند کو ایمپائر کے لئے کٹ مرنے پر راضی کرنا چاہتا ہوں----"

انہوں نے بھرتی کے غیر مشروط ہونے پر بھی بے حد زور دیا اور کہا کہ مسز اینی بیسنٹ کو بھی نئے ہندوستان کی خاطر غیر مشروط بھرتی کے حق میں اعلان جاری کرنا چاہیئے۔ گاندھی جی نے اپنے جنون میں تلک کی توہین تک سے گریز نہیں کیا۔ تلک نے انہیں پچاس ہزار روپے کا چیک بھیجا اور کہا کہ وہ اس صورت میں مہاراشٹر سے ۵ ہزار رضاکار بھیجنے پر تیار ہیں کہ گاندھی جی وائسرائے سے وعدہ لیں کہ بعد ازاں انہی رضاکاروں کو فوج میں کمیشنڈ رینک دیا جائے گا۔ گاندھی جی نے نہ صرف تلک کا چیک مسترد کر دیا بلکہ یہاں تک کہا کہ وہ رضاکاروں کی بھرتی کے ضمن میں وائسرائے سے کوئی "سودے بازی" نہیں کریں گے۔

وار کانفرنس کے اختتام پر گاندھی جی نے ایک طویل خط وائسرائے کے نام تحریر کیا جس میں انہوں نے کچھ اہم تجاویز پیش کیں جن پر عمل درآمد ان کے خیال میں

ہندوستان کے لئے بے حد فائدہ مند تھا۔ انہوں نے جس موثر اور اعلیٰ انداز میں یہ خط شملہ میں وائسرائے کی خدمت میں پیش کیا وہ ان کی چالباز فطرت کا گہرا عکاس تھا۔ اپنی خودنوشت سوانح میں وہ لکھتے ہیں۔

"خط کو شملہ بھیجنا تھا جہاں وائسرائے کانفرنس ختم ہوتے ہی تشریف لے گئے تھے۔ یہ خط میرے لئے بے حد اہمیت کا حامل تھا اور اسے ڈاک میں بھیجنے سے تاخیر کا احتمال تھا۔ میں وقت کی بچت کا خواہاں تو ضرور تھا لیکن کوئی نامہ بر بھی میرے معیار پر پورا نہیں اتر رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اسے کسی بے حد باکردار اور بھروسے کے آدمی کے ذریعے وائسرائے کے گھر بھیجوں۔ دینا بندھو اینڈریوز اور پرنسپل رودز نے کیمبرج مشن کے ریورنڈ آئرلینڈ کا نام تجویز کیا جو میں نے منظور کر لیا اور اس طرح ایک نیک سرشت انسان میرا پیام لے کر وائسرائے تک گیا۔"

اس خط کا ایک اقتباس قارئین کے لئے بے حد دلچسپ ہو گا۔

"میرا پختہ خیال ہے کہ ہمیں ہر موزوں فرد کو ایمپائر کی خدمت اور حفاظت کے لئے پیش کرنا چاہئے لیکن میں مالی امداد کے متعلق اس قدر پرامید نہیں ہوں۔ مالی ذرائع سے ملنے والی اطلاعات سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان پہلے ہی شاہی خزانے کو اپنی بساط سے بڑھ کر پر کر چکا ہے۔"

(خودنوشت' صفحہ ۵۴۸)

مندرجہ بالا صفحات سے ظاہر ہوتا ہے کہ گاندھی جی ملک کے ہر شہری کو بلا تخصیص توپ کے دھانے میں جھونکنے کے لئے تیار تھے اور ان پر اس سلسلے میں ضمیر کا کوئی بوجھ یا دباؤ نہ تھا لیکن پیسے دھیلے کے معاملے میں وہ حد سے زیادہ محتاط اور کنجوس تھے۔ ان کے خیال میں سرمائے کی وقعت انسانی جان سے زیادہ تھی۔ جانوں کا ضیاع ان کے لئے قابل قبول تھا لیکن پیسے کا نہیں۔ گاندھی جی کے ان خیالات کو ان کی عدم تشدد کی پالیسیوں کے

تناظر میں رکھ کر دیکھا جائے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

گاندھی جی نے اپنے مخلص بہی خواہوں کی مشاورت کے باوجود بھرتی کا دھندہ جاری رکھا لیکن بعد میں انہوں نے اپنی اس پالیسی کے متعلق معذرت خواہانہ رویہ اپنا لیا۔ کچھ عرصے بعد وہ یہ کہتے ہوئے پائے گئے "کچھ ملی جلی وجوہات کی بناء پر میں نے جنگ کی حمایت شروع کی تھی۔ مجھے دو وجوہ یاد ہیں۔ بطور فرد تو میں جنگ کے ہمیشہ خلاف رہا ہوں لیکن بھلا میری کیا حیثیت تھی کہ اس وقت عدم تشدد کا پرچار کرتا۔ میں تو آج تک جانوروں کی وحشیانہ قربانی رکوانے کے لئے کچھ نہیں کر سکا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ سوراج کے قیام کے لئے یہ ایمپائر کو مجبور کرنے کا بہترین موقع تھا۔۔۔۔"

(گاندھی از ہارن مکرجی، صفحہ ۴۳)

انہوں نے کئی مرتبہ بالواسطہ طور پر اعتراف کیا کہ وہ سیاسی طور پر مزید نمایاں ہونے کے لئے بھرتی کے حامی بنے ان کے اس اعتراف کے پس منظر میں وائسرائے کے نام خط بھیجنے کے لئے پاکباز قاصد تلاش کرنے کی خواہش نہایت بے معنی معلوم ہوتی ہے۔

باب ہشتم

سانحہ جلیانوالہ باغ (۱۹۱۹ء) اور اس کے بعد

۱۹۱۷ء کے اختتام پر سرکار ہند نے ایک عدالتی کمیٹی قائم کی جس میں کنگز بینچ کی نمائندگی مسٹر جسٹس رولٹ نے کی وہ اس کمیٹی کے سربراہ بھی تھے جب کہ ہندوستان کے دو جج مسٹر جسٹس کمار سوامی شاستری اور سر پر دواش چندر متر بطور جیورسٹ اس میں شامل کئے گئے۔ ان دونوں حضرات کا تعلق علی الترتیب مدراس اور کلکتہ ہائی کورٹ سے تھا۔ اس کمیٹی کا مقصد درج ذیل ہے۔

"ہندوستان میں انقلابی تحریک کی آڑ میں مجرمانہ سازشوں کو بے نقاب کرنا اور ان مشکلات کا جائزہ لینا جو ایسی منفی سرگرمیوں سے پیدا ہو رہی ہیں۔ ان جرائم کو کچلنے کے لئے قانون ساز اداروں اور حکومت کی مدد کرنا۔"

اس کمیٹی نے اپنی سفارشات ۱۵ اپریل ۱۹۱۸ء کو پیش کیں۔ رپورٹ کو عوامی رائے کے حصول کے لئے اخبارات میں شائع کیا گیا بعد میں ہندوستان کی مجلس قانون ساز میں رولٹ بل کے نام سے دو بل پیش کئے گئے۔ ایک بل عارضی قانون سازی کے لئے تھا جس کا تعلق ہندوستان میں اسلحہ ایکٹ کی تاریخ اختتام سے تھا لیکن دوسرا بل کافی سخت قانون سازی کے لئے پیش کیا گیا جس کا مقصد ہندوستان کے تعزیری قوانین میں مستقل اور کڑی تبدیلیاں کرنا تھا۔ ہر مجلس قانون ساز میں ہندوستانی رہنماؤں نے اس بل پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا کانگریس نے اس بنیاد پر اس بل کی مذمت کی کہ اس کی وجہ سے ہندوستانی عوام کے بنیادی حقوق پر زد پڑے گی اور رائے عامہ کے صحت مند فروغ کی راہ مسدود ہو جائے گی ان کی رائے میں یہ قوانین حالیہ آئینی اصلاحات کے لئے بھی زہر قاتل تھے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ کسی بھی معزز رکن نے مخالفت کرتے ہوئے آئینی حدود عبور نہیں کیں یہی وجہ ہے کہ مجلس قانون ساز سے سرولیم ولسنٹ نے تعزیری

قوانین کا ترمیمی بل واپس لے لیا۔

گاندھی جی اس موقع پر بھی عوام کو نقصان پہنچانے سے باز نہیں رہے انہوں نے فوراً دھمکی دے دی کہ اگر رولٹ بل منظور کیا گیا تو وہ ستیہ گرہ یا سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دیں گے۔ جونہی گاندھی جی نے ایسے غیر ذمہ دارانہ بیانات کا سلسلہ شروع کیا مسز بیسنٹ نے انہیں آگ سے کھیلنے سے منع کیا حالانکہ وہ خود بھی رولٹ بل کے سخت نقادوں میں سے تھیں مسز بیسنٹ ہندوستانی عوام کی جذباتیت اور عمومی نفسیات سے اچھی طرح آگاہ تھیں اس لئے انہوں نے گاندھی جی کو بروقت خبردار کیا کہ اگر انہوں نے سول نافرمانی جیسی تحریکوں کا آغاز کیا تو اس سے صرف قانون شکن اور شرپسند عناصر کو شہہ ملے گی اور لازماً تخریب کاری کا نتیجہ عوام کے حقوق کے عین برعکس ہو گا ایک غیر ملکی نے اس موقع پر کیا خوب کہا ہے۔

"آپ کو ہندوستان میں زیادہ عرصے تک ہرگز قیام نہیں کرنا چاہئے۔ یہاں کے بھانت بھانت کے عوام میں اگر کوئی چیز مشترک ہے تو وہ صرف سیاسی رواداری کا شدید فقدان ہے۔ دنیا کے کسی بھی حصے میں مجمع یا ہجوم اس قدر جلد اور اس قدر وحشیانہ انداز میں تخریب کاری اور تشدد پر آمادہ نہیں ہوتا جتنا کہ اس ملک میں"

(برطانوی راج کے آخری ایام از ایل موزے، صفحہ ۱۱)

لیکن گاندھی جی حالات و واقعات سے کچھ سیکھنے پر تیار نہ تھے وہ اپنے جنوبی افریقہ کے تجربات ہندوستان میں دہرا کر ان کی افادیت اور قوت کا اندازہ کرنا بلکہ کروانا چاہتے تھے۔ لہٰذا مسز بیسنٹ اور دیگر لبرل سیاسی رہنماؤں کی بار بار تنبیہات کے باوجود گاندھی جی سول نافرمانی اور ستیہ گرہ سے باز نہ رہ سکے۔ گاندھی جی نے کانگریس کو اعتماد میں لئے بغیر خود ہی سابرمتی میں اپنے کارندوں کو اکٹھا کیا اور ۶ اپریل کو کل ہند ہڑتال کا اعلان کر دیا جس پر عوام نے بھرپور لبیک کہا لیکن گاندھی جی کی رسمی اپیل کے باوجود تشدد نہ رک سکا۔ سرکار

نے ہر ایسے مقام پر عوام کا خیر مقدم گولیوں سے کیا۔ امرتسر میں حالات حد سے زیادہ بگڑ گئے لیکن ان کے لئے گاندھی جی کے ساتھ ساتھ پنجاب سرکار بھی ذمہ دار تھی۔ ۹ اپریل کو یوم رام نوامی تک امرتسر میں ہر چیز پرامن تھی اگرچہ یہ ایک مذہبی تہوار تھا لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں نے اسے یکساں مسرت سے اکٹھے منایا لیکن اسی دن پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اوڈائر نے دو مقبول رہنماؤں کو شہربدر کرنے کا حکم جاری کیا ان میں ڈاکٹر میتہ پال اور ڈاکٹر کچلو علی الترتیب ہندو اور مسلمان تھے۔ جونہی عوام نے یہ سنا کہ ان کے لیڈروں کو نامعلوم مقامات پر لے جایا جا رہا ہے انہوں نے گروہ در گروہ ڈپٹی کمشنر کے بنگلے کی جانب بڑھنا شروع کر دیا۔ ڈیوٹی پر متعین حفاظتی دستوں نے انہیں روکا جس پر دونوں کے درمیان خونریز تصادم ہوا۔ حفاظتی دستوں نے گولی چلا دی جس سے ۱۳ افراد جاں بحق اور متعدد زخمی ہو گئے۔ مجمعے نے ہلاک شدگان کی لاشیں اٹھا کر شہر میں ماتمی جلوس نکالا اور راستے میں نیشنل بنک کی عمارت کو آگ لگانے کے ساتھ ساتھ اس کے یورپی مینجر کو ہلاک کر دیا۔ پورے دن میں مشتعل ہجوم نے پانچ انگریزوں کو مارنے کے علاوہ ریلوے گوداموں اور دیگر کئی سرکاری عمارتوں کو نذر آتش کر دیا۔ مندرجہ بالا واقعات کا تذکرہ پٹہ بھائی سیتا رمیا نے اپنی کتاب "کانگریس کی تاریخ" کی جلد اول کے صفحہ نمبر ۱۶۳ پر کیا ہے۔

ان حالات کے پیش نظر امرتسر میں مارشل لاء لگا دیا گیا اور جنرل ڈائر کو مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا گیا اپنے عہدے کا چارج لینے کے بعد جنرل ڈائر نے شہر بھر میں جلسوں اور جلوسوں پر پابندی لگا دی اگرچہ مارشل لاء کی درست تاریخ کا علم نہیں ہو سکا لیکن یہ امر حتمی طور پر صحیح ہے کہ جنرل ڈائر نے اپنے فرائض ۱۰ اپریل کو سنبھالے اور مذکورہ پابندی اس نے ۱۱ تاریخ کو عائد کی۔ ۱۳ اپریل کو ہندوؤں کا سال نو کا تہوار منایا جاتا ہے اس موقعے پر ایک جلسۂ عام کا اہتمام جلیانوالہ باغ میں کیا گیا۔ جلیانوالہ باغ چاروں جانب سے بلند دیواروں سے گھرا ہوا ایک میدان تھا جس میں آنے جانے کے لئے صرف ایک ہی

دروازہ تھا۔ جب جنرل ڈائر کو خبر ہوئی کہ اس کے احکامات کے باوجود جلسۂ عام کا انعقاد ہو رہا ہے تو وہ فوج کی پوری بٹالین لے کر وہاں پہنچ گیا اور خبردار کئے بغیر عوام پر اندھا دھند گولیاں چلانے کا حکم دے دیا۔ اس المناک واقعے میں ۵۰۰ سے زائد افراد ہلاک اور ۱۰۰۰ سے زیادہ شدید زخمی ہوئے۔ زخمیوں کو تڑپنے کے لئے رات بھر وہیں پڑے رہنے دیا گیا۔ طبی امداد تو درکنار پینے کے لئے دو گھونٹ پانی بھی نہیں دیا گیا۔ انسانی تاریخ نے ظلم اور جبر کا ایسا گھناؤنا مکروہ اور بیچ واقعہ کبھی نہیں دیکھا۔ بعد ازاں جنرل ڈائر نے نہایت دیدہ دلیری سے انکوائری کمیٹی کے سامنے اس قتل عام کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ اس نے جو کچھ کیا سوچ سمجھ کر کیا اور صحیح کیا۔ ہنٹر کمیٹی کے روبرو جنرل ڈائر نے کہا "اس واقعے کا مقصد فوجی نقطہ نگاہ سے محض امرتسر ہی کے نہیں بلکہ پنجاب بھر کے عوام کو سبق سکھانا تھا۔" کانگریس نے الگ سے بھی انکوائری کمیٹی قائم کی۔ اس کی تفتیش سے فوجی حکام کے بہت سے دوسرے مظالم اور بھیانک جرائم بھی منظر عام پر آئے۔

اس موقعے پر جس بدترین انداز میں ایک انگریز عورت کی آبرو ریزی کی گئی اس سے خود ہندوستان کے مقدمے کو زک پہنچی اور انگریزوں میں مزید تشدد بھڑک اٹھا۔ اس مقام پر مزید سپاہی متعین کئے گئے اور یہاں سے گزرنے والے ہر ہندوستانی کو نہایت غیر انسانی انداز میں رینگنے اور پیٹ کے بل چلنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ ابتداً حکومت نے ان سب واقعات پر کسی تاسف کا اظہار نہیں کیا۔ حکومت نے گاندھی جی اور ان کی خاموش مزاحمت پر تمام الزام عائد کرتے ہوئے انہیں تمام سانحوں کا براہ راست ذمہ دار قرار دیا۔ گاندھی کو سخت وارننگ دی گئی کہ وہ اپنی تمام سرگرمیاں فوری طور پر بند کریں۔ سرکاری تنبیہہ موصول ہوتے ہی گاندھی جی نے بالکل بھگوڑوں کا سا مظاہرہ کیا اور سخت شرمناک انداز میں فی الفور ہتھیار ڈال دیئے۔ ۲۱ جولائی ۱۹۱۹ء کو گاندھی جی نے ایک اخباری بیان میں کہا۔

"سرکار نے مجھے خبردار کیا ہے کہ سول نافرمانی کے نتیجے میں عوام کو شدید

مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا چنانچہ اس تنبیہہ اور کچھ رہنماؤں کی تاکید سے میں اپنی تحریک کو کچھ عرصے کے لئے موخر کرتا ہوں۔ ان حضرات میں دیوان بہادر ایل اے، گووندا رگھوایر، سرنارائن چندا ورکر اور متعدد اخبارات کے مدیر شامل ہیں۔ (اس کے بعد گاندھی جی نے مارشل لاء کے توہین آمیز ریمارکس کو نہ صرف غلامانہ انداز میں قبول کر لیا بلکہ پنجاب میں بے چینی پر انکوائری کمیٹی کے قیام کے سرکاری وعدے پر حکومت کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا) میں نے گہرے غور و خوض کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ حکومت کی اس قدر شفقت اور پر درد ممانعت کے باوجود میری طرف سے تحریک کا جاری رکھنا غیر دانشمندانہ ہو گا۔ درحقیقت میری طرف سے سرکاری ہدایت کا قبول کرنا ہی میری مزاحمت کی نوعیت کا عکاس ہے۔ میری قسم کا رہنما کبھی بھی حکومت کو پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھتا-----"

یہاں جو پہلا سوال فوری طور پر قاری کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ اگر گاندھی جی جیسا رہنما اپنی مزاحمت یا سول نافرمانی سے حکومت کو ناراض اور پریشان نہیں کرنا چاہتا تو پھر وہ کیا کرنا چاہتا ہے؟ ناخواندہ عوام کے جذبات کو مشتعل کر کے وہ کون سے مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے؟ سرکار کی ذلتِ آمیز تنبیہہ کو مان لینے والا اینی بیسنٹ اور لبرل رہنماؤں کے باعزت مشورے قبول کیوں نہیں کرتا؟

اس دور کے نامور صحافی سری وائی چنتامنی نے گاندھی جی کی اس حرکت پر درج ذیل الفاظ میں تنقید کی۔

"رولٹ بل کی منظوری نے گاندھی جی کو منظر عام پر نمایاں کیا۔ گاندھی جی نے اپنے فرسودہ فلسفے کا یہاں بھی سہارہ لیا۔ اس کی مدد سے وہ جنوبی افریقہ اور گجرات اور بہار کے دو قصبات میں چھوٹے پیمانے پر کامیابی حاصل کر چکے تھے چنانچہ اس سے غلط اندازے لگا کر انہوں نے رولٹ ایکٹ کے خلاف بھی ستیہ

گرہ کا آغاز کر دیا۔ حالانکہ انہیں بار بار متنبہ کیا گیا تھا کہ ملک میں انگریز کے خلاف جذبات پہلے ہی بہت بھڑکے ہوئے ہیں لہٰذا محض اپنی مقبولیت کا اندازہ کرنے کے لئے وہ عوام کو تشدد کی تحریک نہ دیں کیونکہ اس صورت میں خونریزی کی لہر کو روکنا مشکل ہو جائے گا لیکن انہوں نے ہر اعتراض کو پس پشت ڈال کر اپنے عزائم کو عملی جامہ پہنایا جس کے نتائج ماہرین کے خدشات سے بھی کہیں بدتر شکل میں ظاہر ہوئے۔"

(ہند کی تاریخ بعد از غدر، صفحہ ۱۴۷)

جلیانوالہ باغ کے بعد بھی پنجاب کے سول اور فوجی حکام نے امن و امان اور قانون کے نام پر عوام پر بدترین مظالم کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۱۹۱۹ء کے آخر میں انڈین نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس امرتسر میں ہوا جس کی صدارت پنڈت موتی لال نہرو نے کی۔ کانگریس کے اجلاس کے باقاعدہ آغاز سے صرف دو روز قبل ۲۴ دسمبر کو نئی اصلاحات کا اعلان کیا گیا۔ ان اصلاحات کے بانیوں میں ای ایس موٹیگ بھی تھے جو امور خارجہ برائے ہند کے وزیر تھے۔ اصلاحات کا مسودہ بہت ہی عمدہ الفاظ میں تیار کیا گیا تھا۔ اس کا ایک مقصد پنجاب میں کی جائے والی زیادتیوں کا ازالہ کرنا اور عوام کے بھڑکے ہوئے جذبات کو ٹھنڈا کرنا تھا۔ اصلاحات کا خاطر خواہ اثر ہوا اور انہیں تمام ہندوستانی رہنماؤں نے خوشدلی سے قبول کیا جن میں تلک اور گاندھی جی بھی شامل تھے۔ تلک نے تاج برطانیہ کے سچے وفادار ہونے کے ناطے عزت ماب کو مبارکباد کا تار بھی بھیجا۔ گاندھی جی نے اعلان کیا کہ شاہی فرامین نے ہندوستان میں ایک نئے دور کا آغاز کیا ہے اور ہندوستانی عوام کو تاج کے نیک جذبات پر گہرے جوش و ولولے کا اظہار کرنا چاہیے۔ کانگریس نے بھی اصلاحات کو کھلے دل سے سراہا کانگریس کے کھلے اجلاس میں گاندھی جی نے خود ایک قرار داد پیش کی جس میں انہوں نے موٹیگ کو خراج تحسین پیش کیا اور کہا کہ ہندوستانی عوام نے ان اصلاحات کو بڑی گرمجوشی سے قبول کیا ہے اگرچہ ان میں کچھ خامیاں موجود ہیں لیکن اس

کے باوجود ہم ان اصلاحات کو ہندوستان میں ایک ذمہ دار اور خود مختار حکومت کے قیام کا پیش خیمہ خیال کرتے ہیں۔ جناح نے بھی قرار داد کی حمایت کا اعلان کیا۔

متعدد ماہرین کا خیال ہے کہ کانگریس میں گاندھی کی حقیقی اور رسمی شرکت کا آغاز اجلاس امرتسر ہی سے ہوا لیکن وہ خود اس سے متفق نہ تھے۔ ان کے اپنے الفاظ میں۔

"میں اس بات میں کوئی وزن نہیں پاتا کہ اجلاس امرتسر سے کانگریس میں میری حقیقی شمولیت کی ابتداء ہوئی۔ اگرچہ میں ہر سال کانگریس کے اجلاس میں باقاعدگی سے شرکت کرتا تھا لیکن مجھے اس جماعت سے دلی وابستگی کبھی محسوس نہیں ہوئی میں محض ہر برس اپنی رکنیت کی تجدید کے لئے وہاں جاتا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ اس میں میرے لئے کوئی خصوصی کام نہیں ہے۔"

اگرچہ برطانوی دارالامراء میں ہند مخالف جذبات بہت زیادہ تھے لیکن حکومت برطانیہ کو پنجاب میں اپنی زیادتیوں کا احساس تھا اور وہ اس کا ازالہ کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے شاہی فرامین کو اتنے عمدہ الفاظ میں تیار کیا گیا کہ ان سے ملک میں امن و اعتماد کی فضا بحال ہو سکے۔ ان میں نہ صرف ہندوستان کو مکمل خود مختار حکومت کے سبز باغ دکھائے گئے تھے بلکہ تاجدار کی جانب سے ذاتی اپیل بھی کی گئی کہ "عوام اود سرکار برطانیہ کے اہلکار ایک دوسرے کا احترام کریں---- اور ہم آہنگی اور محبت سے کام کریں۔ سرکاری افسر عوام سے ہر ممکن تعاون کریں تاکہ عوامی نمائندگی اپنی منزل یعنی آزاد اداروں تک پہنچ سکے۔" تاجدار برطانیہ نے مزید کہا۔

"میری شدید خواہش ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے میرے عوام اور میرے سرکاری اہلکاروں کے درمیان تلخی اور رنجشوں میں کمی واقع ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ اگلے برس میں اپنے عزیز بیٹے کو ہندوستان بھیجوں تاکہ وہ یہاں پر نیا چیمبر آف پرنسز قائم کرنے کے علاوہ برطانوی ہند کے لئے نئے آئین کا اعلان بھی کرے۔ میں چاہتا ہوں کہ جب وہ یہاں آئے تو ہند میں باہمی اعتماد اور

خوشگوار تعلقات کی فضا بحال ہو چکی ہو۔ ہندوستان کے عوام اور سرکاری اہلکاروں کو اپنے مراسم از سر نو بہتر بنانے چاہئیں کیونکہ انہی پر ملک کے مستقبل کا انحصار ہے۔"

ہندوستان کے سیاستدان تاجدار کی اس اپیل سے کس قدر متاثر ہوئے اس کا اندازہ ان تقریروں سے کیا جا سکتا ہے جو گاندھی جی اور جناح نے کانگریس کے اس اجلاس میں کیں جو آئینی اصلاحات کے اعلان کے دو روزہ بعد شروع ہوا۔ گاندھی جی نے اپنے تمام انقلابی اور شعلہ صفت اعلانات واپس لیتے ہوئے ایک نہایت وفادارانہ تقریر کی جس کے لفظ لفظ سے بندگی ٹپکتی تھی۔ وہ فرماتے ہیں۔

"دست تعاون کو گرمجوشی سے تھام لینا' ہندوستان کے کلچر اور مزاج کا حصہ ہے۔ بادشاہ سلامت نے جس خلوص سے ہماری جانب ہاتھ بڑھاتا ہے ہم بھی اسی ولولے سے اس کی جانب پیش رفت کریں گے۔ جناب مونٹیگ اور بیورو کریسی کے تمام ارکان مطمئن رہیں ہمیں ان پر پورا پورا بھروسہ ہے-----" جناح نے گاندھی جی کی قرارداد کی تائید کی۔ ان کی حمایت نیک نیتی اور خلوص دل پر مبنی تھی۔ انہوں نے نہایت تند الفاظ میں ان لوگوں کو جواب دیا جنہوں نے گاندھی جی کی قرارداد کی مخالفت کی تھی۔ جناح نے کہا

"میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ ان اصلاحات کی مخالفت کریں گے جو آپ کو جلد از جلد ایک مکمل خود مختار حکومت کی ضمانت دے رہی ہیں؟ (مجمعے کی جانب سے نہیں نہیں کی آوازیں بلند ہوئیں) مہاتما گاندھی بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں کہہ رہے ہیں ریفارمز ایکٹ کو تہہ دل سے قبول کرنا چاہیئے۔ یہ بات جماعت کے ایوان سے بھی بارہا دہرائی جا چکی ہے۔"

یہاں یہ امر خالی از دلچسپی نہ ہو گا کہ مندرجہ بالا خطاب میں جناح نے گاندھی جی کا

تذکرہ ''مہاتما'' کہہ کر کیا جس سے ان کے دل میں گاندھی جی کی عزت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے علاوہ تحریک خلافت اور جمعیت العلماء ہند نے بھی اپنے اپنے اجلاس امرتسر ہی میں منعقد کئے۔ مسلم لیگ نے بھی کانگریس ہی کے خطوط پر اصلاحات کی حمایت کا اعلان کیا۔

۱۹۱۹ء کے دسمبر میں کانگریس کے اجلاس میں یوں محسوس ہوتا تھا کہ پوری قوم اور رہنما سب کچھ بھلا دینے اور معاف کرنے کے لئے تیار ہیں اور ۱۹۲۰ء سے امن، ترقی اور خوشحالی کا ایسا دور شروع ہونے والا ہے جس میں نفرت یا بغض و عناد کا شائبہ تک نہیں ہو گا۔ اس بات کے امکانات بھی روشن ہوئے کہ اصلاحات پر نہایت فراخدلی سے عمل کیا جائے گا کیونکہ کسی اور نے نہیں بلکہ تاجدار برطانیہ نے خود ہندوستان کو خود مختار حکومت کی یقین دہانی کروائی تھی۔ گاندھی، تلک اور جناح کے علاوہ دیگر ہندوستانی رہنما بھی تعاون کرنے کے خواہاں تھے۔ ایسے حالات میں کوئی خواب بین بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ اس موقع پر کوئی عدم تعاون یا سول نافرمانی جیسی تحریک شروع کرنے کی حماقت کر سکتا ہے لیکن لارڈ کیننگ کے الفاظ میں ایک انسانی ہاتھ سے بھی چھوٹا بادل تحریک خلافت کی صورت میں افق پر نمودار ہوا۔ اس تحریک کا ہندوستان اور اس کے مسائل سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں تھا لیکن گاندھی جی اپنی نرالی منطق کے تحت اس میں بھی کود پڑے۔ گاندھی جی کی اس حرکت سے ہندوستان پر مصائب کے ایسے پہاڑ ٹوٹے جن کے اثرات سے وہ آج بھی نکل نہیں پایا اور جن کے دور ہونے کے مستقبل قریب میں کوئی امکانات نہیں ہیں۔

باب نہم

تحریک خلافت میں گاندھی جی کی شمولیت ○ ہندوستان میں گاندھی جی کے دور کا آغاز (۱۹۲۰ء)

۱۹۲۰ء کی تحریکِ خلافت میں گاندھی جی کی شمولیت ہندوستان کی تاریخ کا نہایت اہم واقعہ ہے۔ اس واقعے سے ہندوستان میں ان کے بے حد موثر کردار کا آغاز ہوا اور ہندوستان کی تاریخ میں گاندھی جی کے دور کی ابتداء ہوئی۔ ہند میں دورِ جدید کے حقیقی بانی راجہ رام موہن رائے تھے جنھوں نے اس سرزمین پر انگریزی تعلیم کا دروازہ کھولا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوری طور پر پیدا ہونے والی ہندوستانی قیادت میں وہ رہنما شامل تھے جن کی تربیت مغربی خطوط پر ہوئی تھی اور وہ مغرب کے سیاسی نظریات اور لبرل ازم کے قائل تھے۔ دادا بھائی نوروجی' سرفیروز شاہ مہتہ' مادھو گووند رانا دے' گوپال کرشن گوکھلے' سریندر ناتھ بنیرجی اور دیگر رہنماؤں نے راجہ رام موہن رائے کے نقوش پا پر قدم رکھا۔ اب گاندھی جی سیاسی منظرنامے پر یہ پیام لے کر نمایاں ہوئے کہ گزشتہ کئی عشروں سے ہندوستان کی قیادت غلط راہ پر چل رہی ہے اور اب وقت آگیا ہے کہ اس کا قبلہ درست کیا جائے۔ ان کے مطابق ہندوستان کی نجات ان سب علوم کو بھلا دینے میں مضمر تھی جو اب تک اس نے تحصیل کئے تھے۔ نتیجتاً ہندوستان کی سیاست نے ایک نیا رخ اختیار کیا' اس پر ۱۹۴۷ء تک گاندھی جی کا رنگ غالب رہا۔ جس سے ملک کی تقدیر پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گاندھی جی ان چند ذہین ترین انسانوں میں سے ایک تھے جنہیں دنیا نے آج تک تخلیق کیا ہے۔ وہ بہت بلند خیالات کے مالک تھے لیکن ان کی شخصیت تناقضات اور تضادات سے پر تھی جنہیں دیکھتے ہوئے ان کی نفسیات کو سمجھنا اور

ان کے حقیقی کردار کو جانچنا بے حد مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ ہمیں مستقلاً عدم تشدد اور امن پسندی کی تبلیغ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن ساتھ ہی ہم نے انہیں جنگ عظیم اول میں انگریزوں کے لئے فوجی بھرتی کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ انہوں نے جناح کی سرگرمیوں میں کبھی دلچسپی نہیں لی جو ان کے اپنے وطن میں ہندو مسلم اتحاد کے زبردست شیدائی تھے لیکن انہیں دور دراز ترکی میں خلافت کی بقا سے اس قدر محبت ہو گئی کہ وہ علی برادران کی تحریک کے سب سے بڑے حامی ثابت ہوئے ترکی کے مسلمان انہیں ہندوستان کے مسلمانوں سے عزیز ٹھہرے نفسیات میں بی ہیویراسٹ سکول کا کہنا ہے کہ کسی بھی شخص کے کردار کی صحیح شناخت اس کا عمل ہے نہ کہ اس کے بلند و بالا خیالات گاندھی جی کے حقیقی کردار کو سمجھنے میں تحریک خلافت سے بڑھ کر کوئی چیز مددگار ثابت نہیں ہو سکتی اس میں شمولیت سے پتہ چلتا ہے کہ گاندھی جی کی زندگی کا اصل مقصد کیا تھا جسے وہ مشن کا نام دیتے تھے وہ جنوری ۱۹۱۵ء میں ہندوستان واپس لوٹے اور ۱۹۱۹ء تک ان کا رویہ کانگریس اور جناح کے تئیں نیم دلانہ تھا انہوں نے فرقہ وارانہ یگانگت کے لئے جناح کی کوششوں کو بھی کبھی نہیں سراہا۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۹ء تک وہ چھوٹی چھوٹی جگہوں پر ستیہ گرہ کا کھیل کھیلتے رہے۔ حتی کہ جلیانوالہ جیسے ہولناک سانحے پر بھی انہوں نے گہرے ضبط اور اعتدال پسندی کا مظاہرہ کیا لیکن تحریک خلافت شروع ہوتے ہی ان کے مزاج کا رنگ یکسر بدل گیا۔ ان میں گھوڑے جیسی پھرتی' تیزی اور چستی پیدا ہو گئی اور وہ اپنی پوری توانائی کے ساتھ میدان جنگ میں کود پڑے۔ یہاں کئی سوال ایک ساتھ پیدا ہوتے ہیں مثلاً وہ جناح سے اس قدر لاتعلق کیوں تھے اور انہوں نے مولانا آزاد اور علی برادران کے لئے اتنی گرمجوشی کیوں ظاہر کی؟ وہ جلیانوالہ کے قتل عام اور پنجاب میں ہونے والے بدترین مظالم پر خاموش رہے لیکن خلافت عثمانیہ کا غم کھانے والوں میں پیش پیش ثابت ہوئے جس کا ہندوستان کے معروضی حالات اور عوام سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ ان سوالوں کا تجزیہ کرنے سے گاندھی کے حقیقی کردار کا تعین ممکن ہے لیکن اس مقصد کے لئے ہمیں تحریک خلافت

اور اس کے پس منظر کا بمنظرِ غائر جائزہ لینا ہو گا۔ پیغمبر ﷺ اسلام نے سب سے پہلے عرب اور اس کے ملحقہ علاقوں میں اسلامی سلطنت قائم کی تھی۔ اسلامی تعلیمات اور جہاد کے زیر اثر اسلامی سلطنت کی جغرافیائی حدود بے حد وسیع ہو گئیں۔ اس سلطنت کا انتظام و انصرام خلیفہ کی ذمہ داری قرار دی گئی۔ خلیفہ پوری اسلامی ریاست کا محافظ اور روحانی سربراہ مانا جاتا تھا۔ پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد خلافت مختلف خاندانوں میں گھومتی رہی۔ پیغمبر ﷺ اسلام کے اپنے خاندان کے علاوہ عرب کے بارسوخ امویوں نے ایک صدی کے لگ بھگ خلافت اپنے پاس رکھی جو ان سے بغداد (عراق) کے عباسیوں نے چھین لی۔ عباسیوں کا سب سے نامور خلیفہ ہارون رشید تھا۔ مختلف نشیب و فراز سے گزرتی ہوئی خلافت سولہویں صدی میں ایک اجنبی نسل کے ہاتھ میں پہنچ گئی۔ یہ قسطنطنیہ کے عثمانی ترک تھے جن کا عربوں سے کوئی خونی یا جذباتی ناطہ نہ تھا' وہ صرف عربوں کے ہم مذہب یعنی مسلمان تھے۔

ترکوں نے جزیرۃ العرب کی حکمرانی سنبھالتے ہی عربوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنے شروع کر دیئے۔ عربوں سے غلاموں جیسا سلوک روا رکھا گیا جس سے ان کے اندر بغاوت اور نفرت کے شدید جذبات ابھرنے لگے۔ عرب کسی بھی ایسے موقعے کی تلاش میں تھے جس کے ذریعے وہ ترکوں کی غلامی کا یہ طوقِ اپنے گلے سے اتار پھینکیں یہ موقع انہیں اس وقت میسر آیا جب جنگ عظیم اول میں ترکی نے انگلستان کے خلاف جرمنی کا ساتھ دیا۔ برطانیہ نے اس موقعے پر عربوں کو حمایت کا یقین دلایا کہ ترکی کے خلاف جنگ جیتتے ہی وہ عربوں کو اس کے استحصالی چنگل سے چھڑا دیں گے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر ایک نامور انٹیلی جنس افسر ٹی۔ ای لارنس کو عربوں کی مدد کے لئے متعین کیا گیا۔ مکہ کے شریف حسین اور اس کے دو بیٹوں فیصل اور عبداللہ نے ترکوں کے خلاف "جنگ آزادی" میں بھرپور حصہ لیا۔ جنگ کے خاتمے پر حجاز کو آزاد ریاست قرار دیا گیا۔ فیصل کو عراق کا سربراہ بنایا گیا جب عبداللہ کو اردن اور دیگر علاقوں کی حکومت سونپی گئی عربوں میں بھی اس

دوران ایک نئی قیادت ابھری جو خلافت کی بجائے جدید طرز کی خود مختار حکومت کی حامی تھی خود ترکی میں خلیفہ سلطان عبدالحمید کے خلاف شدید رد عمل پیدا ہوا اور اس کا تختہ الٹ کر اسے جیل میں قید کر دیا گیا۔ مصطفیٰ کمال پاشا کی رہنمائی میں ترکی کے ترقی پسند عوام مذہبی نظام حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور ترکی میں خلافت ہی کا خاتمہ کر دیا گیا۔

اس سارے پس منظر سے یہ اچھی طرح ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان خود خلافت سے بیزار بلکہ متنفر ہو چکے تھے اس لئے یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اس خلافت سے کوئی دلچسپی یا ہمدردی رہی ہو گی کیونکہ اس کا کوئی جواز نہیں تھا لیکن اس کے باوجود ہندوستان میں خلافت کے خاتمے پر وسیع پیمانے پر شور و غوغا بلند ہوا بلکہ پورے ملک میں اس کی بقاء کے لئے بہت بڑی تحریک بھی شروع کی گئی۔ اس تحریک کے بانی دو مسلمان بھائی محمد علی اور شوکت علی تھے جن میں سے ایک آکسفورڈ کا گریجوایٹ تھا۔ ان کی تبلیغ کے مطابق خلافت اسلام کا جزو لاینفک تھی۔ علی برادران کا حقیقی مقصد عالمگیر مسلم اتحاد (پان اسلام ازم) کے حق میں تحریک چلانا تھا جب کہ مسلم عوام کے جذبات سے کھیلنے کے لئے اس سے بہتر کوئی نعرہ نہیں "اسلام خطرے میں ہے۔" مغربی ماحول اور تعلیم کے پروردہ ان دو بھائیوں نے اپنے ان پڑھ ہم مذہبوں کے جذبات نہایت کامیابی سے بھڑکائے اور خود بھی روایتی اسلامی قدامت پسندی کا جامہ اوڑھ لیا۔ داڑھیاں بڑھا کر یہ دونوں حضرات ایک نہایت منظم اور مضبوط تحریک چلانے میں کامیاب ہو گئے۔

اس موقعے پر فیصلہ بھی کیا گیا کہ مسلمانوں کا ایک وفد' انگلستان جا کر برطانوی وزیراعظم کو اپنے مطالبات اور جذبات سے آگاہ کرے۔ یہ وفد بذریعہ بحری جہاز ۱۹۲۰ء کے آغاز میں انگلستان روانہ ہو گیا جس کے سربراہ خود محمد علی تھے۔ برطانوی وزیراعظم لائیڈ جارج نے دو ٹوک الفاظ میں اس وفد کو آگاہ کر دیا کہ ترکی کی داخلی سالمیت پر کوئی حرف نہیں آنے دیا جائے گا لیکن عرب علاقہ جات پر اس کا قبضہ ہر حال میں ختم کر دیا جائے گا۔

پس یہ وفد تہی دامن ہندوستان واپس لوٹا وقت کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اس وفد نے گاندھی جی سے اتحاد کر لیا۔ گاندھی جی اور تحریک خلافت کے گٹھ جوڑ کے متعلق تندولکر لکھتے ہیں۔

"گاندھی جی کے اردگرد اب نئی قوتیں مرتکز ہو رہی تھیں۔ ہندوستان کے علماء محسوس کر رہے تھے کہ انہیں ۱۸۵۷ء کے بعد سے اپنی بکھری ہوئی طاقت کو از سرِ نو منظم کرنا چاہئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس میدان میں پیش پیش تھے۔ وہ بھی گاندھی جی کی طاقت کا بڑا سرچشمہ تھے۔"

جونہی تحریک خلافت کے رہنما مسلمان علماء اور مولانا آزاد مدد کے طلب گار ہو کر گاندھی جی کی جانب بڑھے' گاندھی جی کو دریا میں اپنی طوفانی حیثیت کا بخوبی اندازہ ہو گیا اور انہوں نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی ٹھان لی۔ وہ بالکل جنگی گھوڑے کی طرح بھپر گئے جو طبل جنگ پر پہلی چوٹ پڑنے کا انتظار کر رہا ہو۔ ان کے مزاج میں اس قدر تبدیلی واقع ہوئی کہ کوئی کہہ نہ سکتا تھا کہ وہ یہ وہی گاندھی ہیں جنہوں نے چند ماہ قبل ۱۹۱۹ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس میں بڑھ چڑھ کر انگریز سرکار کی قصیدہ گوئی کی تھی۔ جلیانوالہ باغ کا سانحہ اور پنجاب میں انگریزوں کے مظالم کسی کو بھی بغاوت پر اکسانے کے لئے کم نہ تھے لیکن ایسے موقعوں پر گاندھی جی نے اپنی پیشہ ورانہ امن پسندی جاری رکھی اور عوام کو اعتدال پسندی اور ضبط کا درس دیتے رہے۔ انہی خیالات کا اظہار انہوں نے کانگریس کے اجلاس میں بھی کیا لیکن علی برادران سے ملتے ہی انہوں نے زبردست قلابازی لگائی اور کہا کہ وہ "جنگ لڑیں گے" اور خلافت اسلامیہ کے تحفظ کے لئے عدم تعاون کی تحریک کا آغاز کریں گے جو مسلمانوں کے مطالبے پورے ہونے تک جاری رہے گی۔ ۱۰ مارچ ۱۹۲۰ء کو انہوں نے اپنی تحریک کا منشور جاری کیا جو سخت دھمکی آمیز الفاظ پر مبنی تھا۔

"انگلستان ہم سے خلافت کے مسئلے پر کسی غلامانہ حمایت کی توقع نہ رکھے کیونکہ

اس نے ترکی کے حقوق غصب کئے ہیں اور یہ مسلمانوں کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔۔۔۔۔"

(مہاتما از تندولکر، جلد اول صفحہ ۲۸۴)

اندولال یا جنک ان دنوں گاندھی جی کے دست راست تھے وہ اس ضمن میں کہتے ہیں

"سیاسی حلقے گاندھی جی کے پر تشدد لہجے اور انداز پر حیران بلکہ پریشان تھے کیونکہ اسلام کی محبت اور حمایت میں گاندھی جی انتہاپسند ترین مسلمانوں پر بھی سبقت لے گئے تھے۔

(جناح از ایچ ایم سید، صفحات ۵۳ - ۲۵۲)

گاندھی جی کو یقین تھا کہ اب وہ اپنے عدم تعاون کے تجربے کو بڑے پیمانے پر دہرا سکتے ہیں۔ جنوبی افریقہ اور بہار میں حاصل کردہ ننھی ننھی کامیابیوں نے ان کے ہوش و حواس کو بری طرح بہکا دیا تھا۔ علی برادران "اسلام خطرے میں ہے" کا نعرہ لگا کر ان کے لئے میدان پہلے ہی ہموار کر چکے تھے۔ عوام کے مشتعل جذبات کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر کے وہ اپنے خوابوں اور عزائم کو عملی جامہ پہنانا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس تکنیک سے ہندوستان کو بھی بہت جلد کامیابی حاصل ہو جائے گی۔ گوکھلے گاندھی جی کی ان حرکات کو چشم تصور سے وقت سے پہلے دیکھ چکے تھے اور انہوں نے اس ضمن میں متعدد خدشات کا بھی اظہار کیا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی میں گاندھی جی کی شمولیت پر خوش نہ تھے اور انہوں نے گاندھی جی کو انکار کرنے میں اپنے سیاسی رفیقوں کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

تحریک خلافت ہی کے دوران پہلی مرتبہ گاندھی جی کی ملاقات مولانا ابوالکلام آزاد سے ہوئی تھی اپنی خودنوشت سوانح میں مولانا رقم طراز ہیں کہ ان کا خاندان اصلاً ہرات سے تعلق رکھتا تھا لہٰذا ان کے خاندان کی جڑیں ہندوستان کی مٹی میں پیوست نہ تھیں اور

اسے ہند سے کوئی جذباتی وابستگی بھی نہ تھی۔ ان کے والد افغانستان سے ہجرت کر کے مکہ جا بسے جہاں ۱۸۸۸ء میں مولانا پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش کے فوراً بعد ہی ان کے والد اپنے خاندان سمیت طبی معائنے کے لئے کلکتہ تشریف لائے اور پھر یہیں آباد ہو گئے۔ چنانچہ مولانا کی پرورش کلکتہ ہی میں ہوئی۔ اپنی نوعمری ہی میں انہوں نے ایران، مصر اور ترکی جیسے اسلامی ممالک کی سیاحت کی اس دور میں ان ممالک میں انگریز مخالف جذبات کی شدید لہر اٹھی ہوئی تھی، مولانا بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ۱۹۱۲ء میں وہ ہندوستان واپس آئے اور کلکتہ میں قیام کیا اور دو اخبارات بعنوان الہلال اور البلاغ جاری کئے۔ دونوں اخبارات اردو زبان میں شائع ہوتے تھے اور ان کی پالیسی جارحانہ انگریز مخالف تھی چنانچہ ان پر پریس ایکٹ کے تحت متعدد پابندیاں عائد کی گئیں۔ جنگ عظیم اول کے آغاز پر انہیں پابند سلاسل کردیا گیا اور ان کی رہائی جنگ کے خاتمے پر ممکن ہو سکی۔ رہا ہوتے ہی وہ علی برادران کی تحریک خلافت میں شامل ہو گئے۔

جونہی گاندھی جی کی نظر مولانا آزاد پر پڑی وہ بھانپ گئے کہ انہیں مسلمانوں سے قریب لانے میں یہ شخص کلیدی کردار ادا کر سکتا ہے۔ جناح ایک محب وطن ہندوستانی تھے جن کی زندگی کا مقصد اپنے مادر وطن کو آزاد کروانا تھا لیکن گاندھی جی کے لئے ہندوستان کی آزادی ثانوی حیثیت رکھتی تھی ان کا اولین مقصد اپنی ذات اور اپنے پسندیدہ نظریات کی تشہیر تھا۔ وہ سرزمین ہند کو گاندھی ازم کے فروغ کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے فلسفے کی جے جے کار محض ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں سننا چاہتے تھے۔ اس نقطۂ نظر سے جناح ان کے لئے قطعاً بیکار تھے۔ انہوں نے جناح کو کانگریس کا متوالا، دادا بھائی نوروجی کا شاگرد، گوکھلے کا منظور نظر اور ہندو مسلم اتحاد کا سفیر ماننے کے باوجود مسترد کر دیا اور مسلمان انتہا پسندوں کے گلے لگ گئے جن میں محمد علی اور شوکت علی کے علاوہ ایسے لوگ شامل تھے جن کا ماضی فرقہ واریت سے وابستہ تھا۔ وہ پان اسلام ازم کے علم بردار تھے اور انہیں عرب ممالک اور ترکی کے معاملات سے ہندوستان کی نسبت کہیں

زیادہ دلچسپی تھی۔ گاندھی جی کی تحریک خلافت میں شمولیت سے میثاق لکھنؤ خود بخود مسترد ہو گیا جو جناح کی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ لکھنؤ کے اس معاہدے نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے سیاسی اختلافات کو بہت حد تک مٹا دیا تھا لیکن تحریک خلافت نے انہیں اختلافات کو بھڑکا کر اپنے مقاصد کی حاصل کئے کیونکہ یہ بنیادی طور پر مذہبی جنون پر مبنی تحریک تھی۔ مولانا آزاد اپنی معروف کتاب "آزادی ہند" میں گاندھی جی اور تحریک خلافت کے متعلق لکھتے ہیں۔

"اب سوال اٹھا کہ اگلا قدم کیا ہونا چاہئے؟ ایک اجلاس میں تحریک عدم تعاون کا فیصلہ ہوا جس میں شوکت علی، محمد علی، حکیم اجمل خاں، لکھنؤ کے مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور گاندھی شریک تھے۔ انہوں نے کہا کہ وفود کی آمدورفت اور عرضداشتیں پیش کرنے کا زمانہ لد گیا ہے۔ اب ہمیں حکومت سے ہر قسم کا تعاون ختم کر دینا چاہئے اسی سے وہ راہ راست پر آئے گی۔ اجلاس میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ تمام سرکاری خطاب واپس کر دیئے جائیں، عدالتوں اور تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کیا جائے۔ ہندوستانی عوام تمام سرکاری نوکریوں سے مستعفی ہو جائیں اور نو منتخب مجالس قانون ساز میں ہرگز حصہ نہ لیں۔"

اس دوران مولانا آزاد اور گاندھی جی روحانی پہلو سے ایک دوسرے سے کتنے قریب ہو گئے اس کا اندازہ مولانا کی اپنی تحریر سے کیا جا سکتا ہے۔

"جونہی گاندھی جی نے اپنی تجاویز پیش کیں مجھے محسوس ہوا کہ یہ تو وہی خیالات ہیں جو ٹالسٹائی نے برسوں پہلے انسانیت کو تحفے میں دیئے تھے----- ٹالسٹائی کا کہنا تھا کہ ایک استبدادی حکومت سے لڑنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ٹیکس دینے سے انکار کر دیا جائے تمام نوکریوں سے استعفی دے دیا جائے اور تمام سرکاری اداروں کا بائیکاٹ کر دیا جائے۔ اس کا ایمان تھا کہ اس رویے

سے کسی بھی حکومت کو پٹڑی پر ڈالا جا سکتا ہے۔ مجھے یاد رہے کہ میں نے بھی
الہلال کے ایک اداریے میں ایسا ہی پروگرام پیش کیا تھا۔"

"دیگر لوگوں نے اپنے اپنے پس منظر کے مطابق رد عمل ظاہر کیا۔ حکیم
اجمل نے پروگرام پر غور کرنے کے لئے کچھ وقت طلب کیا۔ خود کچھ یقینی طور
پر سمجھنے سے پہلے وہ دوسروں کو کوئی رائے دینا نہیں چاہتے تھے۔ مولانا
عبدالباری نے کہا کہ گاندھی جی کی تجاویز سے کچھ حساس مسائل پیدا ہو سکتے
ہیں اس لئے انہیں غور و خوض کے لئے وقت چاہئے اور وہ استخارہ کئے بغیر کچھ
نہیں کہیں گے۔ محمد علی اور شوکت علی' مولانا عبدالباری کے فیصلے کا انتظار
کرنے کے لئے تیار تھے۔"

"پھر گاندھی جی نے میری طرف رجوع کیا میں نے بلا ہچکچاہٹ کہا کہ مجھے
ان تجاویز سے صدفی صد اتفاق ہے۔ اگر ہندوستانی عوام ترکی کی مدد کرنا چاہتے
ہیں تو آپ کے مجوزہ پروگرام سے بہتر کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔"

تحریک خلافت سے اتحاد کرتے ہی گاندھی جی نے یکم اگست ۱۹۲۰ء کو اپنے
پروگرام کا رسمی آغاز کیا اور تحریک عدم تعاون شروع کر دی۔ اگلے ہی روز
تلک انتقال کر گئے۔ محمد علی اور شوکت علی کے ہمراہ انہوں نے مسلمان عالموں
اور مولاناؤں سے رابطے شروع کر دیئے اورانہیں سے اسلامی فلسفہ تشدد اور
عدم تشدد پر نادر خیالات پیش کیئے۔ مسلمان علماء کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے
لئے انہوں نے اپنے نہایت لچکدار فلسفہ عدم تشدد میں اہم تبدیلیاں کیں اور
۱۰ مارچ ۱۹۲۰ء کو اپنے ایک بیان میں انہوں نے فرمایا۔

"مسلمانوں پر قرآن نے کچھ ایسے فرائض عائد کئے ہیں جن میں ہندو شمولیت
اختیار نہیں کر سکتے۔ چنانچہ مسلمانوں کے پاس یہ حق محفوظ ہے کہ وہ عدم تشدد
اور عدم تعاون کی تحریک کی ناکامی کی صورت میں اسلامی فقہ کی رو سے اپنے

مسائل کا حل ڈھونڈ سکتے ہیں۔ حصول انصاف کے لئے ان پر ہر طریقے کا در کھلا ہے۔ میں دل و جان سے اس قرارداد کی حمایت کا اعلان کرتا ہوں۔"

(مہاتما از تندولکر' جلد اول صفحہ ۲۸۵)

ڈاکٹر امیبڈکر کہتے ہیں۔

"ایک اور اہم نکتے کی جانب میں نے گاندھی جی کی توجہ مبذول کروائی۔ ایک رات کو ہم ناگپور میں اکٹھے تھے جہاں خلافت کانفرنس کا اجلاس ہو رہا تھا۔ مولاناؤں نے اس موقعے پر قرآن کی ایسی متعدد آیات کا حوالہ دیا جن میں جہاد کا بکثرت تذکرہ موجود تھا۔ جب میں نے گاندھی جی کی توجہ تحریک خلافت کے اس پہلو کی جانب دلائی تو مہاتما مسکرائے اور کہا ان کا (مسلمانوں کا) اشارہ تو انگریز بیوروکریسی کی جانب ہے۔ میں نے جواب دیا کہ جہاد کا یہ تصور تو آپ کے فلسفۂ عدم تشدد کے عین مخالف ہے اور بعض حالات میں یہی مسلمان علماء انہی قرآنی آیات کا سہارہ ہندوؤں کے خلاف بھی لے سکتے ہیں۔

("پاکستان یا تقسیم ہند" ازبی آرا میبڈکر' صفحہ ۱۴۹)

گاندھی جی کی مذہبی و سیاسی سرگرمیاں کسی بھی ہمعصر اور موقر رہنما کی نظر میں پسندیدہ نہ تھیں۔ ان کے نزدیک ترین پیروکاروں نے بھی تحریک خلافت کے حق میں ان کی اشتعال انگیز تقریروں پر اعتراض کیا۔ ان کے دست راست اندولال یا جنک کے مطابق۔

"ہماری کبھی بھی یہ خواہش نہ رہی تھی کہ گاندھی جی کسی نیم مذہبی یا ایسی تنظیم کا ساتھ دیں جو مذہب کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرے۔ ہم نے ان کا ساتھ محض اس لئے دیا تھا کہ آزادی کے حصول کے لئے ان کے راست اقدامات کی پیروی کریں۔

(جناح از ایچ ایم سید' صفحات ۵۳ - ۲۵۲)

تحریک عدم تعاون کے رسمی آغاز کے بعد گاندھی جی اور علی برادران نے پورے ملک کا طوفانی دورہ کیا تاکہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو آخری حد تک بھڑکایا جا سکے۔ ہزاروں مفلس، ان پڑھ اور بے بس مسلمان کسانوں نے اپنے گھر مسمار کر کے افغانستان کی جانب ہجرت شروع کر دی جس پر انہیں علی برادران نے اکسایا تھا۔ جب یہ لاچار انسان افغانستان کی سرحد پر پہنچے تو افغان حکام نے انہیں اپنے علاقے میں گھسنے نہیں دیا۔ یہاں پر ان کا افغان سپاہیوں کے ساتھ خونریز تصادم بھی ہوا۔ یہ بدنصیب افراد ناقابل بیان تکالیف برداشت کرتے ہوئے واپس وطن پہنچے۔ واپس آنے والوں کی تعداد جانے والوں سے نصف تھی۔ لاتعداد انسان اس ہجرت میں زندگی کی بازی ہار گئے واپس آنے والوں کی تکلیفوں کا سلسلہ محض یہیں پر ختم نہیں ہوا۔ وطن میں بھی بدنصیبیاں ہی ان کی راہ تک رہی تھیں۔ یہاں کوئی سامان زندگی باقی نہ تھی کیونکہ بیشتر لوگ اپنے گھربار، کھیت کھلیان اور ڈھور ڈنگر بیچ کر افغانستان گئے تھے۔

دریں اثناء ایک اور نہایت ناخوشگوار واقعہ پیش آیا۔ مالابار میں موپلہ عوام نے بغاوت کر دی۔ موپلہ عوام کی اکثریت مسلمانوں پر مبنی تھی اور وہ ماہی گیری اور کھیتی باڑی سے گزر اوقات کرتے تھے۔ تحریک خلافت نے ان پرامن انسانوں کو مذہبی جنون اور فرقہ واریت سے آشنا کر دیا۔ انہوں نے قیام خلافت کے لئے اعلان جہاد کیا تو لاتعداد انگریزوں، بے گناہ ہندو زمینداروں اور مہاجروں کو بے دردی سے ہلاک کرنے کے علاوہ ان کے گھر اور مندر نذر آتش کر دیئے۔ متعدد ہندوؤں کو جبراً مسلمان بنایا گیا۔ حکومت نے بھی جواباً موپلہ مسلمانوں کے خلاف پوری قوت سے کارروائی کی اور وسیع پیمانے پر جانی نقصان ہوا۔

تحریک خلافت کے دوران ہونے والا ہندو مسلم اتحاد نہایت کمزور بنیادوں پر استوار تھا۔ مسلمانوں کے لئے یہ محض جہاد تھا جو وہ بقائے خلافت کے لئے کر رہے تھے جب کہ گاندھی کے پیش نظر صرف اور صرف اپنے مقاصد تھے کسی کو بھی ہندوستانی عوام اور

ہندوستان کی آزادی سے کوئی سروکار نہ تھا۔

گاندھی جی نے کہا۔

"تحریکِ خلافت وہ پلیٹ فارم ہے جس کے ذریعے میں نے مسلمانوں اور مولانا محمد علی نے اپنے اپنے مذہبی مفادات کا تحفظ کیا۔ خلافت ان کے دین کا حصہ تھی وہ اس کی بقاء کے لئے سرگرم رہے جب کہ میں نے گائے کو مسلمانوں کی چھریوں سے بچایا کیونکہ گائے کا دفاع میرے مذہب کا حصہ ہے۔"

لیکن جب یہ نام نہاد ہندو مسلم اتحاد ختم ہوا تو فرقہ واریت کا جن پوری قوت سے بوتل سے باہر آگیا اور ملک بھر میں بدترین مذہبی تشدد دیکھنے میں آیا۔ کوہاٹ میں ہندوؤں پر عرصہ حیات اس طرح تنگ کیا گیا کہ ان کی پوری آبادی کوہاٹ چھوڑنے پر مجبور ہو گئی۔ مذہب کے نام پر قتل و غارت اور آتشزنی سے بے گھر اور بے سروسامان ہندو گاندھی جی سے پوچھنے پر مجبور ہو گئے: "آپ نے خلافت کی خاطر ہمیں مسلمانوں سے اتحاد کا درس دیا تھا لیکن اب جب کہ وہ تحریک ختم ہو چکی ہے تو بیدار مسلمانوں نے وہی جہاد ہندوؤں ہی کے خلاف شروع کر دیا ہے۔" جب کہ مسلمانوں نے کہا: "آپ نے اپنی تحریک میں ہم سادہ لوح انسانوں کو بالکل مہروں کی طرح استعمال کیا۔ یہاں تک کہ محمد علی کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے آپ نے علی گڑھ کے اداروں کو زک پہنچانے سے گریز نہیں کیا جنہیں سرسید احمد خاں نے اپنے خون جگر سے سینچا تھا۔ مجالس قانون ساز کا بائیکاٹ کر کے آپ نے نہایت قابل مسلمانوں کو وہاں پہنچے اور ترقی کرنے سے روک دیا جس سے من حیث القوم مسلمانوں کو شدید نقصان ہوا۔"

(مہاتما از تندولکر، جلد دوم، صفحہ ۱۳۰)

تحریک خلافت کا ایک اور ناخوشگوار نتیجہ بھی نکلا، اس دور کے وائسرائے لارڈ ریڈنگ کو خطرہ پیدا ہو گیا کہ مسلمان اب ہمیشہ برطانوی راج کے متشدد مخالف رہیں گے چنانچہ اس نے ایڈون مونٹیگ کو تار بھیجا کہ قسطنطنیہ اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں

میں سلطان ترکی کی خلافت بحال کر دی جائے۔ موٹیگ امور ہند کے وزیر تھے۔ مسلمانوں کے جذبات کا احترام کرنے کے چاؤ میں تار کا متن برطانوی کابینہ سے رسمی منظوری لئے بغیر ہی اخبارات میں شائع کر دیا گیا۔ اس جرم میں لارڈ موٹیگ کو ان کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا اور وہ سیاسی افق سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو گئے۔ وہ ہندوستان کے لئے نہایت نرم گوشہ رکھتے تھے ان کی برطرفی پورے ہندوستان کے لئے نقصان دہ ثابت ہوئی۔ وہ دل شکستہ ہو کر کچھ عرصے بعد وفات پا گئے۔ ہندوستان کے لئے اپنا تن من دھن قربان کرنے والا انسان، تحریک خلافت کی بھینٹ چڑھ گیا۔

اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے رتی بھر شعور کا مظاہرہ کرتے ہوئے ترکی کے مسلمانوں کی سرگرمیوں اور مطالبات پر غور کیا ہوتا تو وہ جان جاتے کہ ترکی کی جدید قیادت موصل کے تیل کے کنوؤں کا قبضہ حاصل کرنے میں زیادہ دلچسپی لے رہی تھی اور اسے خلیفہ کے زیر اختیار علاقے اور مقدس مقامات سے سرمو کوئی سروکار نہیں تھا یہ امر رنج والم سے خالی نہیں کہ ہندوستان کے مجہول مسلمان عرب علاقوں پر ترکی کا تسلط برقرار رکھنے کے لئے اپنی جانیں قربان کرنے کے لئے تیار تھے جب کہ ترکی خود موصل کے تیل کے کنوؤں کی خاطر عرب، شام اور فلسطین کے علاقوں سے قبضہ چھوڑنے پر تیار تھا۔ ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو مصطفیٰ کمال پاشا نے تحریک خلافت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ جس شخص کو خلیفہ عبدالمجید نے ملک بدر کر دیا تھا وہ اتاترک بن کر لوٹا اور اس نے ترکی میں خلافت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔ ترکی کی خلافت تو ختم ہو گئی لیکن تحریک خلافت کے زہریلے اثرات ہندوستان کی سیاست سے کبھی ختم نہ ہو سکے۔

باب دہم

تحریک خلافت اور گاندھی جی کی جنوں خیزیاں ○ خلافت اور کھدر' گاندھی جی کے عزائم کے عکاس:

خلافت کانفرنس ۸ جولائی ۱۹۲۱ء کو کراچی میں منعقد ہوئی جہاں علی برادران نے خود کو نہایت اعلیٰ شعلہ بیاں مقرر ثابت کیا۔ انہوں نے مسلمانوں کو باور کروایا کہ اس موقع پر فوج میں بھرتی ہو کر ان کے ایمان کی آزمائش کی گھڑی آن پہنچی ہے کیونکہ انگریز سرکار ان کے خلیفہ کے خلاف برسرپیکار ہے۔ مسلمانوں پر بغاوت اور جہاد فرض ہو چکا ہے۔ دونوں بھائیوں کو گرفتار کر کے مقدمہ چلایا گیا اور ان کو فوج میں بے چینی پھیلانے کے الزام میں طویل قید کی سزا سنائی گئی۔ علی برادران کی گرفتاری کی خبر سنتے ہی گاندھی جی کے جذبات اور عقل دونوں ان کے بس سے باہر ہو گئے۔ انہوں نے فوراً یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ ان کی تحریک عدم تعاون کی زندگی کا انحصار صرف اور صرف تحریک خلافت کی جذباتی بقاء اور مضبوطی پر ہے۔ انہوں نے پختہ عزم کر لیا کہ تحریک خلافت کی چنگاریاں بجھنے نہ پائیں بلکہ شعلہ بن کر بھڑکیں۔ ساتھ ہی یہ خیال بھی ان کے ذہن میں راسخ ہو گیا کہ اگر تحریک خلافت کی حمایت میں انہیں بھی گرفتار کر لیا جائے تو وہ مسلمانوں کی نظر میں ہیرو بن کر ابھر سکتے ہیں۔ مسلمانوں کا لیڈر بننا اور اپنے پسندیدہ نظریات کا فروغ ہی ان کی زندگی کا مشن تھا۔ چنانچہ علی برادران کے گرفتار ہوتے ہی گاندھی جی نے ان کی جگہ لے لی اور ان کے نقش قدم پر چلنا شروع کر دیا۔ ان دنوں گاندھی جی جنوبی ہندوستان کے دورے پر تھے جہاں انہوں نے مختلف مقامات پر علی برادران کی مذکورہ باغیانہ تقریر کو متعدد مرتبہ دہرایا۔ انہوں نے اسی پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ اسی تقریر کو ریڈیو کے ذریعے ملک بھر میں نشر کروانے کے انتظامات میں مصروف ہو گئے۔ قرار داد کراچی کے حق میں انہوں نے کانگریس کا

تعاون حاصل کرنے کی کوشش بھی کی۔

بمبئی کے گورنر نے علی برادران کی سزا پر ایک تبصرہ کیا جس کے جواب میں گاندھی جی نے کہا:

"بمبئی کے گورنر شاید اس امر سے آگاہ نہیں ہیں کہ انڈین نیشنل کانگریس نے افواج ہند کی وفاداری پر گزشتہ برس ستمبر سے اعتراض شروع کر دیا تھا۔ مرکزی خلافت کمیٹی نے یہ سوال بعد میں اٹھایا لیکن ان سب سے پہلے اس حق کا پرچم میں نے بلند کیا تھا کہ ہندوستان کے رہنما نہ صرف فوج بلکہ ہر سرکاری اہلکار کو یہ بتانے کے مجاز ہیں کہ متعلقہ افراد سرکار برطانیہ کی سیاہ کاریوں میں برابر کے شریک ہیں کراچی کانفرنس میں تو محض کانگریس کے اعلامیے کو اسلامی رنگ میں پیش کیا گیا۔ کوئی بھی شخص جسے انسانیت چھو کر گئی ہو یا کوئی مسلمان جسے اسلام سے رتی بھر محبت ہو' علی برادران کی مخالفت کیونکر کر سکتا ہے؟ جناب عزت مآب گورنر کو جان لینا چاہیے کہ غداری کانگریس کے مزاج کا حصہ بنتی جا رہی ہے۔ تحریک عدم تعاون کا فرض ہے کہ وہ موجودہ حکومت کے خلاف بے چینی پھیلائے۔"

(تندولکر' جلد دوم صفحہ ۵۹)

جنوبی ہند کے مقام تریکونو پولی میں انہوں نے کہا:

"میں کراچی کی تاریخی کانفرنس میں شریک نہ تھا لیکن اگر میں وہاں موجود ہوتا جو دل و جان سے قرارداد کی حمایت کرتا۔"

(ایضاً)

جنوبی ہند کے اس طوفانی دورے کے دوران ہی انہوں نے کپڑے اتار کر نیم برہنہ فقیر (ونسٹن چرچل کے الفاظ میں) بننے کا اہم ترین فیصلہ کر لیا۔ اس کے بعد زندگی بھر ان کا لباس گھٹنوں سے اونچی دھوتی پر مشتمل رہا۔ اس فیصلے پر انہوں نے ۲۱ ستمبر ۱۹۲۱ء کو جنوبی

ہند ہی میں عمل شروع کر دیا۔"

(ایضاً" صفحہ ۶۰)

۲۴ ستمبر کو انہوں نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ انہیں افواج ہند سے متعلق علی برادران کے خیالات پر عمل کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ گرفتاریاں پیش کرنی چاہیں۔ اس کے فوراً بعد انہوں نے بمبئی میں کانگریس کا اجلاس طلب کر کے اس کی صدارت بھی خود کی۔ مابعد واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ کانگریس کے رہنما بھی گاندھی جی کے سحر میں گرفتار ہو کر عقل و خرد سے کس قدر بیگانہ ہو چکے تھے۔ اس اجلاس میں کانگریس کے ۵۰ راہنماؤں کے دستخطوں کے ساتھ حکومت کے خلاف ایک منشور جاری کیا گیا جس میں محمد علی کے جذبات کی نہ صرف حمایت کی گئی بلکہ اس میں درج ذیل اضافہ بھی کیا گیا:

"ہمارا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ سرکار ہند کے ہر فوجی اور سول اہلکار کو اپنی اپنی نوکری ترک کر کے روزی کمانے کا کوئی متبادل ذریعہ تلاش کرنا چاہیے۔"

(ایضاً)

اگر آپ ان ۵۰ رہنماؤں میں شامل ممتاز افراد کے نام جان لیں تو آپ کی حیرت کی انتہا نہ رہے کہ گاندھی جی کے پیروکاروں میں موتی لال نہرو' لالہ لاجپت رائے' سی راج گوپال اچاریہ' ڈاکٹر راجند پرسار' جواہر لال نہرو اور ایم آر جے کار بھی سرفہرست تھے !!! بعد میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اس منشور کی مکمل منظوری دی اور خلافت کے رہنماؤں کی پوری پوری حمایت کا اعلان کیا۔ بس اب کیا تھا کہ پورا ہندوستان اشتعال انگیز قرار داد کراچی اور کانگریس کے منشور سے گونجنے لگا۔ انہیں دنوں جے کار کا ایک نہایت دلچسپ مذاکرہ سر چیمن لال سیتل داد اسے بمبئی میں ہوا جو اس وقت کی مقامی حکومت کے رکن تھے۔ اس کا تذکرہ جے کار نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں اس طرح کیا ہے۔
سر چیمن لال کہنے لگے۔

"آپ کا کیا خیال ہے کہ آپ کے جوشیلے اعلان نامے سے حکومت بمبئی آپ

کے جال میں پھنس جائے گی اور آپ سب جیلوں میں جا کر واہ واہ کروا لیں گے۔ ہرگز نہیں۔ آپ میں سے کسی کو بھی گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ آپ بھول گئے ہیں کہ میں بھی اسی حکومت کا کارندہ ہوں اور حکومت کو آپ کے دام میں پھنسنے سے بچانا میری ذمہ داری ہے۔"

(بے کار' جلد اول' صفحہ ۴۵۱)

لارڈ ریڈنگ بھی بے حد گھاک اور کائیاں آدمی تھے انہوں نے اس منشور پر کوئی توجہ نہیں دی اور کسی کو بھی گرفتار نہیں کیا گیا۔ اس منشور پر گاندھی جی کا رابندر ناتھ ٹیگور سے شدید اختلاف ہوا حالانکہ چوٹی کے ۵۰ رہنما اس پر دستخط کر چکے تھے۔ ٹیگور نے گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون کو کبھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا۔ سانحہ جلیانوالہ باغ اور پنجاب کے مظالم کے بعد انہوں نے سرکار برطانیہ کو سر کا خطاب بھی واپس کر دیا تھا لیکن یہ انہوں نے سب انفرادی حیثیت میں کیا لیکن انہیں احساس تھا کہ ایسے حساس موقعے پر ان پڑھ عوام کے جذبات کو بھڑکانا نہیں چاہیے چنانچہ انہوں نے مکمل خاموشی اختیار رکھی۔ تاہم انہوں نے یہ ضرورت محسوس کی کہ ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکات پر گاندھی جی کو بروقت انتباہ کیا جائے انہوں نے متعدد خطوط میں گاندھی جی سمجھانے بجھانے کی کوشش کی۔ ٹیگور لکھتے ہیں۔

"خاموش مزاحمت کی تحریک تمام اخلاقی تقاضے پورے نہیں کرتی اسے حق و صداقت کے خلاف بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ حقیقتاً دنیا کی ہر تحریک کے اندر ایک ایسا نقصان دہ بیج موجود ہوتا ہے جو اسے تباہ کر سکتا ہے۔ ہر تحریک جب طاقت پکڑنے لگتی ہے تو اس میں شامل عناصر اپنے نصب العین کو فراموش کر کے لالچ کی جانب راغب ہو جاتے ہیں۔"

ایک اور خط میں ٹیگور نے لکھا:

میں اس بات پر بار بار زور دے رہا ہوں کہ ہر وہ چیز جو ہماری روحانی آزادی

اور ارتقاء کی راہ میں حائل ہو' اسے ایجنڈے سے خارج کر دینا چاہئے۔ سچائی کے لئے شہادت کے عزم کو نہایت نچلی سطح پر آکر مذہبی جنون میں تبدیل نہیں ہونا چاہئے۔ سستے جذبات کو خوشنما نام دے کر ہمیں خود فریبی میں مبتلا قطعاً نہیں رہنا چاہئے۔"

(مہاتما گاندھی کے نظریات از ریونڈ سی ایف اینڈریوز' صفحات ۵۳ - ۲۵۲)

گاندھی جی اپنے مذکورہ بالا منشور پر ۵۰ نامور رہنماؤں کے دستخط لینے کے بعد ٹیگور سے بھی اس کا مطالبہ کر رہے تھے ٹیگور نے نہ صرف گاندھی جی کے شدید ذاتی دباؤ کے باوجود اس منشور پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا بلکہ اپنا ایک ذاتی منشور بھی جاری کیا جس میں گاندھی جی کے آمرانہ رویے کی سخت مذمت کی گئی تھی۔ ٹیگور کے اس منشور کا ایک اہم اقتباس درج ذیل ہے:

مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے عوام کو کسی بیرونی دباؤ کے تحت بیک زبان بولنے پر مجبور کیا جا رہا ہے اور وہ بلاوجہ بھیڑ چال میں دھکیلے جا رہے ہیں۔ ہر جگہ کلچر اور عقل و شعور کو کچل کر اندھی تقلید کا رواج عام کیا جا رہا ہے----- ہندوستان کو اپنا اس قدر عظیم مقصد محض ایک آقا کے سپرد نہیں کرنا چاہئے۔ جذبات اور ولولے کی اہمیت اپنی جگہ لیکن سوجھ بوجھ' تحمل اور غور و فکر کو نظر انداز کر دینا کہاں کی عقلمندی ہے؟ اس موقعے پر ملک کی تمام اخلاقی طاقتوں کو متحد ہو جانا چاہئے۔ اقتصادیات کے ماہرین کو معاشی مسائل کا حل ڈھونڈنا چاہئے۔ ماہرین تعلیم کو پڑھانے میں منہمک ہونا چاہئے۔ سیاستدانوں کو غور و فکر میں مصروف ہونا چاہئے جب کہ کارکنوں کو اپنا اپنا کام کرنا چاہئے۔ اس ضمن میں کسی کو روکنے کے لئے کسی قسم کا اعلانیہ یا خفیہ دباؤ استعمال نہیں ہونا چاہئے۔"

رابندر ناتھ ٹیگور کے اس اقتباس کو جے کار اور تندولکر نے اپنی اپنی کتابوں میں

نقل کیا ہے۔ اسے اکتوبر ۱۹۲۱ء کے ماڈرن ریویو میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ بہرطور گاندھی جی بھی ہار ماننے کے لئے پیدا نہیں ہوئے تھے انہوں نے ٹیگور کے اس پیغام کا ترکی بہ ترکی جواب دیا جس کے ایک ایک لفظ سے حقارت اور تکبر ٹپکتا تھا۔ گاندھی جی اپنی تحریر کے آخر میں لکھتے ہیں۔

"میرا انکسار مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتا ورنہ میں علی الاعلان کہتا کہ میرا پیغام عدم تشدد اور عدم تعاون عالمگیر اور آفاقی حیثیت کا حامل ہے۔ اگر اس نے اپنی مادر مٹی میں پھل نہ دیا تو پھر یہ یقیناً پوری دنیا میں بھی ختم ہو جائے گا۔"

(مہاتما گاندھی کے نظریات از ریورنڈ سی ایف اینڈریوز صفحہ ۲۲۶' مزید دیکھئے مہاتما از تندولکر جلد دوم' صفحہ ۶۴)

ٹیگور نے گاندھی جی کی جن شدید الفاظ میں مخالفت کی' گاندھی جی نے اسی قدر بھڑک کر اپنے دفاع بلکہ توصیف میں جو بیان جاری کیا وہ ان کی نفسیات پر بہت عمدہ روشنی ڈالتا ہے۔ گاندھی جی نے کسی قسم کے عجز و انکسار کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ ان کو اپنی حرکات پر بے حد فخر تھا۔ انہوں نے بلا جھجک کہا کہ وہ پوری دنیا کو پیغام دینا چاہتے ہیں اور اس سے قبل کہ یہ پیام پوری انسانیت تک پہنچے اس کا پہلا تجربہ ہندوستان میں ہونا چاہئے۔ جنگ عظیم دوم کے دوران انہوں نے ہر برطانوی شہری کو خط میں لکھا کہ ان کی زندگی کا مشن ہی عدم تعاون اور عدم تشدد کی تحریکوں کا فروغ تھا اور وہ صرف اسی مقصد کے لئے زندہ رہے۔ وہ جنوبی افریقہ سے ہندوستان لوٹے ہی اس لئے تھے کہ اپنے تجربات وہاں دہرا سکیں۔ اسی لئے وہ اپنے آشرم کے متعدد مکینوں کو جنوبی افریقہ سے اپنے ساتھ لائے تھے۔

(تندولکر' جلد ششم' صفحہ ۱۸۶)

گاندھی جی نے ہندوستان آتے ہی اپنی سرگرمیوں کا رخ اُن مقاصد کے حصول کی طرف موڑ دیا۔ تحریک آزادی یا فرقہ وارانہ اتحاد کی حیثیت ان کی زندگی میں محض ثانوی

تھی۔ انہیں انہوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے صرف ذرائع کے طور پر استعمال کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۹ء کے درمیان ہمیں جناح تمام وقت کانگریس اور مسلم لیگ کو قریب لانے میں مصروف نظر آتے ہیں جب کہ گاندھی جی اپنی خاموش مزاحمت اور ستیہ گرہ کے عزائم کو بڑے پیمانے پر عملی جامہ پہنانے کے لے چھوٹے چھوٹے مقامات پر ریہرسل کرتے رہے۔ جس وقت پورے ملک نے جناح کی حب الوطنی کو خراج تحسین پیش کیا' گاندھی جی نے انہیں درخور اعتناء نہیں سمجھا اور ان کے کام میں کبھی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔

اگرچہ یہ گاندھی جی جنوبی افریقہ سے واپسی کے بعد باقاعدگی سے کانگریس کے اجلاسوں میں حصہ لیتے رہے لیکن انہوں نے ۱۹۱۹ء کے امرتسر اجلاس سے قبل کوئی سرگرمی کبھی نہیں دکھائی۔ ان کا رویہ ہمیشہ محتاط اور اعتدال پسندانہ رہا لیکن تحریک خلافت میں مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرنے کے بعد انہوں نے یکلخت پینترا بدل لیا کیونکہ اب انہیں یقین ہو گیا تھا ہندوستانی سیاست میں ان کے فیصلہ کن اور کلیدی کردار کا موقع آن پہنچا ہے۔ انہیں اعتماد تھا کہ ملکی سیاست پر چھا جانے میں انہیں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی کیونکہ کانگریسی رہنماؤں پر مغرب کی چھاپ بے حد نمایاں ہے اور ان کی جڑیں عوام میں نہیں ہیں۔ گاندھی جی جنوبی افریقہ سے ایک قابل قدر خیال لے کر آئے تھے وہ جانتے تھے اور انہوں نے تجربے سے سیکھا تھا کہ طاقت کا سرچشمہ صرف عوام ہیں اور جو کوئی عوام کے جذبات اور احساسات کو اپنے سحر میں جکڑنے کا فن جانتا ہو' قیادت اس کی باندی اور کنیز ہے۔ وہ عوامی تحریکوں کے ذریعے مقبول رہنما بننا چاہتے تھے۔ انہیں منصوبہ بندی پر بھی مہارت حاصل تھی اور وہ بھارت کے واحد غیر متنازع رہنما بننے کے لئے جچے تلے قدم اٹھا رہے تھے۔ انسانی نفسیات کے گہرے مطالعے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ پہلا مقام حاصل کرنے کے لئے انہیں سیاست میں مذہب کا رنگ شامل کرنا ہو گا۔ ان کا طرز زندگی اور نیم برہنگی اسی سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ تھی۔ ہندوستان واپسی کے چار

پانچ برس بعد انہوں نے عملی سیاست میں سرگرم حصہ لینے کی بجائے اپنا وقت عوام سے تعلقات استوار کرنے میں گزارے۔ یاد رہے کہ انڈین نیشنل کانگریس مغربی نظریات اور برطانوی لبرل ازم کی بنیاد پر قائم تھی۔ لاک، ہیوم، برک، مورے اور مل کے لبرل سیاسی خیالات کانگریس کے سابق رہنماؤں کا اثاثہ تھے۔ جناح کہا کرتے تھے کہ برطانوی لبرل ازم ان کی زندگی کا حصہ ہے لیکن ہندوستان کے ناخواندہ عوام ان جدید سیاسی نظریات سے یکسر بے بہرہ تھے اسی لئے کانگریس اب تک عوامی جماعت نہ بن پائی تھی۔ گاندھی جی نے ان رہنماؤں کے مغربی خیالات، پر شدید اعتراض کیا۔ وہ ہندوستانی سیاست میں ہندوستانیت کا رنگ دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے عوام کے ساتھ اپنا ناطہ جوڑ کر دیگر رہنماؤں کے لئے مثال بننے کی کامیاب کوشش کی۔ انہوں نے خود کو عوام کی زندگی، مسائل، جذبات اور تمناؤں کے ساتھ وابستہ کر لیا۔ عوام سے خطاب یا گفتگو کے دوران وہ کسی مفکر مغرب یا انگریز دانشور کا تذکرہ تک نہ کرتے تھے بلکہ رامائن، مہابھارت، اپنیشد اور رام راج ان کی بات چیت کا محور رہتے۔ عوام سے اپنا رشتہ پکا کر کے انہوں نے نہ صرف اپنی پوزیشن ہندوستان کی سیاست میں بے حد مضبوط کر لی بلکہ عوامی شعور میں بھی اس قدر بیداری پیدا کی جو کبھی پہلے دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ وہ مہاتما کے مقام پر پہنچ چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عوام نے ہمیشہ گاندھی جی کی آواز پر لبیک کہا کیونکہ وہ محسوس کرتے تھے کہ رہنما ان کے اپنے درمیان سے اٹھا ہے اور ان کے دل کی آواز بلند کر رہا ہے۔ عوام کی عطا کردہ محبت، عزت اور عقیدت ہی گاندھی جی کی اصل طاقت تھی یہی وجہ ہے کہ آہستہ آہستہ وہ سیاسی رہنما بھی ان کا لوہا ماننے پر مجبور ہو گئے جو تعلیمی میدان اور ذہنی صلاحیتوں کے اعتبار سے ان سے بہت آگے تھے۔ ان رہنماؤں کو بھی گاندھی جی کو اپنا گرو تسلیم کرنا پڑا اور متعدد مرتبہ وہ ان کی رائے ماننے کے پابند ہوئے کیونکہ اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہ تھا۔ ان رہنماؤں میں سرفہرست پنڈت موتی لال نہرو تھے جنہوں نے ستمبر ۱۹۲۰ء میں کانگریس کے اجلاس کلکتہ میں گاندھی جی کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے اور ان کی تحریک عدم

تعاون کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ دوسری نامور شخصیت ولبھ بھائی پٹیل کی بھی جو ابھی سردار پٹیل کے نام سے معروف نہ ہوئے تھے۔ پٹیل احمد آباد کے نامی وکیل تھے جنہوں نے گاندھی جی کے خیالات کو منظم عملی جامہ پہنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ تاہم ولبھ بھائی کی شہرت ابھی احمد آباد ہی تک محدود تھی جب کہ موتی لال نہرو کو پورا ہندوستان جانتا تھا۔ انہیں صحیح معنوں میں گاندھی جی کے نظریات کا مبلغ کہا جا سکتا ہے۔ گاندھی جی کو شاندار ترین کامیابی اس وقت حاصل ہوئی جب موتی لال کا اعلیٰ تعلیم یافتہ دانشور بیٹا جواہر لال نہرو ان کا رفیق بن گیا۔

ہندو عوام تو پہلے ہی گاندھی جی کے سامنے سر تسلیم خم کر چکے تھے' خلافت کی تحریک نے مسلمانوں کو بھی ان کے قدموں میں لا ڈالا۔ جب دونوں فرقوں کا مذہبی جنون ان کے اشاروں پر ناچنے لگا تو وہ ہندوستانی سیاست کی ناقابل تسخیر ہستی بن گئے اور ملک میں گاندھی جی کا تسلط مکمل ہو گیا۔ جناح ان کے لئے بے کار تھے لیکن شوکت علی' محمد علی اور مولانا آزاد ان کے لئے بے حد کار آمد تھے۔ وہ مسز بیسنٹ کو بھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے حالانکہ انہوں نے اپنی پوری زندگی ہندوستان کی خدمت کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ اصول پرست اور مستقل مزاج سبھاش چندر بوس بھی گاندھی جی کے کسی کام کے نہ تھے' اس کے برعکس نرم خو ادر لچکدار جواہر لال نہرو ان کے لئے نہایت مفید ثابت ہو سکتے تھے۔ چنانچہ گاندھی جی نے جواہر لال کو عزت و مرتبت اور طاقت کے سنگھاسن پر فائز کرنے کے لئے ہر ممکن حربہ استعمال کیا بلکہ سبھاش چندر بوس کو تباہ کرنے کے لئے وقتی طور پر جواہر لال کے سامنے جھکنے سے بھی گریز نہیں کیا۔

یہاں پر چند جملے گاندھی جی کی کھدر پوشی اور چرخہ کاتنے کے متعلق کہنا ضروری ہیں۔ یہ ناٹک اتنا بے ضرر اور معصوم ہرگز نہ تھا جیسے ظاہر محسوس ہوتا ہے۔ گاندھی جی نے نہ صرف یہ پابندی عائد کر رکھی تھی کہ ہر رکن کانگریس کو کھدر پہننا ہو گی بلکہ انہوں نے یہ بھی لازمی قرار دے دیا کہ کانگریس کی رکنیت صرف اور صرف اسی شخص کو دی

جائے گی جو باقاعدگی سے اپنے ہاتھ سے چرخہ کاتتا ہو۔ ٹیگور نے اس شرط پر متحیر ہو کر گاندھی جی کو لکھا کہ چرخہ کاتنا ہندوستان کے دیہاتی عوام کے لئے آج بھی نہایت دلچسپ بلکہ مفید مشغلہ ہے لیکن شہری عوام اس سے آشنا نہیں ہیں۔ چنانچہ ان پر اس پابندی کا اطلاق مناسب نہیں۔ ان کے لئے یوں بھی چرخہ کاتنا وقت کا شدید زیاں ثابت ہو گا۔ ٹیگور نے گاندھی جی کی اس شرط پر حیرت کے ساتھ ساتھ گہرے احتجاج کا بھی اظہار کیا اور خاص طور پر وہ اس بات کو تو قطعاً" سمجھ نہ پائے کہ چرخہ کاتنے سے نابلد فرد کو محض اس بناء پر کانگریس کی رکنیت سے کیوں محروم رکھا جائے گا ٹیگور نے اس شرط کو آمرانہ اور فکر و عمل کی آزادی کے منافی قرار دیا۔ گاندھی جی نے اس کے جواب میں نہایت سختی سے ٹیگور کو لکھا۔

"میں ہر شاعر، مفکر اور دانشور کے لئے بھی اپنے ہاتھ سے چرخہ کاتنا فرض قرار دیتا ہوں۔"

ٹیگور نے گاندھی جی کے آشرم کو پہلی مرتبہ دیکھتے ہی مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کیا۔

"گاندھی جی کا آشرم سفید رنگ کا ویرانہ نظر آتا تھا۔ عمارت کی دیواروں' چادروں اور مکینوں کے کپڑوں الغرض ہر چیز کا رنگ سفید تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہاں بھی صحرائے عرب کی ریت سے اٹھنے والی جابرانہ' استبدادی اور آمرانہ سیاسی تہذیب فروغ پانے والی ہے۔ سفید رنگ جو کہ عدم رواداری کا رنگ ہے' گاندھی جی کے سیاسی "کلٹ" کی نمائندگی کر رہا تھا۔ گاندھی جی نے جو راستہ چنا ہے اس کے مضمرات سے ہم بچ نہ پائیں گے۔"

(از جے کار' صفحہ ۳۷۳)

گاندھی جی کا سفید کھدر کا ناٹک اور چرخہ کاتنے کا ڈرامہ محض لاکھوں مفلس انسانوں کو روزگار فراہم کرنے کا وسیلہ نہ تھا بلکہ ان کے عزائم میں اپنی شخصیت کے جال کو مزید

مضبوط بنانا شامل تھا۔ گاندھی کے آشرم میں ان پر "ایمان" لانے والے ان کا پیام دنیا کے کونے کونے میں پھیلانے کی ریہرسل کر رہے تھے۔ چرخہ کاتنے کا گھنٹہ اسی ریہرسل کا حصہ تھا۔ اس دوران گاندھی جی انہیں ضبط نفس اور اپنی سوچوں پر قابو پانے کی تلقین کرتے تھے۔ یہ گویا سکول میں برین واشنگ کا ایک پیریڈ تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ چرخے پر دھاگے کے ساتھ جولاہوں کے خیالات بھی گاندھی جی کی خواہشوں کے مطابق بنے جا رہے ہیں اور کپڑے پر وہی نمونے ابھر رہے ہیں جو گاندھی جی چاہتے ہیں۔ گاندھی جی نے اپنے پیروکاروں کے دماغوں پربھی اسی طرح قابو پالیا تھا کہ وہ انہی کے اشاروں پر جینے مرنے کے لئے تیار تھے۔ گاندھی جی کے ہزاروں کارکن کٹھ پتلیوں کی طرح ان کے احکامات پر عمل کرتے تھے اور وہ ان کے عدم تشدد کے لئے ہر قسم کا تشدد کر سکتے تھے۔

اپنے سیاسی کیریئر کے آغاز میں گاندھی جی حقیقتاً" جمہوریت پسند تھے اور کانگریس کو قوم کا ترجمان خیال کرتے تھے اور انہیں یقین تھا کہ یہاں ہر کسی کو اپنے خیالات کے اظہار کی اجازت ہے۔ پہلی مرتبہ جب انہوں نے اپنا عدم تعاون کا پروگرام کانگریس سے منوانا چاہا تو کہا۔

> "مجھے کہا جا رہا ہے کہ میں نقصان کے سوا اور کچھ نہیں کر رہا اور میری قرارداد ملک و قوم کی سیاسی زندگی کے لئے موت اور بربادی کا پیغام ہے۔ کانگریس کو میں ایک سخت گیر جماعت کے روپ میں نہیں دیکھنا چاہتا۔ اسے ہر مکتبہ فکر کے افراد کے لئے ایک کھلا پلیٹ فارم ہونا چاہئے جہاں پرہرکوئی اپنی رائے آزادی سے دے سکے اور کسی اقلیت کو اس جماعت کو چھوڑ کر جانے کی ضرورت نہ پڑے بلکہ اس کی رائے وقت آنے پر ملک کے لئے اتنی مفید ثابت ہو کہ وہ اقلیت سے بڑھ کر خود کو اکثریت میں بدل سکے۔"

(مہاتما از تندولکر جلد دوم، صفحہ ۱۲)

لیکن جمہوری نقطۂ نظر سے کامیابی اور عزت حاصل کرتے ہی گاندھی جی خود بہت

بڑے آمر بن گئے اور ان کی سب سے بڑی خواہش یہی ٹھہری کہ ہر اس شخص کو دھکے دلوا کر کانگریس سے نکال دیں جو ان کے نظریات کو عقیدت کی نگاہ نہ سے دیکھتا ہو۔ یہی وجہ تھی کہ کانگریس میں شمولیت اختیار کرنے والے ہر شخص کو سفید کھدر پہن کر اور چرخہ کات کر اس بات کا ثبوت دینا پڑتا تھا کہ وہ گاندھی جی کا سچا معتقد بلکہ "مومن" ہے۔

یہاں قارئین کی توجہ گاندھی جی کی ایک تقریر کی جانب مبذول کروانا بے حد دلچسپ رہے گا جو انہوں نے کانگریس کے رام گڑھ اجلاس میں ۱۹۴۰ء میں کی۔ یہ تقریر گاندھی جی کے بدلے ہوئے رجحان کا نکتہ آغاز تھی۔ یہاں انہوں نے خود کو میدان جنگ کا سپہ سالار فرض کر کے ہدایت دینے کی ابتداء کر دی تھی۔

"کانگریس محض ایک جمہوری تنظیم نہیں، کانگریس ایک عسکری تنظیم بھی ہے---- فوج کوئی جمہوری ادارہ نہیں ہوتی اس کے سپاہی رائے نہیں دیتے بلکہ جرنیل کا حکم مانتے ہیں۔ وہ چون و چرا نہیں کرتے۔ جرنیل کا حکم قانون کا درجہ رکھتا ہے۔ میں آپ کا جرنیل ہوں اور جب آپ نے مجھے اس منصب پر خود فائز کیا ہے تو میرے حکم کی تعمیل بھی آپ کا فرض ہے اس ضمن میں کوئی دلیل نہیں چلے گی، کوئی بھی لفظ "کیوں" کا استعمال نہیں کرے گا۔"

"میں یہ تجربہ آپ کی مدد سے کامیاب بنانا چاہتا ہوں کیونکہ اس سے صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ پوری دنیا سرفراز ہو گی----"

"ہر کانگریس کمیٹی کو ستیہ گرہ میں حصہ لینا ہو گا اور اس میں کانگریس کے ایک ایک رکن ہیں اپنے ہاتھ سے رجسٹر کروں گا جس کی لازمی شرط یہی ہو گی کہ وہ باقاعدگی سے نہ صرف چرخہ کاتے بلکہ کھدر کے سوا کوئی اور کپڑا پہننا حرام تصور کرے۔ ان نئے ارکان کو باقاعدگی سے آل انڈیا کانگریس کمیٹیوں کی شاخوں میں تربیت یافتہ افراد کی نگرانی میں کام کرنا ہو گا تاکہ اس بات کی کڑی جانچ پڑتال کی جا سکے کہ کسی بھی رکن نے کھدر کے علاوہ کوئی اور کپڑا تو نہیں پہنا۔" (کانگریس کی تاریخ از پٹہ بھائی سیتا رمیا، جلد دوم، صفحات

۷۵ - ۱۷۴)

گاندھی جی نے اپنے اس بلند و بالا خواب کے لئے بہت کچھ داؤ پر لگا رکھا تھا۔ وہ خود کو جولیس سیزر کے روپ میں دیکھا کرتے تھے۔ ان کا سپنا ہندوستان میں ایک مقدس گاندھی سلطنت کا قیام تھا جس کے وہ بلا شرکت غیرے پوپ بننا چاہتے تھے۔ واضح رہے کہ پوپ کا لفظی مفہوم بابا یا باپو ہی ہے۔ دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ کسی کے کہنے سے پہلے انہوں نے خود اپنے آپ کو باپو کہنا شروع کر دیا اور اپنے خطوط پر باپو کے نام سے دستخط کرنے لگے! اس سے ان کے آئندہ عزائم پر روشنی پڑتی ہے وہ نہ صرف جدید ہندوستان کے باپ بلکہ پوری دنیا کے جنم دیوتا کہلانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لئے ان پڑھ اور جنونی ہندو مسلم عوام کے مذہبی جذبات کا ان کے قابو میں ہونا بہت ضروری تھا کیونکہ برطانوی سرکار بھی اس شخص کے سامنے یقیناً بے بس ہوتی ہے جو ایک اشارہ ابرو سے عوام کے مذہبی تشدد کو بھڑکا سکتا تھا۔ اس شخص کا جبر یا جادو انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کر سکتا تھا۔ اس کام کے لئے انہوں نے اپنی کھدر پوش فوج باقاعدہ مزاحمت کے لئے بھی تیار کر رکھی تھی جن کے دماغوں اور ہاتھوں کی جنبش پر وہ چرخے کے پہیے کے ذریعے قابض ہو چکے تھے۔ ان کے حواریوں کا یہ دستہ ہندوستان میں ان کی پاپائیت کے قیام کے لئے مورچے سنبھال چکا تھا۔

ہندوستان میں اپنی مقدس سلطنت کے قیام کے بعد ان کا ارادہ اپنے مذہب اور اپنی ذات کو مزید فروغ دینے سے متعلق تھا۔ وہ پوری دنیا کو "حلقہ بگوش گاندھی ازم" دیکھنا چاہتے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں جب انہوں نے رابندر ناتھ ٹیگور کو مندرجہ ذیل خط لکھا تو حقیقتاً" ان کے ذہن میں یہی خیال جاگزیں تھا۔

"صرف میرے انکسار اور عجز نے مجھے روکے رکھا ورنہ میں اپنے گھر کی چھت پر چڑھ کر ببانگ دہل کہتا کہ عدم تعاون کا پروگرام صرف ہندوستان کے لئے نہیں پوری دنیا کے لئے ہے۔"

"ینگ انڈیا" میں ان کا مضمون ۱۲ جنوری ۱۹۲۸ء کو شائع ہوا جس میں وہ لکھتے ہیں۔

"میرا مقصد حصول ازادی سے کہیں بلند تر ہے۔ ہندوستان کے بعد میں روئے ارض کی دیگر غلام اقوام کو بھی آزاد دیکھنا چاہتا ہوں جو مغرب کے زیر تسلط کراہ رہی ہیں اور انہیں غلام بنانے والی استبدادی طاقتوں میں انگلستان سرفہرست ہے۔ اگر ہندوستان انگریزوں کے کلچر پر غالب آ جائے جس کی اس میں اہلیت بھی ہے تو یہ عالمی دولت مشترکہ کا اہم ترین رکن بن سکتا ہے۔ اس عالمی دولت مشترکہ میں انگلستان کی شمولیت پر بھی کوئی پابندی نہیں لگائی جائے گی۔ ہندوستان کو میں نے اس لئے اہم ترین رکن قرار دیا ہے کہ اس کی آبادی، رقبہ، جغرافیائی حیثیت اور تہذیب و ثقافت پوری دنیا سے زیادہ مضبوط اور عظیم الشان ہے۔ آج کے کمزور ہندوستان کے لئے یہ خواب یقیناً حقیقت سے بہت دور ہے کہ وہ نہ صرف خود آزاد دنیا کا مانا ہوا ملک بن جائے بلکہ غلام اقوام کی رہنمائی بھی کرے لیکن اب میں اس قندیل کی روشنی کو پھیلنے سے نہیں روک سکتا۔ میرا نصب العین اس قدر بلند ہے کہ اس کے لئے جینا اور مرنا دونوں سعادت ہیں۔"

(مہاتما از تندولکر، صفحہ ۳۲۷، جلد دوم)

آیئے دیکھیں کہ گاندھی جی ہندوستان کو کس قسم کا یوٹوپیایا آسمانی مملکت بنانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے ان خیالات کو ایک کتاب کی صورت میں مدون کیا جو "ہند سوراج" کے نام سے ۱۹۰۹ء ہی میں شائع ہو چکی تھی۔ اس کتاب کے چند اقتباسات پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

"یہ خیال غلط ہے کہ ہندوستان پر انگریز حکمرانی کر رہے ہیں در حقیقت آج پوری دنیا پر اس تہذیب جدید کی حکمرانی ہے جس کے مظاہر میں ریلوے، ٹیلی گراف، ٹیلی فون اور دیگر سائنسی ایجادات شامل ہیں۔ بمبئی، کلکتہ اور ہندوستان کے دیگر شہر بھی اس خیرہ کن

تمدن کے طاعون میں مبتلا ہو چکے ہیں لیکن اگر انگریز راج کو کل ہی بدل دیا جائے اور اس کی جگہ کوئی جدید حکومت بھی قائم کر دی جائے تو بھی ہندوستان کو عملاً کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ صرف کچھ دولت ضرور بچ جائے گی جو آج انگلستان منتقل ہو رہی ہے۔ جدید سیاسی نظام بھی ہندوستان کو یورپ یا امریکہ کو ایک درجہ دوم یا درجہ پنجم قوم ہی بنا سکتے ہیں۔

"جدید طبی علوم کو میں جادو ٹونے یا کالے علم سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتا۔ میڈیکل سائنس پر میں عطائیت کو آج بھی ترجیح دیتا ہوں۔ ہمارے دور کے ہسپتال دراصل شیطان کے کارخانے ہیں جن کے ذریعے وہ اپنی سیاہ سلطنت پر اپنی عمل داری برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ یہ ہسپتال برائی' بدکاری' مصائب اور حقیقی غلامی کے اڈے ہیں----- اگر ان ہسپتالوں میں ٹی بی یا جنسی امراض کا علاج نہ کیا جائے تو مجھے یقین ہے کہ ان بیماریوں ہی کا خاتمہ ہو جائے۔"

"ہندوستان کی نجات ہر اس چیز کو بھلا دینے میں مضمر ہے جو اس نے گزشتہ پچاس برس میں سیکھی۔ ہندوستان، کو اپنی بقاء کے لئے ریلوے' ٹیلی گراف' ہسپتالوں' ڈاکٹروں' وکیلوں الغرض ہر ایسی چیز سے اپنا دامن پاک کرنا ہو گا۔"

باب نمبر 11

کانگریس گاندھی جی کے تسلط میں ○ جناح کی کانگریس سے رخصتی (۱۹۲۰ء)

جب گاندھی جی نے یکم اگست ۱۹۲۰ء کو تحریک عدم تعاون کا باقاعدہ آغاز کیا تو کانگریس کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ گاندھی جی نے اس کی ابتداء کانگریس کی حمایت اور رسمی منظوری کے بغیر کی تھی جس پر پنڈت مدن موہن نے انہیں تنبیہہ بھی کی جس کے جواب میں گاندھی جی نے کہا۔

"زندگی کے کچھ لحات ایسے بھی ہوتے ہیں جب آپ کے پاس سوائے عمل کے اور کوئی چارہ نہیں رہتا' ایسے مواقع پر آپ اپنے بہترین دوستوں کو بھی اپنے ساتھ نہیں ملا سکتے۔ جب بھی آپ کے اندر فرض اور قانون کے درمیان کوئی آویزش ہو تو اس میں حتمی فیصلہ بھی آپ کے اندر کی آواز ہی کر سکتی ہے۔ جب کسی کو اپنی پالیسی اور عمل پر اٹل یقین ہو تو اسے کانگریس کی منظوری کی ضرورت نہیں رہتی۔ ایسے مواقع پر ایسی ہدایات کا انتظار حماقت سے کم نہیں ہوتا۔"

(مہاتما از تندولکر' جلد دوم صفحہ ۲)

لیکن ساتھ ہی گاندھی جی کو یہ فکر و امنگیر ہو گیا کہ کانگریس کو بھی ان کے عدم تعاون پروگرام پر عمل کرنا چاہئے۔ لیکن جیسا منصوبہ انہوں نے پیش کیا تھا اس سے بہت سے لوگوں کو اختلاف تھا۔ سکولوں کالجوں اور کونسلوں کا بائیکاٹ کسی کی نظر میں بھی پسندیدہ نہ تھا۔ بنگال اور مہاراشٹر کے سیاستدانوں نے اس تحریک پر سرے سے کوئی توجہ نہیں دی۔ ستمبر ۱۹۲۰ء میں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے اپنے اپنے اجلاس کلکتہ میں منعقد کیے جن میں گاندھی جی کے منصوبے پر غور کیا گیا۔ جناح کی انتھک کوششوں کے

نتیجے میں دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کے اجلاس ایک ہی جگہ اور ایک ہی وقت پر ہوئے تاکہ ملکی صورتحال سے تبرد آزما ہونے کے لئے مشترکہ لائحہ عمل تیار کیا جا سکے۔ لیکن گاندھی جی کو اپنے عدم تعاون کے پروگرام کے علاوہ اور کسی چیز سے سروکار نہ تھا اور انہوں نے کانگریس کی نشست کو بھی اسی مقصد کے لئے استعمال کیا۔ کانگریس کے اس اجلاس کی صدارت لالہ لاجپت رائے نے کی اور اس میں گاندھی جی نے ذاتی طور پر تحریک عدم تعاون کی قرارداد پیش کی۔ انہوں نے کہا کہ کانگریس کو ان کی عدم تعاون اور عدم تشدد کی تحریکوں کا بھرپور ساتھ دینے کے لئے سرکار کی جانب سے عطا کردہ خطابات واپس کرنے کے علاوہ حکومت کا تہرہ بائیکاٹ کرنا چاہئے۔ اسے تہرے بائیکاٹ میں مجالس قانون ساز' عدالتیں اور تعلیمی ادارے شامل تھے۔ تحریک کے آخری مرحلے میں انہوں نے ٹیکسوں کی عدم ادائیگی پر زور دیا۔ انہوں نے سامعین کے جذبات میں ہلچل مچا دی اور نہایت واشگاف الفاظ میں اعلان کیا کہ "اگر آپ نے میری سکیم پر پوری طرح عمل کیا تو میں یقین دلاتا ہوں کہ ایک برس کے اندر آپ سوراج حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

(تندولکر' جلد دوم صفحہ ۱۲)

گاندھی جی کو سب سے زیادہ پرجوش حمایت موتی لال نہرو کی جانب سے حاصل ہوئی جب کہ سیاستدانوں کے ایک نہایت طاقتور گروپ نے ان کی کھل کر مخالفت کی جن کی قیادت سی آر داس کر رہے تھے۔ اگرچہ پارٹی کے معمر اور سوجھ بوجھ رکھنے والے ارکان گاندھی جی کے حامی نہ تھے پھر بھی گاندھی جی اکثریت کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے ۲۷۲۸ ووٹوں میں سے ۱۸۵۵ ووٹ حاصل کئے۔

جناح نے بھی گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون سے اختلاف کیا وہ احتیاط اور ضبط و تحمل کے حق میں تھے۔ گاندھی جی نے سامعین کے مذہبی جذبات کو بھڑکایا اور خصوصاً مسلمان سامعین کو مخاطب کر کے کہا۔

"یہ ایک مذہبی ذمہ داری ہے اور از روئے اسلام بھی مسلمانوں پر جائز نہیں کہ وہ کونسلوں میں جا کر حلف وفاداری لیں۔ یہاں سال بہ سال اکٹھے ہونے والے عملی سیاستدانوں کو بھی یہ امر فراموش نہیں کرنا چاہئے"

سب سے حیرت انگیز بلکہ افسوسناک بات یہ ہے کہ جناح کے سوا تمام مسلم شرکاء نے گاندھی جی کے حق میں ووٹ دیئے۔ جناح کو ان کے آئینی راستے سے کوئی نہیں ہٹا سکا اپنے ہم مذہبوں میں عدم مقبولیت کا خوف بھی ان کی راہ میں حائل نہیں ہو سکا۔

(تندولکر، جلد دوم، صفحہ ۴۳)

رائے شماری میں اکثریت حاصل کرنے کے بعد گاندھی جی نے سرشاری کے عالم میں کہا۔

ووٹوں کے تجزیے سے ظاہر ہوتا ہے کہ پورا ملک عدم تعاون کے حق میں ہے۔ اکثریت نے اپنے کندھوں پر زبردست ذمہ داری کا بوجھ اٹھایا ہے۔ ہر فرد نے میرے حق میں ووٹ دے کر خود کو ایک عہد کا پابند کر لیا ہے۔ اگر وہ بچوں کا باپ ہے تو اسے اپنے بچے فوراً سرکاری سکولوں اور کالجوں سے اٹھوا لینے چاہئیں۔ میرا وہ ووٹر جو وکیل ہے اسے عدالت میں پریکٹس ترک کر کے اپنے موکلوں کے جھگڑے ذاتی حیثیت میں سلجھانے چاہئیں ---- ہر وہ فرد جس نے میرے حق میں ووٹ دیا ہے اسے ہاتھ سے دھاگا کاتنے اور چرخہ بننے کی جانب راغب ہونا چاہئے اور صرف کھڈی کا بنا ہوا کھدر پہننا چاہئے۔"

"عدم تعاون کے تمام مراحل پورے کرنے کے لئے میں سارا زور وکیلوں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے پر ہی نہیں دوں گا۔ میری امیدوں کا اصل محور عوام ہیں اور عدم تعاون کے آخری مراحل کی تکمیل انہیں ہی کرنی ہے"

جب گاندھی نے عدم تعاون کے منصوبے کو عملی جامہ پہنایا تو رابندر ناتھ ٹیگور ملک سے باہر تھے۔ وہ عدم تعاون کے بیشتر نکات سے سخت غیر مطمئن تھے۔ یورپ میں انہیں

ملک کے حالات سے آگاہی ہوتی رہی تھی جس سے شدید مضطرب ہو کر انہوں نے گاندھی جی کو مندرجہ ذیل خط لکھا۔

"ہمیں ان تمام اخلاقی قوتوں کی ضرورت ہے جن کی نمائندگی گاندھی جی کر رہے ہیں اور پوری دنیا میں صرف وہی کر سکتے ہیں لیکن اخلاقی طاقت کو تخریبی طاقت بنا دینا صریحاً مجرمانہ ہے۔ میں ہندوستان کے عوام کو عدم تعاون کی بجائے تعاون پر آمادہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اتحاد سچائی اور نفاق جھوٹ ہے اور اتحاد منفی ہتھکنڈوں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ عوام ----- کو مغرب سے متنفر کرنے کی حالیہ کوششیں روحانی خودکشی کے مترادف ہیں۔ ہمارا دور مغربی فلسفے کا دور ہے کیونکہ اس نے انسانیت کو ایک مشن دیا ہے۔ ہم اہل مشرق کو مغرب سے سیکھنا چاہیے۔ کوئی قوم دنیا بھر سے کٹ کر ترقی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔"

(تندولکر، جلد دوم، صفحہ ۴۴)

گاندھی جی نے اسی کتاب کے صفحہ ۴۵ پر جواب دیا ہے۔

"ہماری موجودہ جدوجہد یکطرفہ آمریت اور جبر کے خلاف ہے یہ استحصال کے ان جدید ذرائع کے خلاف ہے جنہیں آج تہذیب کا نام دیا گیا ہے۔ فالتو جڑی بوٹیوں کو چھانٹ دینا بھی اچھی فصل کے لئے بے حد ضروری ہے۔"

کانگریس کا اجلاس کلکتہ جو ستمبر میں منعقد ہوا اس لیے بھی خصوصی اہمیت کا حامل تھا کہ اس میں گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون کی کامیابی یا ناکامی کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا گیا۔ دسمبر ۱۹۲۰ء میں ناگپور میں کانگریس کا باقاعدہ اجلاس ہوا۔ اس موقعے پر گاندھی جی کی قرارداد سے بہت جوش و خروش پیدا ہوا۔ اجلاس میں مندوبین کی ریکارڈ تعداد نے شرکت کی اگرچہ کانگریس کے منتخب صدر سی وجے رگھوا چاریہ اور سابق صدر لالہ لاجپت رائے نے اس پر نیم گرمجوشانہ رد عمل کا اظہار کیا۔ مہاراشٹر کے سیاستدانوں نے اس کی زبردست مخالفت کی اور اس کی مذمت میں جی ایس کھاپڑے نے ایک مطبوعہ منشور جاری

کیا جس کے مصنف لوک منیا تلک تھے۔ جنہوں نے کانگریس ڈیموکریٹک پارٹی بھی قائم کی تھی۔ سی آر داس تو باقاعدہ گاندھی جی سے دو دو ہاتھ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن اچانک انہوں نے قلابازی کھائی اور گاندھی جی کے حامی بن گئے۔ سی آر داس کے ہتھیار ڈالنے سے یوں محسوس ہونے لگا جیسے گاندھی جی نے میدان مار لیا ہے اور اب ان کی قرارداد کسی کی مزاحمت کے بغیر تالیوں کی گونج میں منظور ہو جائے گی۔ لیکن نہیں! آہنی اعصاب کا مالک ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے ببانگ دہل قرارداد کی مخالفت کا اعلان کیا۔ یہ شخص محمد علی جناح کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔ یہ شخص دادا بھائی نوروجی اور گوپال کرشن گوکھلے کی شاندار اور باوقار کانگریس کی عمدہ روایات کا امین اور محافظ تھا۔ وہ کانگریس کی ایسی بربادی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جب محمد علی جناح نے اپنی جراتمندانہ تقریر میں مسٹر گاندھی اور مسٹر محمد علی جیسے الفاظ استعمال کیے تو مجمع میں اشتعال کی لہر دوڑ گئی۔ لوگوں نے چلا چلا کر جناح سے کہا کہ وہ گاندھی جی کو مہاتما گاندھی اور محمد علی جوہر کو مولانا کہہ کر مخاطب کریں۔ جناح نے باآواز بلند یہ مطالبہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

یہ کانگریس کا آخری اجلاس تھا جس میں جناح نے باقاعدگی سے شرکت کی۔ جواہر لال نہرو بھانپ گئے کہ آئندہ جناح کو وہ اس پلیٹ فارم پر نہیں دیکھ سکیں گے۔ کانگریس سے جناح کی رخصتی کو انہوں نے مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے۔

> "اجلاس کلکتہ کے بعد چند پرانے اور موثر ارکان نے کانگریس چھوڑ دی جن میں سب سے نامور اور مقبول مسٹر ایم اے جناح تھے۔ جنہیں سروجنی نائیڈو سفیر ہندو مسلم اتحاد کہا کرتی تھیں جناح نے ماضی میں مسلم لیگ اور کانگریس کو قریب تر لانے میں بے حد ذمہ دارانہ کردار ادا کیا۔ لیکن کانگریس میں ہونے والی حالیہ تبدیلیاں انہیں پسند نہ تھیں۔ انہوں نے عدم تعاون کے پروگرام اور کانگریس کے نئے آئین کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا۔ ان کے اختلافات سیاسی بنیاد پر تھے --- وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے تبدیلیوں کو قبول نہ کر سکے۔ ان

کی طبیعت مکمل طور پر عوامی نہ تھی اس لئے وہ کھدر پوش ہجوم میں خود کو بالکل اجنبی محسوس کر رہے تھے جو ہندوستانی زبانوں میں تقریریں کر رہا تھا۔ عوام کے جوش و خروش کو انہوں نے "موب ہسٹریا" (اجتماعی پاگل پن) قرار دیا۔"

گاندھی جی کی کانگریس کے انتہا پسندانہ انداز نے لبرل ارکان کو خوفزدہ کر دیا تھا۔ شری نواس شاستری نے اپنے کھلے خط میں لکھا ہے۔

"اپنے متعدد پارٹی ساتھیوں سے بات چیت کے باوجود میں کانگریس کے تمام اجلاسوں میں حتی الامکان شرکت کرتا رہا۔ پھر بھی مجھے پے در پے دل شکن تجربات ہوتے رہے۔ ۱۹۱۸ء کے بعد سال بہ سال کانگریس کے معیار گرنے لگا۔ ہر اگلے اجلاس میں پچھلے اجلاس سے بڑھ کر ناقابل عمل پروگرام اور عقل سے پیدل تجاویز پیش کی جاتیں۔ حکومت کی مخالفت میں ہر حد پھلانگ جانے کے مشورے دیے جاتے۔ جب تک امید کی آخری کرن بھی باقی تھی ہم اپنے ہم وطنوں کو اس راہ کے مضمرات سے آگاہ کرتے رہے جس پر وہ سوچے سمجھے بغیر گامزن تھے۔ لیکن تحریک عدم تعاون کے آغاز کے بعد کانگریس کی رکنیت جاری رکھنے کا کوئی جواز باقی نہ رہا۔"

(مہاتما از تندولکر، جلد دوم، صفحہ ۳۱)

گاندھی جی نے جناح سے بھی تحریک عدم تعاون کی حمایت کرنے کی درخواست کی جس کے جواب میں جناح نے کہا۔

"آپ نے ہندوستان کی حیات نو میں شرکت کے لئے مجھ سے جو درخواست کی ہے اس کے لئے میں تہہ دل سے آپ کا شکر گزار ہوں۔ لیکن نئی زندگی سے اگر آپ کی مراد آپ کا پروگرام اور لائحہ عمل ہے تو میں معافی چاہتا ہوں کہ میں انہیں قبول نہیں کر سکتا۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ میں آپ کے

منصوبے کے لئے ناکامی کا باعث بن سکتا ہوں۔ آپ کے خیالات نے اب تک ہر اس ادارے میں منافرت اور مناقشت پیدا کی جہاں جہاں یہ پہنچے اور ملک کی عوامی و قومی زندگی کو زک پہنچائی ----- آپ کے انتہا پسندانہ خیالات کو صرف ناتجربہ کار نوجوانوں اور ناخواندہ و پسماندہ افراد نے پذیرائی بخشی ہے۔ جس سے ہر جگہ بدنظمی اور انتشار پھیلا۔ اس کے آئندہ نتائج کیا ہوں گے میں سوچنے ہی سے کانپ اٹھتا ہوں"

(جناح از ایم۔ایچ۔ایس، صفحات ۲۶۵۔۲۶۴)

باب نمبر 12

گاندھی جی کی جانب سے طالب علموں کو ترک تعلیم کی دعوت ○ جناح اور ٹیگور کا شدید احتجاج (۲۱-۱۹۲۰ء)

تحریک عدم تعاون کا بنیادی مقصد حکومت کو مفلوج کرنا تھا۔ سرکاری سرگرمیوں کے اہم مراکز سکول، کالج اور عدالتیں تھیں جن کے مکمل بائیکاٹ کا گاندھی جی نے حکم دیا تھا۔ ان کا فرمان تھا کہ سرکار برطانیہ کے زیر اہتمام چلنے والے سکولوں اور کالجوں کی تعلیم سے غلامانہ ذہنیت پیدا ہو رہی ہے چنانچہ ان کا خاتمہ اشد ضروری ہے۔ مزید براں تباہی اور تخریب کا عمل پہلے مکمل ہونا چاہئے تاکہ بعد میں پوری طرح تعمیر نو کی جا سکے۔ انہوں نے کہا کہ سکولوں اور کالجوں کو ہر حال میں خالی کر دینا چاہئے۔ طلباء و طالبات کے لئے ایسی زہریلی غیر ملکی تعلیم سے بیکار رہنا بہتر ہے۔ (بے کار، صفحہ ۳۶۹) گاندھی جی کی بدترین حرکتوں میں سے ایک طلباء کے جذبات کو بھڑکانا اور ان کی عزت نفس کے تصور کو غلط رنگ دینا تھا۔

(بے کار، صفحہ ۳۶۹)

گاندھی جی کی تقریریں طلباء پر سم قاتل بن کر اثر انداز ہوئیں اور ہزاروں بلکہ لاکھوں طلباء نے سلسلہ تعلیم ترک کر کے گلیوں میں آوارہ پھرنا شروع کر دیا۔ ان کے ذہن میں حب الوطنی کے تصورات نہایت غیر واضح اور موہوم تھے بس وہ گاندھی جی کے حکم پر دیش بھگتی کر رہے تھے۔ لیکن کلکتہ میں ایک شخص گاندھی جی کے ان منفی عزائم کی راہ میں چٹان بن کر کھڑا ہو گیا۔ یہ شیر بنگال سر اسوتوش مکرجی تھے جو اس دور میں کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ بنگال اور اس کے نوجوان سر اسوتوش کی یاد کو کبھی فراموش نہ کر پائیں گے جنہوں نے اس خطے کو تعلیمی تباہی سے بچا لیا۔ سر اسوتوش چند

برس بعد ۱۹۲۴ء میں انتقال کر گئے۔ ان کی موت بنگالیوں کے لئے بہت بڑا صدمہ تھا

اس ضمن میں جناح نے بھی گاندھی جی کے مقابلے میں کڑی مزاحمت کی۔ جناح تحریک عدم تعاون کے سلسلے میں طلباء کے استعمال پر بے حد بے چین ہوئے۔ ناگپور کے اجلاس میں مشتعل ہجوم نے جناح کو اپنی تقریر پوری نہ کرنے دی تاہم انہوں نے اس تحریک پر اپنے خیالات کا کھل کر اظہار فرگوسن کالج پونا میں کیا جس میں انہوں نے اس تحریک کے منفی پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور اس میں طلباء کے غلط استعمال کی سخت مذمت کی۔ یہ تقریب گوکھلے کی چھٹی برس کے موقع پر ہوئی۔ جناح گوکھلے کا بے حد احترام کرتے تھے اور ان کی برسی کی تقریبات میں ضرور شرکت کرتے تھے۔ اس تقریب میں بھی انہوں نے یہی کہا کہ وہ گاندھی جی کی بے حد عزت کرتے ہیں لیکن انہیں یقین ہے کہ تحریک عدم تعاون کا تعلیمی و سیاسی پہلو ملک و قوم کے لئے ہر اعتبار سے ہلاکت اور تباہی کا باعث بنے گا۔ ان کا خیال تھا کہ اس موقع پر صحیح سیاسی نظریات پر مبنی خالصتاً سیاسی تحریک چلائی جانی چاہئے جو ہر شخص کے جذبہ حب الوطنی سے مطابقت رکھتی ہو۔ جب تک ہندوستانی سیاست نے صحیح راستہ اختیار نہ کیا اس کا گمراہ ہونا لازم ہے۔ انہوں نے گاندھی جی اور ان کے پیروکاروں کے متعلق کہا کہ وہ جذباتی اور روحانی ذرائع سے سیاست کا میدان مارنا چاہتے ہیں۔ لیکن سیاست میں کام محض سیاسی ذرائع ہی سے کام چل سکتا ہے۔ گاندھی جی اور ان کے حواری انسان کی حقیقی سرشت کو نظرانداز کر بیٹھے ہیں۔ حالانکہ انسان صرف انسان ہوتا ہے اسے فرشتہ فرض کر لینے سے بڑی کوئی حماقت نہیں۔ جناح نے طالب علموں سے پوچھا کہ انہوں نے گاندھی جی کی ہدایت پر سکول اور کالج تو چھوڑ دیے ہیں اب ان کا کیا ارادہ ہے؟ گاندھی جی ان ہزاروں بے کار طلباء سے روزانہ پانچ پانچ گھنٹے چرخہ کتواتے تھے اور اگر ان میں کچھ ہمت اور سکت باقی رہتی تو انہیں ہندی سکھائی جاتی۔۔ کیا اس سے بڑھ کر نوجوانوں کے کیریئر کی تباہی کسی طرح ممکن تھی؟ اس سے بڑھ کر بھی ممکن تھی وہ اس طرح کہ گاندھی جی نے نوجوانوں کو شہر چھوڑ کر دیہات کا

رخ اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ جناح نے پوچھا کہ نوجوان دیہات مین کیا کریں گے؟ مجمع میں سے ایک نوجوان نے کہا کہ وہ دیہات جا کر دیہاتیوں کو پڑھائیں گے جس پر جناح نے اسے مخاطب کر کے کہا' جوان دیہاتی عوام ہر چیز آپ سے بہتر جانتے ہیں. جبکہ گاندھی جی کا کہنا تھا کہ میرا ذاتی تجربہ ثابت کرتا ہے کہ تعلیم کسی کے اخلاقی مرتبے میں ایک انچ کا بھی اضافہ نہیں کرتی۔ ٹیگور کے اعتراض کے جواب میں انہوں نے کہا کہ

میرا ذاتی تجربہ ثابت کرتا ہے کہ تعلیم کسی کے اخلاقی مرتبے میں ایک انچ کا بھی اضافہ نہیں کرتی۔

"دراصل ٹیگور کبھی بھی میرے نظریہ عدم تعاون کے حامی نہیں رہے یہی وجہ ہے کہ آج وہ طلباء کی سرگرمیوں کے متعلق اتنے پریشان ہیں۔ ان کا یہ شور و غوغا ان کے سابق خیالات ہی کی ایک کڑی ہے۔ .لیکن فالتو جڑی بوٹیوں کو چھانٹ دینا بھی زراعت کا سنہری اصول ہے۔

اگر ہندوستان کو شاعر کے خوابوں کا سوراج حاصل کرنا ہے تو وہ جان لے کہ اس کا واحد طریقہ عدم تشدد اور عدم تعاون ہے۔"

(مہاتما گاندھی کے نظریات از ریورنڈ سی الیف اینڈریوز صفحات ۶۸-۲۶۶)

گاندھی نے نے اپنی (خود نوشت) سوانح عمری کے لئے نہایت خوشنما ٹائیٹل کا انتخاب کیا "صداقت کے ساتھ میرے تجربات" انہوں نے اپنے بیٹوں کو بھی اپنے تجربات کا نشانہ بنایا۔ انہیں بھی سکول کی تعلیم سے محروم رکھا گیا کیونکہ گاندھی جی سکول کی تعلیم کو بے حد ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ گھر کی باضابطہ تعلیم سکول کی تعلیم سے بہتر ہوتی ہے۔ گاندھی جی کہتے ہیں۔

میرے اکثر دوست مجھ سے پوچھتے ہیں کہ اگر میں اپنے بیٹوں کو سکول کی تعلیم دلوا دیتا تو اس میں کیا حرج تھا؟ مجھے ان کے پر اس طرح کتر دینے کا کیا حق تھا؟ میں ان کے

ڈگریاں لینے اور اعلیٰ کیریئر بنانے کی راہ میں کیوں حائل ہوا؟"

ان سوالات کے جواب گاندھی جی نے اس طرح دیئے ہیں۔

"اگر میں اپنے بیٹوں کو پبلک سکولوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیج دیتا تو میری رائے میں وہ اس تعلیم سے محروم رہ جاتے جو تجربے اور والدین کے ساتھ مستقل تعلق رکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اگر میں انہیں مصنوعی قسم کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے برطانیہ یا جنوبی افریقہ بھیج دیتا تو مستقل فکر میں مبتلا رہتا۔ بچے بھی مجھ سے جدا رہتے اور وہ سادگی اور جذبہ خدمت کبھی نہ سیکھ سکتے جو آج ان کی زندگی کا حصہ ہے۔ اگر یہ رسمی تعلیم حاصل کرتے تو میرے سیاسی اور عوامی کام پر بھی بہت منفی اثر پڑتا....."

گاندھی جی نے اس ضمن میں اپنی سوانح عمری میں مندرجہ ذیل دلچسپ پیراگراف بھی لکھا ہے۔

وہ نوجوان جنہیں میں نے ۱۹۲۰ میں غلامی کی زنجیریں توڑ دینے کا درس دیا تھا اور جنہوں نے میرے کہنے پر سکول اور کالج چھوڑ دیئے تھے وہ آج میری حقانیت کا ثبوت اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ میرا اس دن کی طرح آج بھی عقیدہ ہے کہ آزادی کی خاطر پتھر توڑنا غلامی کی زنجیروں میں بندھے رہنے کے لئے تعلیم حاصل کرنے سے کہیں بہتر ہے"

بمبئی ہائی کورٹ کے مایہ ناز قانون دان جے کار ان دنوں گاندھی جی کے سخت متوالے تھے۔ اپنی تمام تر عقلیت پسندی کے باوجود وہ گاندھی کی تحریک کے زبردست حامی رہے۔ وہ خلوص دل سے کوئی تعمیری کام کرنا چاہتے تھے اور بمبئی میں انگریزوں کے قائم کردہ اعلیٰ درجے کے کالجوں کے مقابلے میں معیاری ہندوستانی کالج قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس کا نام انہوں نے نیشنل کالج تجویز کیا۔ گاندھی جی نے اس مقصد کے لئے انہیں ایک لاکھ روپیہ دینے کا وعدہ بھی کیا۔ چوئی رام گڈوانی' گاندھی جی کے نہایت معتمد پیام بر تھے۔ وہ ان کا پیغام لے کر جے کار کے پاس پہنچے اور کہا "اگر آپ کالج کی تعمیر کے لئے

گاندھی جی کی مدد چاہتے ہیں تو آپ کو مندرجہ ذیل شرائط پوری کرنا ہوں گی۔

و۔ طلباء و طالبات کرسیوں اور بینچوں کی بجائے ٹاٹوں پر بیٹھیں گے۔

ب۔ انہیں روزانہ ۴ گھنٹے چرخہ کاتنا ہو گا۔

ج۔ ہفتہ وار چھٹی انہیں گاؤں میں گزارنی ہو گی جہاں وہ دو کتابوں کی بنیاد پر عدم تعاون کا پیغام عام کریں۔

(i) مینزینی کی کتاب ''گاری بلدی کی زندگی''

(ii) تحریک عدم تعاون کے فلسفے پر فیز بروک وے کی کتاب۔

جے کار نے جواب دیا۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ بمبئی کے گرد و نواح میں کوئی دیہات نہیں ہیں۔ دوسری یہ کہ ٹاٹ بمبئی کے ماحول سے میل نہیں کھاتے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس انتہاپسندی کی کیا منطق ہے؟ یاد رکھیں کہ ہم بمبئی کے اعلیٰ ترین کالجوں سے مقابلہ کرنا چاہتے ہیں جن میں ایلفنسٹن، ولسن اور سینٹ زیویر شامل ہیں۔ پارسی اور مسلمان بمبئی کی آبادی کا بڑا حصہ ہیں جو گاندھی جی کا مذہب ماننے کے پابند نہیں ہیں چنانچہ وہ اپنے بچے میرے کالج میں کیوں بھیجیں گے؟ اگر مجھے کامیابی حاصل کرنی ہے تو مجھے بھی اپنے کالج کا ماحول اور معیار دوسرے کالجوں کے برابر رکھنا ہو گا۔ ہاں طریقہ تدریس کے مختلف ہونے پر غور ہو سکتا ہے۔ مجھے اس بات پر بھی تعجب ہے آخر کالج کے فرنیچر یا بیٹھنے کے انتظامات پر اس قدر زور کیوں دیا جا رہا ہے؟ رہی بات روزانہ ۳ یا ۴ گھنٹے چرخہ کاتنے کی تو وہ بھی ناممکن ہے۔ اپنے موجودہ ٹائم ٹیبل میں، میں زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ چرخہ کاتنے کی حامی بھر سکتا ہوں۔ جہاں تک طلباء کا ہر ہفتے دیہات جا کر پڑھانے کا تعلق ہے تو یقیناً ان کے والدین اس بات کی اجازت نہیں دیں گے۔ معصوم بچوں کو سیاست کے خارزار میں دھکیلنے کا کیا مقصد ہے؟ انہیں ۱۵ روز کے اندر اندر ہی گرفتار کر کے جیل بھیج دیا جائے گا۔ والدین اپنے بچوں کو اس لئے تعلیمی اداروں میں نہیں بھیجتے کہ وہ سیاسی تقریریں کر کے

جیل چلے جائیں۔ سیاست آپ جیسے منجھے ہوئے سیاستدانوں کو کرنی چاہئے، کم عمر، ناپختہ اور ناتجربہ کار نوجوانوں کو اس میں کیوں دھکیلتے ہیں؟

اس پر گڈوانی نے جواب دیا کہ یہ شرائط حتمی ہیں ان میں کوئی تبدیلی ناممکن ہے اور اگر جے کار کو انہیں قبول کرنے میں کوئی تامل ہے تو انہیں کانگریس کی طرف سے ایک پائی بھی نہیں ملے گی۔ جے کار اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

"اس جواب کے بعد مزید گفتگو کی گنجائش ہی نہ رہی حتیٰ کہ ہفتہ ۲۹ جنوری کو گڈوانی سے آخری مکالمہ ہوا جس کے بعد مجوزہ کالج کا منصوبہ ختم ہو گیا جو ایک حقیقی صدمہ تھا۔ گاندھی جی کے علاوہ بمبئی کے دیگر ممتاز اراکین کانگریس نے بھی زبردست فکری قلابازی لگائی تھی۔ ان کے اصلی خیالات بالکل بدل چکے تھے۔ میرے لئے ان کی تمام شرائط سے سمجھوتہ کرنا ناممکن تھا۔ اگر میں ان کے خیالات پر عمل کرتا تو بمبئی میں اعلیٰ تعلیمی اداروں کے معیار کے مطابق کوئی کالج قائم کرنا قطعاً ناممکن ہو جاتا۔ گاندھی جی کے افکار کا ادارہ بمبئی میں ہر گز نہ چل سکتا۔ میں نے اس کے پیش نظر اپنی آزادانہ رائے کو ترجیح دی کیونکہ میں ایسے لوگوں کی پیروی یکسر غیر ضروری خیال کرتا تھا جنہیں معیاری تعلیمی ماحول کی کوئی سوجھ بوجھ نہ ہو۔ ایسی شرائط کو ماننے کا مطلب اپنے منصوبے کو خاک میں ملانا تھا۔ ان شرائط میں بیشتر تخریبی تھیں اور کسی کو طالب علموں کی تعمیری سرگرمیوں سے سروکار نہ تھا۔ ان کی تعلیم کا آغاز ہی نفرت اور حقارت سے کیا جانا مقصود تھا۔ گاندھی جی اور ان کے مقلدین کی تقریریں شدید انتہا پسندی اور عدم رواداری کا درس دیتی تھیں اور مختلف سیاسی نظریات کے افراد میں گہری خلیج حائل کرنے کا باعث بن رہی تھیں ----- چنانچہ میرا منصوبہ ناکام ہو گیا۔ وہ اساتذہ جن کی خدمات میں نے اپنے کالج کے لئے مستعار لی تھیں مایوس ہو کر بکھر گئے جن پروفیسروں کو میں نے تدریس کی

دعوت دی تھی وہ اپنی اپنی چھٹیاں منسوخ کروا کے واپس چلے گئے۔ میرے خیر خواہوں' دوستوں اور نقادوں نے مجھے جو تنبیہات کی تھیں وہ حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئیں۔ کلکتہ اور ناگپور کانگریس میں جناح کی تقریریں پیغمبرانہ صداقت بن کر ظاہر ہوئیں جو مجھے اس وقت درست معلوم نہیں ہوئیں تھیں۔"

(میری داستان حیات از جے کار صفحات۔ ۴۲۹:۳۰)

پتہ بھائی ستیہ رمیا نے تاریخ کانگریس کی جلد اول کے صفحہ ۵۷ پر گاندھی جی کے چرخے اور تعلیمی اداروں کے متعلق لکھا ہے۔

"اندازہ کریں کہ وہ ۶۰ لاکھ بچے اور بچیاں جنہیں اصولاً سکولوں میں زیر تعلیم ہونا چاہئے تھا روزانہ دو دو گھنٹے سوت کاتا کرتے تھے۔ اس سوت کو اکٹھا کرنے سے ہمالیہ کے برابر پہاڑ کھڑا ہو سکتا تھا اور کپڑے کے سمندر بہہ سکتے تھے۔ یوں ظاہر ہوتا تھا کہ گاندھی جی نے اپنے تعلیمی اداروں کو روپیہ کمانے کے نام کر رکھا ہے۔ ان کا ارادہ تھا کہ پہلے یہ ادارے خود کفیل ہوں اور بعد میں سرکار سے امداد لینے کی بجائے خود سرکار کو امداد دینے لگیں۔"

جن نہایت ہونہار طلباء نے گاندھی جی کے اشارے پر اپنی تعلیم ترک کر دی تھی انہیں بعد میں اندازہ ہوا کہ وہ اپنے ساتھ کیا ظلم کر بیٹھے ہیں۔ یہاں یہ سوال بے حد اہم ہے کہ کیا گاندھی جی کو اپنے نظریاتی تجربے کے لئے معصوم نوجوانوں کی زندگی سے کھیلنے کا حق تھا؟ اس سوال کا جواب کانگریس کے نامور رکن سری پرکاش نے اپنے ایک مضمون میں دیا جو ۱۲ اگست ۱۹۶۲ء کو "السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا" میں شائع ہوا۔ سری پرکاش آزادی کے بعد مہاراشٹر اور مدراس کے گورنر بھی رہے وہ لکھتے ہیں۔

یہ سوال سب سے پہلے مجھ سے میرے بیٹے نے پوچھا جس کا جواب میں آج تک نہیں دے سکا۔ ---کیا یہ اس دور کے سیاسی رہنماؤں کے لئے جائز تھا کہ وہ اپنے سیاسی مقاصد کے لئے طالب علموں کو استعمال کرتے اور ان کا تعلیمی

کیریئر تباہ کرتے؟ کیا درس گاہوں کے پر امن ماحول کو بگاڑنا درست تھا؟ اور پھر جب سوراج آیا تو وہ جنہوں نے اس کے لئے زندگی داؤ پر لگائی تھی وہ تو باہر گھسٹتے رہے جب کہ انہی لیڈروں کو بار بار دھوکے دینے والے ان کے وفادار اقتدار کے ایوانوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ کیا آج کے رہنماؤں کو اپنے بچے غیر ملکی اداروں میں پڑھانا زیب دیتا ہے جنہوں نے قوم کے نوجوانوں کو ان کے بھرپور کیریئر کے دوران بھٹکایا تھا۔ ان رہنماؤں نے اس دور میں بھی اپنے بچوں کو غیر ممالک خصوصاً انگلستان میں تعلیم دلوائی تھی کیا یہ ادارے کانگریس کی ہدایات کے مطابق تھے؟ کیا یہ سرکار برطانیہ کے زیرِ اختیار نہ تھے؟ کیا یہ کیسی ایسے شخص (گاندھی جی) کے لئے جائز تھا کہ وہ اپنے بن ماں کے بچوں کی ذمہ داریوں کو ترک کر کے عوامی زندگی میں انتشار پیدا کرنے کے لئے کود پڑتا۔ ہمارے پاس تو اس بات کی بھی ضمانت نہیں تھی کہ گاندھی جی یہ سب کچھ واقعتاً قومی خدمت کے لئے کر رہے تھے یا محض اپنا دل بہلانے کے لئے؟ یہ سوال جیسے خار بن کر میرے بیٹے کے دل میں چبھتے ہیں اسی طرح ان کی کھٹک میں بھی محسوس کرتا ہوں۔ اگر مجھے کوئی ان کا جواب دے سکے تو میں بہت مسرور ہوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ بہت سے نوجوانوں نے میرے بیٹے سے بڑھ کر تکلیفیں اٹھائی ہیں اور بہت سے باپوں نے مجھ سے بڑھ کر صدمات سہے ہیں"

باب نمبر13

تلک اور گاندھی جی (۱۹۲۰-۱۹۱۹ء)

تحریک خلافت سے وابستہ ہونے کے بعد گاندھی جی نے اپنے نظریات عدم تشدد و عدم تعاون کو دنیا بھر میں پھیلانے کی ٹھان لی۔ ہندوستان کے بیشتر رہنماؤں نے ان کی حمایت کا اعلان کر دیا لیکن لوک منیا تلک ابھی تک کشمکش میں مبتلا تھے وہ صحیح طور پر سمجھ نہ پائے تھے کہ گاندھی جی کے افکار درست ہیں یا غلط' خود گاندھی جی نے تلک کے رویے کے متعلق لکھا ہے۔

"مجھے احساس ہے کہ میرا طریقہ کار تلک سے مختلف ہے ----- لیکن مجھے تہہ دل سے وثوق ہے کہ تلک نے میرے طریقے کو مسترد نہیں کیا تھا ----- انہوں نے اپنی وفات سے محض ۱۵ روز قبل دوستوں کی ایک مجلس میں مجھ سے کہا تھا کہ وہ میرے لائحہ عمل کو بہترین تسلیم کرتے ہیں اور اگر عوام کو اس کی جانب راغب کیا جا سکے تو اس سے عمدہ نتائج کا حصول ممکن ہے۔ لیکن انہوں نے کچھ شکوک و شبہات کا اظہار بھی کیا-----"

(تندولکر' جلد دوم' صفحہ ۴۸)

جے کار نے بھی "میری داستان حیات" کی جلد اول کے صفحہ ۳۸۶ پر تلک کے اس بیان کا حوالہ دیا ہے۔

"تلک کی وفات سے تقریباً دو ہفتے قبل سردار گریہہ کے گھر ایک تقریب میں گاندھی جی کے علاوہ شوکت علی اور دیگر سیاسی رہنما بھی موجود تھے۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ تحریک عدم تعاون قطعی طور پر آئینی اور قانونی ہے۔ جس کے جواب میں تلک نے کہا کہ میں تو مسلح بغاوت کو بھی آئینی ذریعہ گردانتا ہوں لیکن مشکل یہ ہے کہ سردست یہ ناممکن ہے۔ اگر کوئی مجھے یقین دلائے کہ مسلح انقلاب روپے میں سے آٹھ آنے بھی کامیاب رہے گا تو میں اللہ

توکل اس آٹھ آنے کے لئے بھی میدان میں کود پڑوں گا۔ لیکن اصلی صورتحال یہ ہے کہ اس کی کامیابی کے امکانات روپے میں سے چار آنے کے برابر بھی نہیں ہیں۔"

تلک نے تحریک عدم تعاون کے کچھ ناقابل عمل پہلوؤں کی جانب توجہ مبذول کروائی اور ان لوگوں کو بھی متنبہ کیا جو اس خیال میں مبتلا تھے کہ اسے مکمل طور پر تشدد سے پاک رکھا جاسکتا ہے۔ تلک نے اس موقعے پر کہا۔

"گاندھی جی کے ایک ہتھیار ہڑتال ہی پر غور کیجئے۔ گاندھی جی خونریزی کے نام ہی سے لرز اٹھتے ہیں لیکن ہڑتال کے دوران خونریز تصادم روکنے کی کیا ضمانت موجود ہے؟ کیونکہ ہڑتال اگر کامیاب ہو تو اس سے حکومت کے وقار کو سخت دھچکہ پہنچتا ہے اس لئے وہ اس ہڑتال کو ناکام بنانے کے لئے ہر ممکن حربہ استعمال کرتی ہے جس میں طاقت اور تشدد خصوصاً بہت اہم ہیں۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ سرکاری اہلکار جبراً دکانیں کھلوانے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر دکاندار مزاحمت کریں تو تصادم ناگزیر ہوتا ہے لوگ اس تماشے کو دیکھنے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں جنہیں منتشر کرنے کے لئے کئی مرتبہ گولی چلانی پڑتی ہے جس سے کئی افراد زخمی ہو جاتے ہیں"

(ایضاً صفحہ ۳۸۷)

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تلک گاندھی جی کے پروگرام سے متعلق کافی تشکیک کا شکار تھے۔ خود گاندھی جی نے اعتراف کیا کہ تلک کے ذہن میں کافی شبہات تھے اس کے باوجود گاندھی جی نے تلک کے نام کو اپنے مقاصد اور شہرت کے لئے استعمال کیا اور انہوں نے تلک میموریل سوراج فنڈ کا آغاز بھی کیا جس کا مقصد ایک کروڑ روپیہ اکٹھا کرنا تھا۔ اس روپے کا آگے سے مقصد کانگریس کے لئے ایک کروڑ ایسے رضاکاروں کا انتظام کرنا تھا جو ۲۰ لاکھ چرخے خرید کر دیہات روانہ ہو جاتے اور دیہی عوام سے سوت

کتواتے۔

(تندولکر، جلد دوم صفحہ ۳۴)

تلک نے گاندھی جی کی تحریک خلافت سے وابستگی کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ ایس و من بپت نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے۔

"تلک چاہتے تھے کہ ہندوستان کی تحریک آزادی کسی بھی مذہبی دھبے اور غیر ملکی مداخلت سے پاک رہے انہوں نے تحریک خلافت کے بھیانک مضمرات کو بہت پہلے محسوس کر لیا تھا اسی لئے انہوں نے بار بار گاندھی جی کو خبردار کیا کہ وہ اس تحریک سے دور رہیں۔ کئی لبرل اور قوم پرست ہندوؤں نے تلک سے کہا کہ اگرچہ وہ ترکی کی خلافت سے کوئی سروکار نہیں رکھتے اس کے باوجود وہ صرف مسلمانوں کی خوشنودی اور تعاون کے لئے اس تحریک میں سرگرم حصہ لے رہے ہیں تاکہ مسلمان بھی ان کے ساتھ جنگ حریت کے قومی دھارے میں شریک ہوں۔ تلک نے جواباً ہمیشہ یہی کہا کہ اگر ہندو اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ مسلمانوں کو دھوکہ دے رہے ہیں تو جلد ہی ان کے خیالات چکنا چور ہو جائیں گے فی الحقیقت وہ اپنے سوا کسی اور کو دھوکا نہیں دے رہے۔ مسلمان بھی اتنے سادہ لوح ہرگز نہیں کہ اس بات کو سمجھ نہ پائیں۔ چنانچہ ہمیں دو الگ الگ معاملات کو آپس میں الجھانا نہیں چاہئے۔ مسلمانوں کو سیاست کے قومی دھارے میں شریک کرنے کے دیگر ذرائع پر غور ممکن ہے۔ انہیں زیادہ سے زیادہ حقوق اور مراعات دینی چاہئیں۔ اس ذریعے سے انہیں کانگریس کی طرف بلانا بے حد قابل تحسین ہے لیکن اس مقصد کے لئے سیاست میں مذہب کا بھگار لگانے سے ہمیشہ گریز کریں"

گاندھی جی کے ستیہ گرہ اور روزے (برت) کے متعلق بھی لوک منیا تلک کے خیالات بے حد دلچسپ تھے۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ تلک کو گاندھی جی کی ہر سیاسی بدعت کے خدشات کا علم تھا اور وہ ان کے درآمد شدہ نظریات کو ہندوستانی سیاست کے لئے زہر قاتل خیال کرتے تھے۔ اے آر گاڈ نکر نے اپنی یادداشتوں میں اس کا تذکرہ کیا ہے جن کا

حوالہ جے کار نے اپنی کتاب کے صفحہ ۳۸۷ پر دیا ہے۔

"تلک نے مجھ سے پوچھا گاندھی کی ذات کیا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ گاندھی مذہب کے اعتبار سے ویشنو اور ذات کے لحاظ سے ویش ہیں۔ تلک سخت حیران ہو کر کہنے لگے کہ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ میں آج تک گاندھی کے مذہب سے بے خبر تھا۔ اگر عوام کو میری جہالت کا علم ہو جائے تو وہ میرا کس قدر مذاق اڑائیں۔ میں آج تک یہی سمجھتا رہا کہ گاندھی جی جین ہیں کیونکہ ان کے افکار مثلاً ستیہ گرہ، عدم تشدد اور فاقہ کشی جین مذہب سے غیر معمولی مطابقت رکھتے ہیں۔ لیکن ان نظریات کا سیاست کے چلن سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ سیاست کا طریقہ کار مذہب کے برعکس وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ ہمارے موجودہ سیاسی داؤ پیچ مذہبی نظریات اور مجرد تصورات صداقت سے قطعاً مختلف ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ گاندھی جی ستیہ گرہ کے ذریعے یا روزے رکھ کر ہمارے موجودہ حکمرانوں پر رتی بھر بھی اثر انداز ہو سکیں گے جو خود سیاسی جوڑ توڑ کے عالمی ماہر تسلیم کئے جاتے ہیں-----"

باب نمبر 14

گاندھی جی کی جانب سے تلک کی پہلی برسی کا انعقاد

(۱۹۲۱ء)

لوک منیا تلک ۳۱ جولائی ۱۹۲۰ء کو وفات پا گئے۔ اگلے برس کی اسی تاریخ کو گاندھی جی نے ان کی پہلی برسی بالکل اپنے ڈھب سے منانے کے انتظامات کیے۔ اس کا نہایت دلگداز نقشہ تندولکر نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

"۳۱ جولائی کی صبح کو گاندھی جی نے بمبئی کے عمر سبحانی یارڈ میں ایک مقدس الاؤ دہکایا جس میں قیمتی غیر ملکی کپڑے کی لاتعداد گانٹھیں جلا کر خاکستر کی گئیں۔ اس قابل دید منظر کو عوام کے بڑے انبوہ نے دیکھا۔ جونہی شعلوں نے کپڑے کے بلند و بالا ڈھیر کو اپنی لپیٹ میں لیا مجمعے نے فرط انبساط سے اس طرح نعرے بلند کئے جیسے ہندوستان کی ساری زنجیریں اس آگ میں پگھل گئی ہوں۔ اس انبار میں نہایت بیش قیمت ساڑھیاں، قمیضیں اور کوٹ شامل تھے۔ بعض ایسا ایسا قیمتی ریشم بھی یہاں نذر آتش کیا گیا جو بچیوں کی ماؤں نے بڑے چاؤ سے ان کے بیاہ کے لئے سنبھال کر رکھا تھا۔ اس موقعے پر کپڑے کے ڈیڑھ لاکھ سے زائد نایاب ٹکڑے بے دردی سے جلا کر راکھ کر دیے گئے۔"

(تندولکر، جلد دوم، صفحہ ۱۳۵)

اگلے روز گاندھی جی نے نہایت مسرور اور شاداں ہجوم سے اس طرح خطاب کیا۔

"بمبئی کل ایک مقدس آگ سے جگمگاتا رہا جو میرے خیال میں زرتشت کی عبادت گاہوں کی طرح ہمیشہ جلتی رہنی چاہیئے تاکہ ہماری آلائشیں مستقلاً بھسم ہوتی رہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کل ہم نے غیر ملکی کپڑا جلا کر اپنی ایک

آلودگی کو خاکستر کیا۔ اس آگ کو آپ ایک علامت سمجھیں اس عہد کی کہ ہم کبھی بدیشی کپڑے کو چھوئیں گے بھی نہیں ---- کل کی آگ ایک سچی قربانی کی آگ تھی"

لیکن اس عظیم مذہبی خطاب کا عوام کے ذہنوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ان کا رد عمل یکسر مختلف تھا۔ ریورنڈ سی ایف اینڈریوز نے اپنی کتاب "مہاتما گاندھی کے افکار" کے صفحہ ۲۶۹ پر اس طرح کیا ہے۔

"گاندھی جی کے ایسے کاموں کا نہایت منفی اثر پورے ملک کے عوام پر پڑا اور خصوصاً بمبئی کے عوام تو بہت شدت سے تشدد کی جانب مائل ہوئے۔ غیر ملکی کپڑا جلنے کا منظر دیکھنے کے لئے ایک لاکھ افراد کا ہجوم اکٹھا ہوا تھا جو یہاں سے تخریب اور دہشت پسندی کا نہایت شاندار سبق لے کر پورے شہر میں پھیل گیا-----"

خود اینڈریوز گاندھی جی کی اس منتقم مزاجی اور انتہا پسندی سے سخت دل گرفتہ ہوئے۔ کپڑا جلانے کے موقعے پر گاندھی جی کی عدم رواداری کے مناظر دیکھ کر وہ اتنے رنجیدہ ہوئے کہ انہوں نے گاندھی جی کو ایک نہایت دلسوز خط لکھا جس کا متن درج ذیل ہے۔

"میں جانتا ہوں کہ آپ غیر ملکی کپڑا جلا کر غریبوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن مجھے آپ کی غلطی کا بھی شدت سے اندازہ ہے ----- جس طرح آپ نے نفیس اور نرم و نازک کپڑا جلا کر راکھ کیا اس سے مجھے دلی صدمہ پہنچا۔ ہم نے گویا یہ کپڑا جلا کر دنیا بھر سے نہ صرف اپنا ناطہ توڑ لیا بلکہ شدید خود غرضی کا مظاہرہ بھی کیا جس کا نتیجہ پرانی، بوسیدہ اور جارح قوم پرستی کے سوا اور کچھ نہیں نکل سکتا۔ ہم اس شیطانی چکر میں خود پھنسنا چاہتے ہیں جس سے یورپ نے خود کو بڑی محنت سے آزاد کیا ہے------

میں اس وقت بے حد خوش تھا جب آپ نے سماجی برائیوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا تھا جن میں شراب نوشی، ذات پات کی تفریق اور نسل پرستی شامل تھیں۔ لیکن کپڑے کے انبار کو نذر آتش کر کے آپ نے اپنے ہی جیسے دیگر انسانوں کی محنت اور فن کو راکھ کا ڈھیر بنایا ہے۔ لوگوں کو یہ تعلیم دے کر آپ نے کچھ بھلا نہیں کیا کہ غیر ملکی کپڑا پہننا مذہبی اعتبار سے گناہ ہے یا اسے چھونا ناپاکی ہے۔ کم از کم آپ کے یہ خیالات میرے لئے بے حد تکلیف دہ ہیں۔ مجھے تو اس کھدر سے بھی خوف آنے لگا ہے جو آپ نے مجھے پہننے کے لئے عطا فرمائی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا ہے جیسے اس کھدر سے بھی نسلی برتری کی بو آتی ہو اور میں اسے پہن کر خود کو دوسروں سے متبرک تصور کرنے لگوں گا۔ میں اپنا یہ حق سمجھتا ہوں کہ آپ کی جس چیز سے مجھے تکلیف پہنچے میں چلا چلا کر اس کے خلاف احتجاج کروں"

گاندھی جی نے اینڈریوز کو جو جواب دیا وہ بھی انہوں نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔ اس جواب کے اہم نکات یہ ہیں۔

"میں آج بھی کپڑا جلانے کی اہمیت پر قائم ہوں-----

"تخریب تعمیر کی سب سے بڑی محرک ہے۔ میں تو بڑی عظیم تباہی کا متمنی ہوں جس کے ذریعے ہندوستان اپنے صدیوں پرانے خواب غفلت سے دہل کر جاگ سکے"

"میرا رویہ دوستوں اور دشمنوں سے یکساں ہے اور میرا یہی عقیدہ میرے متعدد دوستوں کے لئے پریشانی کا باعث ہے۔"

"مجھے یاد ہے کہ میں نے ایک مرتبہ ایک بہت خوبصورت دوربین سمندر میں پھینک دی تھی کیونکہ یہ میرے اور میرے ایک دوست کے درمیان مستقل وجہ نزاع تھی۔ میرا وہ دوست پہلے اسے پھینکنے سے بہت ہچکچا رہا تھا

کیونکہ وہ نہ صرف بہت قیمتی تھی بلکہ اسے کسی نے تحفے میں دی تھی۔ لیکن تجربہ ثابت کرتا ہے کہ ایسے قیمتی ترین تحفوں کو بلا ہچکچاہٹ تباہ کر دینا چاہئے جو آپ کی اخلاقی ترقی میں حائل ہوں۔ کیا ایسے نہایت قیمتی کپڑے کو نذر آتش کر دینا آپ کا اخلاقی فرض نہیں جس کے تار و پود میں طاعون کے جراثیم پل رہے ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ نوجوانی میں میں نے اپنی بیوی کی چوڑیاں توڑ کر ریزہ ریزہ کر دی تھیں کیونکہ وہ وہ ہمارے درمیان اختلاف کا باعث بن رہی تھیں حالانکہ یہ چوڑیاں میری ساس نے اِسے تحفے میں دی تھیں۔ لیکن میں نے انہیں کسی نفرت کی وجہ سے نہیں توڑا بلکہ محبت کی شدت میں ایسا کیا۔ اب بڑھاپے میں مجھے اپنا یہ عمل غیر مناسب محسوس ہوتا ہے لیکن اس وقت یہ بالکل درست تھا کیونکہ یہ ہمیں قریب تر لایا تھا۔"

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ گاندھی جی کے مزاج میں برداشت کا کس قدر فقدان تھا۔ جنوبی افریقہ میں ایک جرمن ماہر تعمیرات گاندھی جی کے سحر میں مبتلا ہو گیا۔ وہ ایک دولتمند شخص تھا اور بہت پر تعیش زندگی گزارنے کا عادی تھا لیکن گاندھی جی کا مقلد بننے کے بعد اس نے اپنی تمام جائیداد ان کے حوالے کر دی اور نہایت سادہ زندگی بسر کرنے لگا۔ اسی کی دولت کے سہارے گاندھی جی نے جنوبی افریقہ میں متعدد آشرم قائم کیے۔ جب گاندھی جی ۱۹۱۴ء میں جنوبی افریقہ سے ہندوستان روانہ ہوئے تو مذکورہ جرمن کیلن باخ ان کے ہمراہ تھا۔ کیلن باخ کے پاس ایک نہایت قیمتی دوربین تھی جسے وہ بے حد عزیز رکھتا تھا۔ گاندھی جی اس سادہ لوح شخص کو فلسفۂ تیاگ سے روشناس کروانا چاہتے تھے۔ یہ سب کچھ گاندھی جی نے کس طرح کیا اس کا تذکرہ ان کے اپنے الفاظ میں سنئے۔

"کیلن باخ کو اپنی دوربین بے حد عزیز تھی جس کی قیمت اس دور میں ۷ سٹرلنگ پاؤنڈ تھی۔ لیکن میں اسے سمجھانا چاہتا تھا کہ اتنی قیمتی دوربین پاس رکھنا سادگی کے اعلیٰ آدرشوں سے متصادم ہے۔ ایک روز ہم بحری جہاز کے عرشے پر کھڑے بات چیت کر رہے

تھے۔ میں اسے اس مہنگی دوربین کے اخلاقی نقصانات سمجھا رہا تھا جبکہ وہ اس کے حق میں بول رہا تھا۔ یکلخت میں نے کہا۔ کیوں نہ میں اس منحوس شے کو سمندر میں پھینک دوں جو میرے اور تمہارے درمیان اختلاف کا باعث بن رہی ہے تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ کیلن باخ نے مجھے دوربین پھینک دینے کی اجازت دے دی۔ میں نے پھر وضاحت کی کہ میں سچ مچ دوربین کو پھینک دینے کی بات کر رہا ہوں۔ کیلن باخ نے ایک مرتبہ پھر مجھے اجازت دے دی۔ یہ سنتے ہی میں نے دوربین سمندر کی بے کراں لہروں کے حوالے کر دی۔ کیلن باخ کو میں نے محض ایک آلے سے نجات نہیں دلائی بلکہ اسے خواہشات کی شدت سے آزاد کیا۔ کیلن باخ نے کبھی اپنی عزیز دوربین کھو جانے پر افسوس کا اظہار نہیں کیا۔"

(خود نوشت صفحہ ۴۲۱)

اس داستان سے ظاہر ہوتا ہے کہ گاندھی جی کو جرمن شہری کی دوربین اپنے ہاتھ سے ضائع کئے بغیر چین نہیں آیا وہ ہر اس چیز کو بھی برباد کر دینے کے عادی تھے جو ان کی خواہش کی راہ میں مزاحم ہوتی تھی۔ وہ اپنی اس تباہی پسند طبیعت کو درست ثابت کرنے کے لئے طرح طرح کے دلائل اور جواز تراشتے رہتے تھے۔ انہوں نے مذکورہ بالا واقعے کا جواز اپنی خود کلامی کے دوران اس طرح پیش کیا ہے۔

"اس طریقے سے ہر روز ہم کوئی نئی چیز سیکھتے تھے کیونکہ ہم دونوں راہ حق کے مسافر تھے۔ جب آپ صداقت کے راستے پر گامزن ہوتے ہیں تو غصے' حسد' رقابت' نفرت اور خود غرضی جیسے منفی جذبات خود بخود نیست و نابود ہو جاتے ہیں ----- راہ حق پر مکمل طور پر رواں دواں ہونے کے ئے انسان کو محبت اور نفرت خوشی اور ناخوشی جیسی دوئی / ثنویت سے بالاتر ہونا پڑتا ہے۔

تو یہ تھے گاندھی!

اس کے برعکس مسیحؑ کے سچے پیروکار ریورینڈ سی ایف اینڈریوز ایک بچے کا سا

معصوم دل رکھتے تھے۔ وہ گاندھی جی کی مکاریوں' عیاریوں اور چالبازیوں کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ خاص طور پر جب انہوں نے گاندھی جی کو قیمتی کپڑے کے انبار بے دردی سے خاکستر بناتے ہوئے دیکھا تو وہ شدید دلی کرب سے دوچار ہوئے اور احتجاج کئے بغیر نہ رہ سکے۔ اب تک نہ جان پائے تھے کہ گاندھی جی تلک کی برسی کی آڑ میں کن عزائم کی تکمیل کر رہے ہیں۔ تلک عوام کے مقبول رہنما تھے جن کی یاد سے ان کے دل محبت اور احترام سے مملو ہو جاتے تھے۔ تلک کی موت کی یاد تازہ کرنے کے بہانے گاندھی جی نے عوام کے جذبات سے کھیلنے کا سنہری موقع حاصل کیا۔ کپڑا جلانا تو محض اس مقصد کی راہ میں ایک قدم تھا۔

باب نمبر 15

سی۔ آر۔ داس اور گاندھی جی (۱۹۲۵۔۱۹۱۷ء)

سی آر داس نے سیاسی میدان میں کافی عمر گزارنے کے بعد قدم رکھا۔ اپنے سیاسی کیریئر کے صرف ۵ برس کے اندر انہوں نے شاندار عروج حاصل کیا۔ سی آر داس نے ۱۹۱۷ء میں کانگریس میں شمولیت اختیار کی۔ یہ فیصلہ انہوں نے اس لئے کیا کہ وہ محسوس کر رہے تھے کہ کانگریس کے اعتدال پسند رہنما سریندر ناتھ بنیرجی اور بیکوناتھ سین مسز اینی بیسنٹ کی بے جا مخالفت کر رہے ہیں۔ مسز بیسنٹ کا نام کانگریس کے اجلاس کلکتہ دسمبر ۱۹۱۷ء کی صدارت کے لئے تجویز کیا گیا تھا جب کہ مذکورہ بالا حضرات اس کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ سی آر داس نے اس موقعے پر نہایت سرگرمی سے مسز بیسنٹ کا ساتھ دیا اور انہیں کانگریس کی صدر منتخب کروانے میں کامیاب ہو گئے۔ مسز بیسنٹ کا انتخاب بنگال میں سریندر ناتھ بنیرجی جیسے مشاق سیاستدان کے لئے زبردست چیلنج تھا بنگال کے سیاسی افق پر پوری تابانی سے روشن ہونے والا نیا ستارہ اب سی آر داس تھے جس کی روشنی سے اعتدال پسند رہنماؤں کی چمک ماند پڑ گئی۔ لاابالی پن سی آر داس کے مجموعی مزاج کا حصہ تھا اور وہ اسی بے پروائی سے اپنے دور کی سیاسی تحریک میں کود پڑے اور اس کے لئے اپنا تن من دھن قربان کر دیا۔ ۱۶ جون ۱۹۲۵ء کو اپنے انتقال تک وہ اپنا سب کچھ قوم کو دے چکے تھے اپنے باقی ماندہ اثاثے بھی انہوں نے ملک و قوم ہی کے نام کر دئے۔

۱۹۱۹ء میں کانگریس کے اجلاس امرتسر میں داس اور گاندھی جی کے درمیان شدید تلخ کلامی ہو گئی۔ وجہ نزاع نئی اصلاحات تھیں۔ پنجاب میں حکومت کے مظالم کے پیش نظر داس ان اصلاحات کو یکسر مسترد کرنے کے موڈ میں تھے جب کہ گاندھی جی انہی دنوں اعتدال پسندی اور سرکار کے ساتھ تعاون کے مبلغ تھے۔ ستمبر ۱۹۲۰ء میں کانگریس کا خصوصی اجلاس کلکتہ میں ہوا۔ جس کی صدارت لالہ لاجپت رائے نے کی۔ اس اجلاس

میں گاندھی جی نے اپنی تحریک عدم تعاون کے لئے کانگریس کی حمایت بڑے زور و شور سے طلب کی۔ اس تحریک کو وہ اگست میں کانگریس کی رسمی منظور کے بغیر ہی شروع کر چکے تھے۔ سی آر داس نے شدو مد سے گاندھی جی کی تحریک کی مخالفت کی۔ مسز بیسنٹ' پنڈت مدن موہن اور دیگر متعدد رہنما اس تحریک کے خلاف تھے اس کے باوجود گاندھی جی اپنی قرارداد کو اکثریت کے ووٹوں سے کامیاب کروا لے گئے۔ اس کے بعد دسمبر میں کانگریس کا باقاعدہ اجلاس ناگپور میں منعقد ہوا جہاں گاندھی جی نے مکمل طور پر میدان مار لیا اور سی آر داس نے بھی ان کے سامنے ہتھیار ڈال دئے۔ اس موقعے پر بھی صرف ایک دلاور شخص گاندھی جی کی مخالفت کی جرات کر سکا جس کا نام محمد علی جناح تھا۔

اپریل ۱۹۲۱ء میں وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ کے عہدے کی معیاد ختم ہو گئی اور ان کی جگہ لارڈ ریڈنگ وائسرائے بن کر ہندوستان آئے جو اس وقت انگلستان کے چیف جسٹس تھے۔ انہوں نے حکومت برطانیہ کو مشورہ دیا کہ پرنس آف ویلز کا مجوزہ دورہ ہندوستان منسوخ کر دیا جائے کیونکہ ان حالات میں وہ ہندوستانی عوام میں شدید غم و غصے اور باغیانہ خیالات کا محرک بن سکتا ہے۔ حکومت برطانیہ نے لارڈ ریڈنگ کا یہ دانشمندانہ مشورہ قبول کر کے پرنس کا دورہ اگلے برس موسم سرما تک موخر کر دیا۔ جونہی یہ اعلان جاری ہوا گاندھی جی نے کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کو ہدایت کی کہ پرنس کے دورے کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا جائے۔ ۷ انومبر ۱۹۲۱ء کو پرنس آف ویلز بمبئی پہنچا جہاں کانگریس نے ایک روزہ ہڑتال کا اعلان کر رکھا تھا۔ ہڑتال کو موثر بنانے کے لئے کانگریس کی کارروائی کے دوران تشدد پھوٹ پڑا جس نے دیکھتے ہی دیکھتے بدترین فساد کی صورت اختیار کر لی اور اس پر قابو پانے کے لئے فوج کو گولی چلانی پڑی۔ لیکن شہر کے بپھرے ہوئے غنڈے قابو میں نہ آسکے' لوٹ مار' قتل و غارت اور آتشزنی بمبئی میں تادیر معمول کی مانند جاری رہی۔ یہ سب کچھ لارڈ ریڈنگ کی آنکھوں کے سامنے ہوا جو پرنس آف ویلز کو لینے بمبئی آئے ہوئے تھے۔

۲۵ دسمبر کو کرسمس پر پرنس کو کلکتہ جانا تھا۔ لارڈ ریڈنگ وہاں بمبئی جیسے افسوسناک

واقعات کا اعادہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے کانگریس سے مذاکرات کے ذریعے اس طرح کا سمجھوتہ کرنے کی خواہش ظاہر کی کہنہ مشق سیاسی رہنما پنڈت مدن موہن کو ثالث بنایا گیا جو نامور قوم پرست لیڈر ہونے کے علاوہ گاندھی جی کے شدید مخالف تھے۔ اس وقت مولانا آزاد اور سی آر داس سمیت بنگال کے کم و بیش تمام کانگریسی رہنما کلکتہ کی جیل میں تھے۔ پنڈت مدن موہن ان سے ملاقات کے لئے جیل گئے۔ جہاں بھرپور گفت و شنید کے بعد ایک مسودہ تیار کیا گیا جس میں اس معاہدے کی شرائط درج تھیں۔ اس مسودے کو بذریعہ ٹیلی گرام گاندھی جی کو روانہ کر دیا گیا اس پر سی آر داس اور مولانا آزاد دونوں کے دستخط موجود تھے۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ آیئے دیکھتے ہیں جیکار کی سوانح عمری کے صفحات ۴۰۴ اور ۴۰۵۔

"احمد آباد کانگریس میں سپرو کی کوششوں کے نتیجے میں ایک اہم واقعہ ہوا۔ سپرو ان دنوں لارڈ ریڈنگ کی حکومت میں شریک تھے۔ پنڈت مدن موہن کی سرکردگی میں یہ مسودہ (مذکورہ بالا) ہردے ناتھ کنجزو اور جمنا داس دوار کا داس احمد آباد لے کر آئے۔ انہیں روانہ کرنے والوں میں سپرو' لارڈ ریڈنگ اور مسز بیسنٹ شامل تھے۔ یہ مسودہ ۱۸ دسمبر ۱۹۲۱ء کو گاندھی جی کو موصول ہو گیا جس میں کہا گیا تھا کہ اگر کانگریس کلکتہ میں پرنس آف ویلز کے دورے کو ناکام نہ بنائے تو وہ اس دورے سے ایک ہفتہ قبل کلکتہ میں ایک گول میز کانفرنس بلائیں گے جس میں سرکار برطانیہ کی نمائندگی وہ خود کریں گے جب ہندوستان کی نمائندگی کی دعوت گاندھی جی سمیت یہاں کے ممتاز سیاسی رہنماؤں کو دی جائے گی۔ وائسرائے نے یہ وعدہ بھی کیا کہ حکومت اس موقعے پر مزید صوبائی خود مختاری کا اعلان کرے گی اور مرکزی حکومت میں ہندوستانی رہنماؤں کو زیادہ سے زیادہ نمائندگی دینے کی تجاویز پر بھی غور ہو گا۔ جب یہ پیام گاندھی جی کو احمد آباد میں پہنچایا گیا تو میں (جے کار) اور جناح ان کے بے حد نزدیک بیٹھے

تھے۔ گاندھی جی مسودے کو پڑھ کر خاموش رہے اور گہری سوچ میں ڈوب گئے جب کہ ان کے بعض چہیتے حواریوں نے اعتراض کیا کہ اگر وائسرائے کو اپنی تجاویز منوانا ہیں تو وہ قاصدوں سے کام لینے کی بجائے خود چل کر احمد آباد آتے۔ اس پر میں نے اور جناح نے نظروں ہی نظروں میں کچھ خیالات کا تبادلہ کیا لیکن گاندھی جی بدستور خاموش رہے۔ ہم نے گاندھی جی سے اس ضمن میں استفسار کیا کیونکہ ہمیں وائسرائے کی پیشکش بہت معقول معلوم رہی تھی اور اس سے فائدے کی بہت امید تھی کیونکہ وائسرائے خود بھی بہت مضطرب تھا اور ہر حال میں کلکتے میں کانگریس کے تعاون کا طلبگار تھا۔ گاندھی جی ہمارے خیالات سے بہت حد متفق تھے۔ لیکن ہمیں خدشہ تھا کہ ان کے عقل سے عاری مقلد کہیں ان کے نظریات کو بدل نہ دیں کیونکہ وہ اس بات پر بلکہ مفروضے پر نہایت خوش تھے کہ حکومت نے شکست تسلیم کرلی ہے اور سوراج ان کے ہاتھ میں آگیا ہے۔ گاندھی جی نے بہرحال وائسرائے کا پیغام قبول کرلیا لیکن درحقیقت وہ اس منصوبے کی مزید کھوج لگانا چاہتے تھے۔

بعد ازاں انہوں نے اپنے حواریوں اور مولویوں سے طویل صلاح مشورے کئے۔ کسی نے کھل کر ان کی مخالفت نہیں کی لیکن صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ گاندھی جی کے اس اقدام اور گول میز کانفرنس میں شمولیت پر رضامندی سے خوش نہیں-----"

مولویوں اور دیگر مقلدین سے مشاورت کا جو نتیجہ نکلا اس کا ذکر ابوالکلام آزاد نے اپنی خودنوشت سوانح میں اس طرح کیا ہے۔

"مجھے اور سی آر داس کو اس بات پر دلی صدمہ ہوا کہ گاندھی جی نے ہماری بات نہیں مانی۔ ان کا اصرار تھا کہ پہلے علی برادران سمیت تمام سیاسی رہنماؤں کو غیر مشروط رہا کیا جائے صرف ان کی رہائی کے بعد ہی گول میز

کانفرنس کے انعقاد پر غور کیا جا سکتا ہے۔ داس اور میں ہم خیال تھے کہ اس موقعے پر یہ شرط غیر مناسب ہے۔ حکومت پہلے ہی قول دے چکی تھی کہ گول میز کانفرنس سے پہلے تمام سیاسی رہنماؤں کو رہا کر دیا جائے گا پھر اس مطالبے کا کیا جواز تھا ---- جب تک کوئی معاہدہ نہیں ہوا تھا بائیکاٹ کا پروگرام بہت عمدہ تھا لیکن ہم نے بلاشبہ سیاسی سمجھوتے کا ایک نادر موقع کھو دیا۔ داس نے تو اپنی مخالفت اور مایوسی ظاہر کرنے میں کوئی لگی لپٹی نہیں رکھی۔"

جون ۱۹۲۳ء میں جے کار نے مدراس میں ایک تند تقریر کے ذریعے اپنے جذبات کا کھل کر اظہار کیا۔

"میں نے خود عوام کی رہنمائی قید خانوں کی جانب کی ---- سب سے پہلے میرے اپنے بیٹے کو جیل بھیجا گیا۔ پھر میری بیوی اور ان کے بعد مجھے گرفتار کیا گیا ---- میں جانتا تھا کہ ہماری مزاحمت ناقابل تسخیر ہے اور مضبوط ترین حکومت کو بھی اس کے سامنے جھکنا پڑے گا۔ تم (گاندھی) نے اسے تباہ کیا۔ تم نے اسے گمراہ کیا۔ اب تم خود ہی عوام کو چرخہ کاتنے کی تبلیغ کیا کرو اور اکیلے ہی سوت بنا کرو۔"

("میری داستان حیات" از جے کار' جلد سوم' صفحہ ۵۰۹)

("تاریخ کانگریس" از پتہ بھائی میتہ جلد اوّل صفحہ ۲۸۱)

دسمبر ۱۹۲۰ء کی ناگپور کانگریس میں گاندھی جی کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے باوجود سی آر داس کبھی بھی پوری طرح تحریک عدم تعاون سے متفق نہیں ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ مجالس قانون ساز' ڈسٹرکٹ بورڈوں' میونسپل کارپوریشنوں اور دیگر عوامی اداروں کا بائیکاٹ ناکام ثابت ہو چکا ہے اور اب وقت آگیا ہے کہ تحریک کی پالیسی تبدیل کر دی جائے۔ پنڈت موتی لال نہرو بھی ان کے ہم خیال تھا۔ کانگریس کے نامور رکن سی ایس سری نواس آئینگر نے بھی اسی خیال کی تائید کی وہ حال ہی میں مدراس کے ایڈووکیٹ جنرل کے

عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ ان تینوں نے مل کر کانگریس کے اگلے اجلاس میں ایک قرارداد پیش کی جو ۱۹۲۲ء میں گیا میں منعقد ہوا۔ انہوں نے درخواست کی کہ انہیں آئندہ کونسلوں کے انتخابات میں شرکت کی اجازت دی جائے۔ اس وقت گاندھی جی جیل میں تھے۔ ایک نئے رکن اپنی ذہانت کی بناء پر اجلاس پر چھائے رہے ان کا نام چکرورتی راج گوپال اچاریہ تھا۔ یہ گاندھی جی کے سچے پیروکار تھے اور بعد ازاں گاندھی ازم کا بہت مضبوط ستون ثابت ہوئے۔ انہوں نے جذباتی بنیادوں پر حاضرین مجلس سے درخواست کی کہ گاندھی جی کی عدم موجودگی میں ان کے فلسفے میں ملاوٹ کرنا بددیانتی ہے۔ رائے دہی کا نتیجہ راج جی کے حق میں نکلا جس سے سی آر داس کی پوزیشن بہت کمزور ہو گئی۔ وہ کانگریس کے صدر تھے اور ان کی اپنی جماعت نے ہی ان کی پالیسی مسترد کر دی تھی۔ اس لئے انہوں نے فوری طور پر کانگریس سے استعفیٰ دے دیا اور پنڈت موتی لال نہرو اور سری نواس آئینگر کے تعاون سے ایک نئی سیاسی جماعت قائم کرلی۔ جب کہ راجندر پرساد' ولبھ بھائی پٹیل اور راج گوپال اچاریہ نے اس نو قائم شدہ جماعت سے کوئی سروکار نہیں رکھا۔ یہ گاندھی جی کے راسخ العقیدہ پجاری تھے اور انہوں نے خودکو "اٹل دستہ" قرار دے رکھا تھا۔ نئی جماعت کا نام سوراجیہ پارٹی رکھا گیا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ مرکز میں اس کی نمائندگی پنڈت موتی لال نہرو اور بنگال کی مجلس قانون ساز میں سی آر داس کریں گے۔

سوراجیہ پارٹی بنگال میں شرکت کے فوراً بعد سی آر داس نے نہایت تندہی سے بنگال کے مسلمانوں کے مسائل حل کرنے شروع کئے تاکہ سوراجیہ پارٹی پر ان کا اعتماد قائم ہو سکے۔ ادھر بنگالی مسلمانوں کی پسماندگی کا یہ عالم تھا کہ اکثریت میں ہونے کے باوجود وہ صرف ۳ فی صد سرکاری عہدوں تک پہنچ سکے تھے۔ اس کی بڑی وجہ ان کا تعلیم سے محروم ہونا تھا۔ داس ایک حقیقت پسند انسان ہونے کے ناطے جانتے تھے کہ خوشحال مستقبل اور اقتصادی ترقی کی ضمانت کے بغیر مسلمان ان کی جماعت میں شمولیت اختیار نہیں کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے فوری اعلان کیا کہ ان کی حکومت صوبے میں اقتدار

حاصل کرتے ہی تمام سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے کوٹے کے تناسب ۶۰ فی صد کر دے گی جو اس وقت تک برقرار رہے گا جب تک مسلمانوں کو ان کی آبادی کے لحاظ سے نمائندگی نہیں دی جاتی۔ کوکوناڑہ میں کانگریس کے اجلاس سے قبل داس نے اپنی تجویز سے دیگر رہنماؤں کو بھی آگاہ کیا لیکن اجلاس (۱۹۲۳ء) کے دوران کانگریس کے ارکان نے ان کا یہ منصوبہ اس لئے مسترد کر دیا کہ اس میں مسلمانوں کو حد سے زیادہ مراعات دی گئی تھیں۔

تاہم سی آرداس کے مخلصانہ رویے کے باعث بنگال کے مسلمان ان پر نہ صرف اعتماد کرنے لگے بلکہ ان کی رہنمائی قبول کرنے پر بھی تیار ہو گئے۔ مارچ ۱۹۲۴ء میں کلکتہ میں بلدیاتی انتخابات منعقد ہوئے جس میں سوراجیہ پارٹی کے پلیٹ فارم سے مسلمانوں اور ہندوؤں نے شانہ بشانہ انتخاب لڑا حالانکہ یہ جداگانہ بنیادوں پر ہوا تھا۔ کارپوریشن کے پہلے اجلاس ہی میں سی آرداس کو کلکتہ کا میئر اور شہید سہروردی کو ڈپٹی میئر چن لیا گیا۔ بعد ازاں چیف ایگزیکٹو کے عہدے پر سبھاش چندر بوس کو منتخب کیا گیا۔ مسلمانوں نے صرف کلکتہ کارپوریشن ہی میں نہیں بلکہ بنگال کی مجلس قانون ساز میں بھی سی آرداس کی قیادت پر لبیک کہا۔ لیکن قدرت نے سی آر داس کو اپنا کام پورا کرنے کا موقع نہیں دیا اور وہ جون ۱۹۲۵ء میں محض ایک سال کے اندر ہی راہی ملک عدم ہوئے۔ سبھاش چندر بوس ان کے نہایت قریبی اور متوالے دوست تھے۔ ان کی وفات پر بوس کے تاثرات۔

"دیش بندھو سی آرداس کی (۱۶ جون ۱۹۲۵ء) موت ہندوستان کے لئے بہت بڑا صدمہ تھی۔ اگرچہ ان کی عملی سیاسی زندگی محض ۵ برس پر مبنی تھی۔ لیکن ان کی کامیابیاں ناقابل فراموش تھیں۔ وہ ایک ویشنو بھگت کی سی جراتمندی سے سیاست کے منجدھار میں کودے اور دل و جاں سے سوراج کی جنگ لڑی۔ موت کے بعد اب ان کے بچے کھچے اثاثے بھی قوم کی ملکیت ہیں۔ حکومت ان سے خوفزدہ بھی تھی اور شدید متاثر بھی۔ سب کو علم تھا کہ داس اپنے قول کے سچے ہیں۔ وہ ایک اصول پرست اور باکردار

سیاستدان تھے۔ جن سے بات چیت کے ذریعے معاہدے کیئے جا سکتے تھے۔ ان کے نظریات واضح' صاف اور شفاف تھے۔ اپنے سیاسی نظریات میں وہ مضبوط اور اٹل تھے۔ مہاتما کے برعکس وہ اپنے اس کردار سے اچھی طرح آگاہ تھے جو انہیں ہندوستان کی سیاست میں ادا کرنا تھا۔ وہ سب سے بہتر جانتے تھے کہ دشمن سے سیاسی طاقت چھیننے کے موقع قوموں کی زندگی میں بہت کم آتے ہیں اور اگر آئیں تو ان کا دورانیہ طویل نہیں ہوتا چنانچہ اگر بحران لمبا ہو جائے تو کچھ لو' کچھ دو' کے اصول کے تحت ہی اسے حل کرنا مناسب ہوتا ہے۔ وہ اس حقیقت سے بھی آشنا تھے کہ جب عوامی جوش و خروش اپنے عروج پر ہو تو مخالفین سے معاہدہ کرتے ہوئے رہنما کو اپنی مقبولیت بھی داؤ پر لگانی پڑتی ہے اور ایسا موقع بڑے حوصلے اور جرأتمندی کا متقاضی ہوتا ہے۔ ان کی بہادری اور بے خوفی ہی ان کا اصل اثاثہ تھی۔ وہ ایک عملی سیاستدان کی حیثیت سے اپنے حقیقی کردار سے واقف تھے چنانچہ وہ کبھی بھی عدم مقبولیت سے خوفزدہ نہیں ہوئے۔"

("ہندوستان کی جدوجہد" از سبھاش چندر بوس صفحہ ۱۵۸)

اسی کتاب میں بوس مزید لکھتے ہیں۔

"آج ہم پلٹ کر ۱۹۲۵ء کو دیکھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اگر قدرت نے دیش بندھو کو زندگی کے چند برس مزید مستعار دیے ہوتے تو آج ہندوستان کی تاریخ مختلف ہوتی۔ قوموں کی زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ صرف ایک فرد کے منظرنامے پر ابھرنے یا غائب ہونے سے تاریخ کا دھارا پلٹ جاتا ہے۔ ہمارے دور میں بھی ایسی عہد ساز شخصیت گزری ہے جیسے روس میں لینن' اٹلی میں مسولینی اور جرمنی میں ہٹلر"

(ایضاً' صفحہ ۱۶۰)

سبھاش چندر بوس نے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں مہاتما گاندھی اور دیش بندھو سی آر داس کے کرداروں کا الگ الگ تجزیہ کر کے ان کا فرق واضح کیا ہے۔

"دیش بندھو کے برعکس مہاتما کا کردار کبھی بھی واضح اور دو ٹوک نہیں رہا۔ کہیں

کہیں تو وہ نہایت آدرش وادی اور دوربیں مفکر نظر آتے ہیں جب کہ دوسری جگہوں پر وہ خالص مفاد پرست سیاستدان محسوس ہوتے ہیں۔ بعض اوقات تو وہ نہایت ضدی اور انتہا پسند انسان کا روپ اپنائے ہوتے ہیں اور کبھی وہ بچوں کی سی بے بسی سے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ وہ سیاسی سوجھ بوجھ اور معاملہ فہمی سے یکسر محروم رہے۔ ۱۹۲۱ء میں ایسے ہی لین دین کا شاندار موقع آیا جسے گاندھی جی نے نہایت بودے مطالبات کے عوض کھو دیا اور کوئی اعلیٰ معاہدہ نہ کر سکے۔ ۱۹۳۱ء میں ہرچند وہ ایک سیاسی معاہدہ کرنے میں کامیاب ہو گئے لیکن یہاں بھی انہوں نے دیا زیادہ اور لیا کم۔ بحیثیت مجموعی منجھے ہوئے فہیم برطانوی سیاستدانوں کے مقابلے میں گاندھی جی کوئی اصلیت یا مرتبہ نہیں رکھتے تھے۔"

(ایضاً' صفحہ ۵۹-۱۵۸)

یہاں داس کی آخری تقریر سے کچھ اقتباسات پیش خدمت ہیں۔ یہ تقریر انہوں نے اپنی موت سے چند ہفتے قبل فرید پور میں بنگال پراونشل کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے کی۔

"مجھے یقین ہے کہ ہندوستان دنیا کی تاریخ میں نہایت اہم کردار ادا کرے گا۔ اقوام عالم کی دولت مشترکہ کو دینے کے لئے اس کے پاس ایک اہم پیغام ہے۔ جہاں تک برطانیہ کا تعلق ہے میں یہی کہوں گا آپ ہندوستان میں آزادی کی روایات لے کر آئے تھے چنانچہ آپ کو ہماری قومی جدوجہد میں ہم سے تعاون کرنا پڑے گا۔ آخری معاہدے میں ہم بھی آپ کی بات سننے کا حق تسلیم کریں گے۔"

"جہاں تک میرا تعلق ہے میں جس شے کی تلاش میں ہوں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں ہندوستانی ریاستوں کے وفاق کا خواہاں ہوں جس میں ہر ریاست کے کلچر اور روایات کو تحفظ دیا جائے گا۔ ہر وفاقی اکائی' وفاق کی مجموعی خدمت کی پابند ہو گی۔ یہ وفاق آزاد اقوام کا وفاق ہو گا جن کی آزادی کا پیمانہ انسان کی خدمت ہو گا' جن کے اتحاد سے روئے ارض پر پائیدار امن کی امید فروزاں ہو گی۔"

"اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ خواب ایمپائر کی حدود کے اندر شرمندہ تعبیر ہو گا یا اس کے باہر؟ ایمپائر کے اندر کا خیال زیادہ مفید ہے کیونکہ ہمارے دور میں کوئی قوم دنیا سے کٹ کر نہیں رہ سکتی۔ برطانوی ایمپائر جو بہت سی اقوام کی دولت مشترکہ پر مشتمل ہے اگر اپنی اکائیوں کو ڈومینین کی حیثیت دے دے تو ہر اکائی آزادی' خودمختاری اور ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو سکتی ہے اور یہی اس سوراج کے تقاضے ہیں جس کا میں نے خواب دیکھا اور تذکرہ کیا"

"میرے لئے یہ خیال اپنے گہرے روحانی فوائد کے باعث بھی نہایت اہم ہے۔ میں امن عالم اور بالآخر ایک بین الاقوامی وفاق پر ایمان رکھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اگر برطانوی ایمپائر کی عظیم دولت مشترکہ کو کوئی دانا قیادت میسر آئے تو مختلف نسلوں' تہذیبوں اور فلسفہ ہائے حیات سے تعلق رکھنے والے افراد کو ایک لڑی میں پرو کر عالمی وفاق کا قیام عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ یہ وفاق انسانیت کا وفاق ہو گا اگر یہ عظیم مسئلہ حل ہو جائے تو یہ نہ صرف ہندوستان کے لئے بلکہ پوری دنیا کے لئے سود مند ہو گا۔ ہندوستان کو دولت مشترکہ کے اندر رہتے ہوئے آزادی کے لئے جدوجہد کرنی چاہیے۔ اس سے انسانیت کے لاعلاج زخموں کو بھی مرہم فراہم ہو گا۔"

باب نمبر16

کانگریس سے علیحدگی کے بعد جناح کی سرگرمیاں

(۱۹۲۰ء۔۱۹۲۸ء)

اگرچہ جناح نے ڈٹ کر گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون کی مخالفت کی لیکن وہ حکومت کے اس دام میں بھی نہیں پھنسے جو اس نے تحریک کے مخالفین سے فائدہ اٹھانے کے لئے بچھا رکھا تھا۔ انہوں نے حکومت کو انتباہ کرتے ہوئے مندرجہ ذیل اخباری بیان جاری کیا۔

"تحریک عدم تعاون تو عوامی بے چینی کا محض ایک اظہار ہے جس کی وجہ حکومت کی جانب سے رائے عامہ کی مسلسل خلاف ورزی اور عوام کے بڑھتے ہوئے مسائل ہیں -----"

(جناح از ایم ایچ ایس صفحہ ۲۷۹)

جنوری ۱۹۲۲ء میں جناح نے بمبئی میں آل پارٹیز کانفرنس طلب کی۔ جے کاؤنٹ رنجن اس کے سیکرٹری تھے جب کہ کانفرنس کی سربراہی کے فرائض وشواسوریہ نے انجام دیے۔ سب نے حکومت اور کانگریس کو اعتدال پسندانہ رویہ اپنانے کا مشورہ دیا لیکن بے سود۔

۱۹۲۳ء میں جناح مرکزی مجلس قانون ساز میں بطور آزاد امیدوار منتخب ہو گئے انتخاب کے پہلے مرحلے پر سوراج پارٹی نے جناح کے مقابلے میں اپنا امیدوار کھڑا کیا جس کی مخالفت کرتے ہوئے بمبئی کرونیکل نے لکھا۔

"اگرچہ جناح اب کانگریس کے رکن نہیں رہے لیکن انہوں نے بہت سے دوسرے افراد کی طرح نہ تو ملک و قوم کے مقاصد کو نقصان پہنچایا ہے اور نہ اپنے ذاتی کیریر کی خاطر کانگریس سے اپنے اختلافات کو اچھالا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے ملک کے ایک سچے اور خیر خواہ

خادم رہے ہیں۔ چنانچہ اگر آج کانگریس کا کوئی رکن معمولی پارٹی مفادات کے پیش نظر جناح جیسے ذہین' قابل اور تربیت یافتہ شخص کا راستہ روکے تو اس سے بڑھ کر شرم کی کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ مجلس قانون ساز کی رکنیت ان کے مزاج اور تعلیم سے گہری مطابقت رکھتی ہے ایسے انسان کو اس سے محروم رکھنا' ملک کو اس کی صلاحیتوں سے محروم رکھنا ہے"

سوراج پارٹی ایسے ہی دیگر عمدہ دلائل سے قائل ہو گئی اور اُس نے اپنے امیدوار کا نام واپس لے لیا اس طرح جناح بلا مقابلہ مرکزی مجلس قانون ساز کے رکن قرار پائے۔ ۱۹۲۴ء میں جناح مسلم لیگ کے اس اجلاس کے صدر منتخب ہوئے جسے لاہور میں منعقد ہونا تھا۔ اجلاس سے ایک روز قبل انہوں نے ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کو انٹرویو دیتے ہوئے اپنی پالیسی پر روشنی ڈالی۔

"اجلاس کے اغراض و مقاصد کچھ اس طرح ہیں۔

ا ہندوستان کے آئین میں ترمیم

ب پنجاب میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا اور یہاں ہم آہنگی کی خوشگوار فضا پیدا کرنا۔

ج آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان ۱۹۱۶ء جیسی مکمل فکری یکجہتی کے قیام کے لئے کوششیں کرنا۔

مسلم لیگ کوئی بھی ایسی پالیسی وضع نہیں کرے گی جو کانگریس کے نظریات سے متضاد ہو ----- اس کے برعکس مجھے یقین ہے کہ مسلم لیگ کی پالیسی ایسے خطوط پر وضع کی جائے گی۔ جن سے قومی مفادات کو مزید تقویت حاصل ہو۔ تاہم مسلم اقلیت کے خصوصی مفادات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جائے گا"

(جناح از ایچ ایم سید' صفحہ ۳۰۵)

اپنے خطبۂ صدارت میں انہوں نے کہا۔

"سوراج کے حصول کی خواہش کا بنیادی تقاضا ہندو مسلم اتحاد ہے خاص طور پر سیاسی یکجہتی (یہاں جناح کی تقریر میں "سوراج" لفظ کا استعمال اس امر کا شاہد ہے کہ وہ ہندوؤں کی دلداری کو کس قدر عزیز رکھتے تھے) ----- مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کو داخلی خود مختاری اور ڈومینین کی حیثیت اسی روز حاصل ہو جائے گی جس روز ہندو اور مسلمان ایک ہو جائیں گے۔"

(جناح از ایچ ایم ایس' صفحات ۳۱-۳۰۹)

انہوں نے ایک مرتبہ پھر وضاحت کی کہ مسلم لیگ کا بنیادی مقصد ملک میں یگانگت اور بھائی چارے کی وہی فضا پیدا کرنا ہو گا جو ۱۹۱۶ء میں اجلاس لکھنؤ کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناح قطعاً محاذ آرائی کے موڈ میں نہ تھے بلکہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مکمل یکجہتی کے خواہشمند تھے۔ محمد علی جوہر نے اس موقع پر ایک نہایت نامناسب حرکت کی۔ انہوں نے ایک اخباری بیان میں مسلم لیگ اور اس کے نو منتخب سربراہ کا بے حد مذاق اڑایا۔ جناح اس پر سخت دل گرفتہ ہوئے لیکن انہوں نے ضبط و توازن کا شاندار مظاہرہ کیا۔ جواباً انہوں نے ہندوؤں سے اپیل کی کہ ان کی تجاویز کا مذاق اڑانے کی بجائے ان پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کیا جائے۔ انہوں نے اپنی اپیل کا اختتام مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا۔

"آخر میں میں اپنے ہندو رفیقوں سے درخواست کروں گا کہ وہ مسٹر محمد علی کے ہتھکنڈوں سے متاثر نہ ہوں ----- جیسا کہ سب جانتے ہیں میں کبھی بھی جداگانہ نمائندگی اور جداگانہ حق انتخاب کا حامی نہیں رہا لیکن اس مسئلے پر مسلمانوں کی رائے اس قدر پختہ ہے کہ وقتی طور پر اسے تسلیم کر لینا ہی مناسب ہے۔ اس کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ اقلیت میں ہونے کے باوجود مسلمانوں کو تمام اداروں میں مناسب اور موثر نمائندگی مل جائے۔ اس کا فی صد تناسب اور شرح بلحاظ آبادی کا تقرر باہمی صلاح مشورے سے کیا جا سکتا ہے تاکہ میونسپلٹیوں اور مجالس قانون ساز میں مسلمانوں کی شرکت کے منصوبے کو کامیابی سے

ہمکنار کیا جا سکے۔ مجھے امید ہے کہ ہندو میرے خیالات کا غلط مطلب ہرگز نہیں نکالیں گے۔ میں ہمیشہ ایک قوم پرست رہا ہوں اور اگر مسلمانوں کو علیحدہ سے منظم کرنے کی ضرورت پیش آئی بھی تو میں یقین دلاتا ہوں کہ ملکی اور اجتماعی مفادات کو کبھی داؤ پر نہیں لگاؤں گا بلکہ مسلمانوں کو مجموعی قومی دھارے میں شریک کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔

(ایضاً' صفحہ ۳۱۲)

دریں اثناء جناح نے مرکزی مجلس قانون ساز میں اپنا کام جاری رکھا یہاں انہوں نے زیادہ سے زیادہ توجہ فوج میں ہندوستانی عوام کی بھرتی پر مرکوز کی تاکہ فوج کو ایک ملکی اور قومی ادارہ بنایا جا سکے۔ انہی دنوں آئین میں اصلاحات کے لئے سر الیگزینڈر مڈی مین کی زیر سربراہی ایک کمیٹی قائم کی گئی جس میں ہندوستان کے زیرک سیاستدانوں کو شامل کیا گیا۔ جناح بھی اس کمیٹی کے رکن چنے گئے۔ کمیٹی میں کئی ہندو ارکان بھی ان کے شریک کار تھے جن میں سر تیج بہادر سپرو' سر میشو سوامی ایئر اور ڈاکٹر آر پی پرنج پائی قابل ذکر ہیں۔ جناح نے ان کی ہمراہی میں ایک اقلیتی رپورٹ تیار کی۔

نہرو رپورٹ۔ آل پارٹیز نیشنل کنونشن

اپریل ۱۹۲۶ء میں لارڈ ریڈنگ کی جگہ لارڈ ارون وائسرائے بن کر برطانیہ سے ہندوستان آئے۔ نومبر ۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ اس موقعے پر لارڈ برکن ہیڈ نے دارالامراء میں تقریر کرتے ہوئے ہندوستانی سیاستدانوں کو چیلنج کیا کہ اگر وہ کوئی برطانوی فارمولا پسند نہیں کرسکتے تو خود اپنے ملک کے لئے کوئی متفقہ آئین تیار کر لیں۔ مذکورہ کمیشن کا سربراہ لارڈ سائمن کو مقرر کیا گیا۔ ہندوستانی سیاستدانوں نے اس چیلنج کو قبول کرلیا اور دسمبر ۱۹۲۷ء میں کانگریس کا اجلاس مدراس میں ہوا جس کی صدارت دہلی کے قوم پرست مسلم رہنما ڈاکٹر ایم اے انصاری نے کی۔ اس کانگریس میں آل پارٹیز کانفرنس طلب کرنے کی تجویز پیش کی گئی جس کا مقصد ہندوستان کے نئے آئین کا متفقہ خاکہ تیار کرنا تھا۔ یہ کانفرنس ۱۹ مئی ۱۹۲۸ء کو بمبئی میں منعقد ہوئی جہاں نئے آئینی اصول اور ان کی رپورٹ مرتب کرنے کے لئے ایک مختصر کمیٹی تشکیل دی گئی جس کا سربراہ پنڈت موتی لال نہرو کو مقرر کیا گیا۔ اس کمیٹی کی رپورٹ کے مسودے پر پنڈت موتی لال نہرو کے علاوہ سر علی امام' سرتیج بہادر سپرو' مسٹر شعیب قریشی اور سبھاش چندر بوس نے دستخط کئے۔ یہ رپورٹ نہرو رپورٹ کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس رپورٹ پر غور و خوض کے لئے آل پارٹیز نیشنل کنونشن ایک مرتبہ پھر کلکتہ میں طلب کیا گیا۔ اس کا اجلاس ۲۲ دسمبر ۱۹۲۸ء کو ہوا۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ اپنے اپنے سالانہ اجلاس کلکتے ہی میں بلائیں تاکہ مباحث اور خیالات پر مشترکہ اظہار رائے ہو سکے۔

نہرو رپورٹ کی تدوین کے وقت جناح یورپ میں تھے اس لیے وہ اس کی تیاری یا اس پر بحث میں شرکت نہ کرسکے لیکن وہ مذکورہ کنونشن میں شامل ہونے کے لیے خصوصاً یورپ سے ہندوستان آئے۔ ان کا پختہ عقیدہ تھا کہ ہندوستان کی ترقی ایسے ہندو مسلم اتحاد

میں مضمر ہے جس کی بنیاد سیاسی اور سماجی انصاف پر قائم ہو۔ وہ گاندھی جی کے شعبدوں پر کوئی یقین نہ رکھتے تھے اسی لئے انہوں نے تحریک عدم تعاون یا خلافت کی کبھی حمایت نہیں کی۔ ۱۹۲۰ء میں کانگریس کے اجلاس ناگپور میں انہوں نے گاندھی جی کے پروگرام پر احتجاج کرتے ہوئے کہا تھا۔

"میرا راستہ درست راستہ ہے ----- آئینی راستہ ہی صحیح راستہ ہوتا ہے"

۱۹۲۸ء میں برطانوی وزیر خارجہ برائے امور ہند لارڈ برکن ہیڈ نے آل برٹش سائمن کمیشن تشکیل دیا تو مسلم لیگ نفاق کا شکار ہو گئی۔ ایک دھڑا جس کی قیادت سر محمد شفیع کر رہے تھے حکومت کا حامی تھا اور کمیشن سے تعاون کرنا چاہتا تھا۔ جب کہ جناح کا زیر قیادت دھڑا کانگریس کی حمایت میں کمیشن کا بائیکاٹ کرنے کا علمبردار تھا۔ سر محمد شفیع کے دھڑے نے اپنا سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد کیا جب کہ جناح کی مسلم لیگ کا اجلاس طے شدہ پروگرام کے مطابق کلکتے ہی میں ہوا۔ اس موقعے پر جناح نے ایک قرارداد بھی پیش کی جس میں مسلم لیگ کی ایک سب کمیٹی کے قیام کا اعلان کیا گیا جس کا مقصد نئے آئین کی تیاری کے لیے کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ساتھ تعاون کرنا تھا۔ لیگ کونسل نے جناح سے متاثر ہو کر جداگانہ حق انتخاب سے بھی دستبردار ہونے کی حامی بھر لی۔ اس کے لئے صرف ۴ آسان اور قابل عمل شرائط پیش کی گئیں۔

۱۔ سندھ کو الگ اور خود مختار صوبے کا درجہ دیا جائے

۲۔ بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں بھی دیگر صوبوں کی طرح آئینی اصلاحات کی جائیں۔

۳۔ جب تک مذکورہ بالا شرائط تسلیم نہیں کی جاتیں مسلمان جداگانہ طرز انتخاب سے دستبردار نہیں ہوں گے مسلمان مخلوط طرز انتخاب کو صرف اس بنیاد پر قبول کریں گے کہ تمام اداروں میں انہیں آبادی کے لحاظ سے متناسب نمائندگی دی جائے۔ مسلمان اپنے پہلے دو مطالبات کی فوری تعمیل چاہتے ہیں ان کے

علاوہ ان کا ایک مطالبہ اور ہے۔

۴۔ سندھ' بلوچستان اور این۔ڈبلیو۔ایف۔پی میں ہندو اقلیت کو وہی آئینی مراعات حاصل ہوں گی جو ہندو اکثریت کے علاقے میں مسلمان اپنے لئے طلب کر رہے ہیں۔ ہندو اقلیت کو تمام نمائندہ اداروں میں نشستوں کا طے شدہ کوٹا دیا جائے گا۔

کانگریس کا ساتھ دینے کے لئے جناح نے سائمن کمیشن تک کا بائیکاٹ کیا جس سے لارڈ برکن ہیڈ اس قدر سیخ پا ہوئے کہ انہوں نے لارڈ ریڈنگ اور سرجان سائمن کو ہدایت کی کہ وہ بھی ایسے حربے آزمائیں کہ جناح کا کہیں ٹھکانہ نہ رہے اور وہ اپنے میدان میں بالکل تنہا رہ جائیں۔

آل انڈیا نیشنل کنونشن میں سے سرتیج بہادر سپرو' ایم آر جے کار اور جناح نے خطاب کرتے ہوئے اپنے اپنے نقطہ نظر پر روشنی ڈالی۔ سرتیج بہادر سپرو نے کہا۔

"آپ اگر جائزہ لیں تو معلوم ہو گا کہ نامزد ارکان سمیت مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کی نمائندگی صرف ۲۷ فی صد ہے جب کہ مسٹر جناح ۳۳ فی صد کے خواہشمند ہیں۔ ----- میں سمجھتا ہوں کہ آج ہم ایک ایسی صورتحال سے دوچار ہیں جہاں پہلا اور آخری سوال صرف اور صرف اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کا ہے۔ محض منطقی اور عقلی رد عمل اپنا کر میں اس کانفرنس کے ثمرات سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتا۔ اگر وہ (جناح) ایک بگڑا ہوا اور شریر بچہ ہے تو اسے وہ دے دیں جو وہ مانگ رہا ہے تاکہ بات ختم ہو۔ میں انہیں بھی تحمل اور ضبط کی تلقین کروں گا لیکن عملی سیاستدان ہونے کے ناطے آپ کو بھی مسئلے کے حل کے لئے سنجیدہ ہونا پڑے گا"

جے کار نے اپنی تقریر میں کہا۔

"یاد رکھنے کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ معروف مسلمان رہنماؤں اور محب وطن دانشوروں مولانا ابوالکلام آزاد' ڈاکٹر انصاری' سر علی امام' راجہ صاحب

محمود آبا اور ڈاکٹر کچلیو نے نہرو کمیٹی رپورٹ کی حمایت کی ہے۔ مسلم لیگ کے بھی متعدد افراد نہرو رپورٹ کے حامی ہیں۔ اس صورتحال میں جناح مسلمانوں کے ایک مختصر سے گروہ کے نمائندہ ہیں----"

جے کار نے مزید کہا کہ اگر جناح کی مجوزہ ترمیمیں منظور کرلی گئیں تو مجھے بمبئی کے مہاسبھائیوں کو بدترین تشدد سے روکنے کے لئے بے حد محنت کرنی پڑے گی کیونکہ وہ تو پہلے ہی نہرو رپورٹ کی مخالفت میں کٹ مرنے کو تیار ہیں۔ مزید پیش رفت کی صورت میں تو میں اپنے مختلف الخیال ستوں کو خون کی ندیاں بہانے سے ہرگز نہیں روک سکوں گا۔

جناح نے اس کے جو ا۔

"میں یہی چاہتا، ر کہ اپنے مشترکہ مقصد کے حصول کی خاطر ہندو اور مسلمان مل کر قدم بڑھائیں۔ لیکن اکیلی مسلم لیگ اس ضمن میں کیا کرسکتی ہے۔ یہاں تو پورے مسلمانوں کا تعاون درکار ہے۔ میں مسلمانوں کی بجائے ہندوستانی کہنا زیادہ پسند کروں گا۔ میری شدید خواہش یہی ہے کہ سات کروڑ مسلمان شانہ بشانہ ہو کر آزادی کے لئے جدوجہد کریں----- میں آپ سے ایسی سیاسی دانش کا تقاضا کرتا ہوں جس کا تذکرہ سرتیج بہادر سپرو نے کیا ہے۔ اقلیت' اکثریت کو کچھ نہیں دے سکتی چنانچہ ایسے معاملات کو محض "چھوٹے چھوٹے" مسائل کہہ کر مجھے ان پر بات کرنے سے نہ روکیں۔ میں کچھ ترامیم صرف اس لئے نہیں چاہتا کہ میں بگڑا ہوا بچہ ہوں۔ اگر میرے مطالبات چھوٹے اور غیر اہم مسئلے ہیں تو آپ انہیں بلا ہچکچاہٹ مان کیوں نہیں لیتے؟-----"

جناح نے کنونشن کے ارکان کی توجہ کینیڈا اور مصر کی آئینی اصلاحات کی جانب مبذول کروائی۔ انہوں نے کہا کہ اقلیتیں ہمیشہ اکثریت سے خوفزدہ رہتی ہیں کیونکہ آج تک اکثریتوں خصوصاً مذہبی اکثریتوں نے ہمیشہ تشدد اور استبداد کا مظاہرہ کیا ہے۔ چنانچہ اقلیتیں تحفظ کا مطالبہ کرنے میں بالکل حق بجانب ہیں۔ انہوں نے مزید کہا۔

"کچھ سوالات ایسے ہیں جو صرف زبردست سیاسی سوجھ بوجھ' تدبر اور دانائی ہی سے حل ہو سکتے ہیں۔ اس لئے میں ایک مرتبہ پھر کہوں گا کہ حتمی فیصلہ کرنے سے پیشتر ان پر نظر ثانی کر لیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے سمجھنے میں غلطی نہیں کریں گے اور میرے انتباہ کو دھمکی پر بھی محمول نہیں کریں گے۔ اگر آپ یہ مسائل آج حل نہیں کریں گے تو لامحالہ کل ہمیں یہ خود حل کرنے پڑیں گے لیکن اس صورت میں ہمارے قومی مفادات کو بھی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ ہم بھی اسی زمین کے فرزند ہیں۔ ہمیں اکٹھے رہنا ہے' اکٹھے کام کرنا ہے ہمارے اختلافات خواہ کسی بھی نوعیت کے ہوں ہمیں کسی قیمت پر مزید خونریزی نہیں کرنی چاہئے۔ اگر ہم متفق نہیں ہو سکتے کم از کم ہمیں اختلاف کرنے کے حق پر متفق ہو جانا چاہئے۔ بہتر ہے کہ ہم دوستوں کی طرح جدا ہو جائیں۔ یقین کریں کہ ہندوستان اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک مسلمان اور ہندو متحد نہیں ہوتے۔ میں آج بھی یہی چاہتا ہوں کہ کوئی منطق یا فلسفہ ہمارے راہ کی دیوار نہ بنے۔ میری خوشی صرف اور صرف ہندو مسلم اتحاد میں مضمر ہے"

(جناح از ایم ایچ سید' صفحات ۳۵۔۴۳۴)

ایسی تقریر یقیناً ہندو مسلم اتحاد کا سفیر ہی کر سکتا تھا۔ یہ کوشش انہوں نے خلوص نیت اور تہہ دل سے کی تھی۔ اس کے باوجود کنونشن کے ہندو اور سکھ شرکاء نے تقریر کی پذیرائی نہیں کی۔ جناح کے خطوط پر چلتے ہوئے سکھوں نے بھی انتہا پسندانہ مطالبات کیے جس سے ہندو مہاسبھا کے مندوبین بے حد مشتعل ہوئے اور انہوں نے کسی کو بھی مزید رعایات دینے سے بالکل انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ جتنی رعایتیں نہرو رپورٹ میں دی جا چکی ہیں وہ پہلے ہی بہت کافی ہیں۔ کانگریس سے تعلق رکھنے والے ارکان نے بھی جناح کی تقریر پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ ان کا موقف تھا کہ جناح محض محدود تعداد کے فرقہ پرست

مسلمانوں کی نمائندگی کر رہے ہیں جنہیں غیر ضروری اہمیت ہرگز نہیں دی جانی چاہیے۔ جناح اس کنونشن سے نہایت زخمی اور شکستہ دل لے کر لوٹے۔ اس کنونشن کا ماحصل صفر رہا۔

مارچ ۱۹۹۲ء میں نہرو رپوٹ پر بحث و تمحیص کے لئے مسلم لیگ کا اجلاس دہلی میں بلایا گیا۔ اس اجلاس میں شدید اختلاف رائے دیکھنے میں آیا۔ ان حالات میں مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر کو اکٹھا کرنے کے لئے جناح نے اپنے معروف ۱۴ نکات پیش کئے جو کچھ اس طرح سے ہیں۔

۱۔ آئندہ آئین وفاقی طرز کا ہو جس میں صوبوں کو زیادہ سے زیادہ داخلی خود مختاری دی جائے ۔

۲۔ صوبوں کو یکساں خود مختاری اور اختیارات دیے جائیں۔

۳۔ تمام مجالس قانون ساز اور منتخب اداروں میں اقلیتوں کو واضح اصولوں کے مطابق موثر نمائندگی دی جائے۔ یہ اصول ہر صوبے میں یکساں لاگو ہوں۔ اس امر کا خیال رکھا جائے کہ کہیں بھی اکثریت اقلیت میں تبدیل نہ ہو۔

۴۔ مرکزی قانون ساز اداروں میں کم از کم مسلم نمائندگی ایک تہائی ہونی چاہیے۔

۵۔ مذہبی اقلیتوں کی نمائندگی کے لئے جداگانہ طرز انتخاب کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ اگر کوئی اقلیت خود چاہے تو اپنی رضامندی سے اس طرز انتخاب سے دستبردار ہو سکتی ہے۔

۶۔ اگر صوبوں کی جغرافیائی حد بندی از سر نو کرنا مقصود ہو تو اس امر کا خیال رکھا جائے کہ اس سے پنجاب، بنگال اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں مسلم آبادی کی اکثریت پر زد نہ پڑے۔

۷۔ اقلیتوں کو ہر قسم کی مذہبی آزادی دی جائے۔

۸۔ کسی بھی مجلس قانون ساز یا منتخب ادارے میں کوئی بل یا قرارداد اس صورت

میں منظور نہیں ہو سکے گی۔ اگر اس مجلس کے تین چوتھائی ارکان اس بل کی مخالفت کریں۔ خاص طور پر اگر یہ بل کسی خاص مذہب یا فرقے کے مفادات سے متصادم ہو تو اس کے ۳/۴ ارکان کی حمایت کے بغیر اس کی منظوری ممکن نہ رہے

۹۔ سندھ کو بمبئی سے الگ کر دیا جائے۔

۱۰۔ دیگر صوبوں کی مانند بلوچستان اور این ڈبلیو ایف پی میں بھی اصلاحات کی جائیں۔

۱۱۔ آئین میں ایسی اصلاحات کی جائیں جن سے مسلمانوں کی سول سروس اور بلدیاتی اداروں میں متناسب نمائندگی کو تحفظ حاصل ہو (تاہم یہ کوٹا میرٹ کی شرائط سے مستثنیٰ نہیں ہو گا)۔

۱۲۔ مسلمانوں کے کلچر کو آئینی تحفظ فراہم کیا جائے۔ مسلمانوں کو تعلیم اور پرسنل لاء کی ترویج کا حق حاصل ہو۔ زبان اور وقف املاک کی بقاء کے لئے انہیں بھی ریاستی وسائل اور سرکاری امداد سے پورا پورا حصہ دیا جائے۔

۱۳۔ ہر صوبائی اور مرکزی کابینہ میں کم از کم ایک تہائی مسلم وزراء کو ضرور شامل کیا جائے۔

۱۴۔ وفاقی اکائیوں کی منظوری کے بغیر مرکزی مقننہ کو کسی آئینی ترمیم کا اختیار نہ دیا جائے۔

کسی بھی واقعے کے ظہور کے بعد دانشمند بن جانا بہت آسان ہوتا ہے لیکن اصلی دانشمندی وہ ہے جو نقصان اٹھانے سے پہلے دکھائی جائے۔ اگر جناح، نہرو کمیٹی کی تشکیل کے وقت یورپ نہ گئے ہوتے تو یقیناً آج خطے کی تاریخ مختلف ہوتی۔ اس صورت میں وہ رپورٹ بننے سے پہلے اس پر عمدہ اور مدلل رائے دیتے اور اس میں اپنا نقطۂ نظر ہر حال میں شامل کروانے میں کامیاب رہتے کیونکہ نہرو رپورٹ اور جناح کے مطالبات میں کوئی

لمبا چوڑا فرق نہ تھا۔ یہاں تک کہ ان کے ۱۴ نکات بھی جارحانہ مطالبات پر مبنی نہ تھے اگرچہ اس دور میں کانگریسی ارکان ان سے بے حد مشتعل ہوئے تھے۔ کانگریس کا اس دور میں خیال تھا کہ یہ نکات بعض ایسے ذہنوں کی اختراع ہیں جو نمائندہ کم اور محض مشہور زیادہ ہیں اس لئے انہیں حقارت سے مسترد کر دینا چاہیے۔ لیکن بعد کے واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر کانگریس کے ارکان نے سر تیج بہادر سپرد کی بات مان لی ہوتی تو وقت کا پہیہ دوسرا رخ اختیار کر لیتا۔ آل پارٹیز کنونشن کی ناکامی ایک غیر ملکی مبصر کی نظر میں۔

"کانگریس کے لئے یہ ایک بہت اچھا موقع تھا جس سے فائدہ اٹھا کر وہ جناح سے بات چیت کے علاوہ مسلم لیگ سے دیرپا معاہدہ کر سکتی تھی۔ اگر کانگریس اس وقت دانشمندی کا ثبوت دیتی تو مسلم لیگ کا وہ قدامت پسند دھڑا خود بخود تنہا رہ جاتا جس کی قیادت سر محمد شفیع اور حمایت انگریز کر رہے تھے۔ لیکن نہرو رپورٹ کا نتیجہ اس کے عین برعکس نکلا۔ اس کی پالیسی نے مسلم لیگ کے نفاق کو دور کر کے دونوں دھڑوں کو متحد کر دیا۔

(پاکستان از خالد بن سعید' صفحہ ۶۸)

چودھری خلیق الزمان نے بھی کنونشن کی ناکامی پر اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔ وہ خود بھی اس کنونشن میں شریک تھے۔ چودھری صاحب اپنی کتاب "شاہراہ پاکستان" کے صفحہ ۹۸ پر لکھتے ہیں۔

"ہندو سیاستدانوں کی کوتاہ بینی کی مثال ڈھونڈنا مشکل ہے' خصوصاً اس موقع پر تو انہوں نے شدید کم نظری کا مظاہرہ کیا۔ مسلمانوں نے اپنے قیمتی ترین مفاد یعنی جداگانہ طرز انتخاب تک سے دستبردار ہونے کی پیش کش کر دی تھی۔ کسی بھی دور اندیش سیاستدان کو ہر قیمت پر اس موقعے سے فائدہ اٹھا لینا چاہیئے تھا۔ لیکن قضا و قدر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اگرچہ اس وقت مسلم رائے عامہ منقسم تھی لیکن کانگریس سوجھ بوجھ سے کام لے کر نہ صرف مسلمانوں کو متحد کر سکتی تھی بلکہ مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو تحریک آزادی میں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر سکتی تھی۔"

عملی سیاست میں گاندھی جی کی واپسی سبھاش جواہر اتحاد کا خاتمہ ○ جواہر لال اور کانگریس کی صدارت

(۱۹۲۹ء)

۱۰ مارچ ۱۹۲۲ء کو بغاوت کے الزام میں گاندھی جی کو گرفتار کر لیا گیا اور ایک ہفتے بعد انہیں ۶ برس قید سخت کی سزا سنائی گئی۔ لیکن جیل کے ہسپتال میں ایک بڑے آپریشن کے بعد انہیں ۵ جنوری ۱۹۲۴ء کو رہا کر دیا گیا۔ بحالیٔ صحت کی خاطر وہ بمبئی کے نواح میں ساحلی مقام جوہو چلے گئے۔ سی آر داس اور پنڈت موتی لال نہرو ان کی عیادت کے لئے وہاں جایا کرتے تھے۔ ہمیشہ کی طرح انہوں نے محسوس کیا کہ گاندھی جی ان کی سوراج پارٹی کی پالیسی کو سخت ناپسند کرتے ہیں وہ کونسلوں کا انتخاب لڑنے پر اس سے شدید ناراض ہیں اور ان سے تعاون پر آمادہ نہیں۔ تاہم وہ ان کی مخالفت بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ طویل گفت و شنید کے بعد گاندھی جی کے دل میں ان دونوں کے لئے نرم گوشہ پیدا ہوا اور وہ اس بات پر رضامند ہو گئے کہ ملک میں سیاسی مہم کی نگرانی داس اور موتی لال کریں جب کہ وہ اپنی مکمل توجہ چرخہ کاتنے پر مرکوز رکھنا چاہتے تھے۔ چرخہ کاتنے اور کھدر بنانے کے لئے گاندھی جی نے ایک بالکل علیحدہ تنظیم قائم کی جس کا نام آل انڈیا سپنرز ایسو سی ایشن تھا۔ اس کا کانگریس یا سوراج پارٹی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کے بعد لگ بھگ چار برس تک وہ عملی سیاست سے یکسر الگ تھلگ رہے۔ صرف ۱۹۲۴ء میں انہوں نے کانگریس کے اجلاس بلگاؤں کی صدارت کی۔ ۱۹۲۸ء میں وہ اپنی خود ساختہ تنہائی یا علیحدگی سے نکل آئے اور دوبارہ کانگریس کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔

اس دور کے سیاسی حالات اور گاندھی جی کی کانگریس میں واپسی کے متعلق پتہ بھائی سیتا رمیا اپنی کتاب' "کانگریس کی تاریخ" میں لکھتے ہیں۔

"ہم یہاں اپنے قاری کو بتانا چاہتے ہیں کہ گاندھی جی اپنے خلوت کدے سے نکل کر کلکتہ کس طرح آئے ----- ۱۹۲۸ء میں جب کانگرس کا اجلاس دسمبر میں ہونے والا تھا موتی لال نہرو نے خود کو عجیب و غریب صورتحال میں گھرا ہوا پایا -----"

۱۹۲۸ء کے اجلاس میں پنڈت موتی لال نہرو کانگریس کے صدر منتخب قرار پائے لیکن نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد نہایت جوش و خروش سے کانگریس کی قیادت سبھاش چندر بوس کو سونپنے کی متمنی تھی جن کے سیاسی افکار اور سرگرمیوں سے گاندھی جی ہمیشہ غیر متفق رہے تھے۔ دیش بندھو سی آرداس کی وفات کے بعد سب سے اہم سوال یہی تھا کہ بنگال میں ان کا کانگریسی جانشین کون ہو گا۔ گاندھی جی سبھاش چندر بوس کی نسبت جے ایم سین گپتا کو بہتر امیدوار خیال کرتے تھے اور انہی کی حمایت سے گپتا سوراج پارٹی کے قائد' کلکتہ کارپوریشن کے میئر اور بنگال کانگریس کمیٹی کے صدر بنے۔ تہرے عہدوں کا یہ تاج سی آرداس کے بعد گاندھی جی نے جے ایم سین گپتا کے سر پر رکھ دیا۔ سبھاش چندر بوس بھی چپ بیٹھنے والوں میں سے نہ تھے۔ انہوں نے کانگریس میں ایک بائیں بازو کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ اجلاس کلکتہ کا بنیادی مقصد نہرو رپورٹ پر بحث کرنا تھا۔ نہرو رپورٹ میں ہندوستان میں فرقہ وارانہ مسائل کو حل کرنے اور ڈومنین کی حیثیت قبول کرنے سے متعلق کچھ سفارشات پیش کی گئی تھیں۔ فارورڈ بلاک کے سبھاش چندر بوس کے لئے ڈومنین کی حیثیت کو قبول کرنا یکسر ناممکن تھا کیونکہ کانگریس کے اجلاس مدراس میں مکمل آزادی کی قرارداد منظور کی جا چکی تھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو یورپ کے طویل دورے سے لوٹنے کے بعد خود بھی کانگریس کے بائیں بازو میں شامل ہو چکے تھے۔ اس دوران انہوں نے یورپ کے ممالک میں ہونے والی جدید ترین سماجی' سیاسی اور اقتصادی اصلاحات کا بہ نظر غائر جائزہ لیا۔ وہ انقلاب روس سے خصوصاً متاثر ہوئے۔ سوشلسٹ

ممالک کے دورے کے بعد وہ سوشلزم کے قائل ہو گئے خاص طور پر روسی کمیونزم میں تو انہیں پوری دنیا کے لئے امید کا پیغام نظر آیا۔ مندرجہ ذیل اقتباس جو ان کی خود نوشت سوانح حیات سے لیا گیا ہے ان کے اس دور کے خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔

"یورپ سے لوٹتے ہوئے میں نے گہرا جسمانی و ذہنی سکون محسوس کیا ----- میں توانائی، شادابی اور زندگی کی امنگ سے لبریز تھا۔ میں نے اس شدید کربناک اندرونی کشمکش کو غائب پایا جو مجھے عمر بھر ستاتی رہی تھی۔ مجھے لگا کہ جیسے میرا نقطہ نظر وسیع ہو چکا ہے اور نیشنلزم (قوم پرستی) مجھے ایک محدود اور غیر مناسب فلسفہ معلوم ہونے لگا ہے ----- (مجھے محسوس ہونے لگا) سماجی آزادی اور معاشرے اور ریاست کے اشتراکی ڈھانچے کے بغیر ملک اور فرد، دونوں کی ترقی ناممکن ہے ----- یورپ اور امریکہ میں ہونے والی وسیع اقتصادی اور سماجی تبدیلی کے مطالعے نے مجھے بہت لطف دیا۔ اپنے کچھ ناپسندیدہ پہلوؤں کے باوجود سودیت رشیا نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس (روس) کے پاس پوری دنیا کو دینے کے لئے امید کا پیام موجود ہے"

(صفحہ ۱۶۶)

مذکورہ بالا اقتباس کا آخری جملہ خصوصاً اہمیت کا حامل ہے۔ ان خیالات کا مالک انسان کانگریس کے دائیں بازو میں کسی طور پر بھی جذب نہیں ہو سکتا تھا جو کہ اب تک سرمایہ داروں کی منظم جماعت بن چکی تھی اور اسے ملک بھر کے سرمایہ داروں کی پشت پناہی بھی حاصل تھی۔ ان حالات میں جواہر لال نہرو کا، بائیں بازو کی جانب راغب ہونا اور سبھاش چندر بوس سے بغل گیر ہونا فطری اور لازمی امر تھا۔ سبھاش چندر بوس کی دی انڈی پنڈینس آف انڈیا لیگ اور جواہر لال نہرو کی طلسمی شخصیت، ہندوستانی نوجوانوں کے خوابوں کا محور بن گئیں۔ اس بائیں بازو کی طاقت اور مقبولیت سے نیم خوفزدہ ہو کر کانگریس کے دائیں بازو نے پھر سے گاندھی جی کی جانب رجوع کیا۔ دائیں بازو میں کانگریس کے عمر رسیدہ اور پرانے ارکان شامل تھے جنہوں نے گاندھی جی سے اصرار کیا کہ

وہ اپنی عزلت گزینی ترک کر دیں۔ اس میں کوئی شبہ نہ تھا کہ وہ پرانی پیڑھی کے سب سے زیادہ تجربہ کار اور محترم رہنما تھے جن کی عوامی مقبولیت آج بھی لاثانی تھی۔ نوجوانوں کی مخالفت کے علاوہ' دائیں بازو کو محنت کشوں کی تحریک سے بھی شدید خطرہ لاحق تھا۔ ۱۹۲۰ء کے بعد ملک بھر کے محنت کشوں نے خود کو منظم کرنا شروع کر دیا تھا اور اب وہ ملکی منظر نامے پر فیصلہ کن طاقت کی حیثیت سے ابھر رہے تھے۔ وہ غیر ملکی استعمار کے خلاف ہی نہیں بلکہ اپنے ملک کے استبدادی سرمایہ داروں کی خلاف بھی برسرپیکار تھے۔ جو بری طرح ان کا استحصال کر رہے تھے۔ مزدوروں کی تحریک صنعتی ترقی کے مراکز بمبئی اور گجرات میں تیزی سے زور پکڑ رہی تھی۔ مزدوروں کی انجمنوں میں گرنی کام گار یونین' یونین آف ٹیکسٹائل ورکرز آف بمبئی اینڈ احمد آباد' ٹاٹا ورکرز یونین' ریلوے ورکرز یونین اور جیوٹ ورکرز یونین آف کلکتہ قابل ذکر تھیں۔ یہ انجمنیں اب مزدوروں کی طاقت کا نشان بن رہی تھیں۔ متعدد یونینوں کے رہنما بائیں بازو کی کانگریس کے قوم پرست نوجوان تھے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ گاندھی جی کبھی بھی سوشلزم کے حامی نہیں رہے کیونکہ ان کے سرپرستوں کی بڑی تعداد سرمایہ داروں پر مشتمل تھی اور وہ ان پر بے حد اعتماد کرتے تھے۔ وہ سرمایہ داری کو درست اقتصادی نظام مانتے تھے۔ ان کا فلسفہ محض یہ تھا کہ اہل ثروت کو اپنی دولت غریبوں کی فلاح کے لئے خرچ کرنی چاہئے۔ چونکہ وہ ویش خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس لئے یہ خیال انہیں ورثے میں ملا تھا۔ سبھاش نہرو مشترکہ قیادت کا سحر' محنت کشوں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور ملک میں اشتراکی نظریات کی مقبولیت' ان عوامل نے کانگریس کے دائیں بازو کو اس قدر خوفزدہ کیا کہ وہ گڑگڑاتے ہوئے گاندھی جی کے قدموں میں گرنے پر مجبور ہو گیا۔ ان رہنماؤں کو ڈر تھا کہ بائیں بازو کے نوجوان پوری کانگریس پر قابض ہو جائیں گے۔ گاندھی جی نے بھی اندازہ کر لیا تھا کہ اگر سوشلزم کے "فتنے" کو جڑ پکڑنے سے پہلے نہ کچلا گیا تو یہ پوری کانگریس کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ چنانچہ وہ یہی بیڑا اٹھا کر ۱۹۲۸ء میں سیاسی میدان میں لوٹ آئے اور

کانگریس کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ اس برس کانگریس کا اجلاس کلکتہ میں ہوا' جس کی صدارت پنڈت موتی لال نہرو نے کی۔ گاندھی جی نے کچھ غیر معمولی اقدامات کیے اور اجلاس کی بنیادی قرارداد خود پیش کی لیکن سبھاش اور جواہرلال دونوں نے ان کی مخالفت کی۔ گاندھی جی کی قرارداد کا متن درج ذیل ہے۔

"ملک کی گھمبیر سیاسی صورتحال کے پیش نظر کانگریس نہرو دستور کو مکمل طور پر منظور کرے گی بشرطیکہ برطانوی پارلیمنٹ بھی اسے ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء سے پہلے منظور کرے۔ لیکن اگر اسے مذکورہ تاریخ تک منظور نہ کیا گیا یا اس سے پہلے مسترد کر دیا گیا تو کانگریس اپنی تحریک عدم تشدد اور عدم تعاون شروع کر دے گی اور سرکار کو ہر قسم کے محصولات کی ادائیگی روک دی جائے گی۔ احتجاج کے دیگر ذرائع وضع کر کے ان پر بھی عمل درآمد کیا جائے گا

گاندھی جی کی قرارداد کی مخالفت میں سبھاش اور جواہرلال نے مندرجہ ذیل ترمیم پیش کی۔

"کانگریس' اجلاس مدراس کی قرارداد کی مکمل حمایت کا اعلان کرتی ہے جس میں کلی خود مختاری کو ہندوستانی عوام کا نصب العین قرار دیا گیا تھا۔ اگر برطانوی حکومت سے کسی قسم کا ناطہ برقرار رکھا گیا تو حقیقی آزادی حاصل نہیں ہو سکے گی"

جب اس ترمیم پر رائے شماری ہوئی تو اس کے حق میں ۹۷۳ ووٹ اور مخالفت میں ۱۳۵۹ ووٹ پڑے۔ دراصل گاندھی جی کی قرارداد کے لئے رائے ہموار کرنے کے لئے زبردست مہم چلائی گئی تھی۔ گاندھی جی نے یہاں تک کہا کہ اگر ان کی قرارداد ناکامی سے دوچار ہوئی تو وہ نہ صرف کانگریس بلکہ ملکی سیاست سے ہمیشہ کے لئے کنارہ کش ہو جائیں گے۔ اگرچہ گاندھی جی جیت گئے لیکن انہیں بائیں بازو کی زبردست طاقت کا بھی اندازہ ہو گیا۔ گاندھی جی بائیں بازو کو نیست و نابود کرنے کا تہیہ کر چکے تھے۔ لیکن انہیں یہ

احساس ہو گیا کہ یہ کام انہیں نہایت ہوشیاری اور سیاسی چالبازیوں سے کرنا ہو گا۔ شاطرانہ انداز میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ وہ جذبات سے عاری ولبھ بھائی پٹیل' انتہائی پرسکون راجندر پرشاد اور بے حد زیرک راج گوپال اچاریہ کو سوشلزم کے خلاف لاحاصل سر کھپاتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ایک اور آزمودہ ترکیب استعمال کی' کیوں نہ مخالف کا گلا دبا دینے کے لئے پہلے اسے گلے سے لگا لیا جائے؟ انہوں نے ارادہ کیا کہ اگلے برس کانگریس کے اجلاس میں وہ خود بھی آزادی کامل کا مطالبہ کریں گے تاکہ کانگریس کے دونوں بازوؤں کا نظریاتی اختلاف کم کیا جا سکے۔ ان کی اگلی چال جواہر لال اور سبھاش کی جوڑی کو توڑنا اور جواہر لال کو دوبارہ اپنے جال میں پھانسنا تھا۔ جواہر لال کی پہلی ملاقات گاندھی جی سے ۱۹۱۸ء میں کانگریس کے اجلاس لکھنؤ کے دوران ہوئی تھی اور وہ ایک ہی نظر میں گاندھی جی کے مداح بن گئے تھے۔ جب گاندھی جی نے تحریک عدم تعاون کا آغاز کیا تو جواہر لال نے دل و جان سے گاندھی جی کا ساتھ دیا اور وکالت کی پریکٹس تک ترک کر دی۔ وہ گاندھی کے اس قدر وفادار تھے کہ انہوں نے اپنے والد موتی لال نہرو کی سوراج پارٹی میں بھی شمولیت اختیار نہیں کی بلکہ گاندھی جی کی راہ پر ہی چلنا پسند کیا۔ لیکن یورپ اور سوویت رشیا کے طویل دورے کے بعد ان کے سیاسی افکار میں گہری تبدیلی واقع ہوئی۔ یہ ۱۹۲۷ کا ذکر ہے جواہر لال کے نئے نظریات' گاندھی جی اور کانگریس کے دائیں بازو کے ارکان کے خیالات سے متصادم تھے۔ جواہر لال کی بائیں بازو میں شمولیت سے اس کی طاقت اور مقبولیت میں بے پایاں اضافہ ہوا جس کا اندازہ ۱۹۲۸ کی ووٹنگ سے ہو سکتا ہے۔ گاندھی جی نے جان لیا تھا کہ جواہر لال کو دوبارہ اپنی جانب مائل کئے بغیر وہ بائیں بازو کی قوت نہیں توڑ سکتے۔ کانگریس پر بلا شرکت غیرے اپنی حکمرانی بحال کرنے کے لئے پہلے سبھاش اور جواہر لال کی جوڑی کو اور بعد میں کانگریس کے فارورڈ بلاک کو توڑنا ہو گا۔

اگست ۱۹۲۹ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس سے پہلے ایک نشست اس بات کے فیصلے کے

لئے منعقد ہوئی کہ اجلاس لاہور کی صدارت کون کرے گا۔ صوبائی کمیٹیوں کی اکثریت گاندھی جی کے حق میں تھی لیکن گاندھی جی نے نہ صرف یہ اعزاز قبول کرنے سے انکار کر دیا بلکہ خود جواہرلال کا نام صدارت کے لئے پیش کیا۔ یاد رہے کہ اس سے قبل جواہر لال کبھی بھی کانگریس کے کسی اعلیٰ عہدے پر فائز نہیں ہوئے تھے انہوں نے صرف ایک مرتبہ پارٹی کے سیکرٹری کے فرائض انجام دئے تھے۔ چنانچہ گاندھی جی نے جب جواہرلال کو ایسے بلند مرتبے کے لئے منتخب کیا تو دائیں بازو کے ارکان میں غم و غصے کی شدید لہر دوڑ گئی کیونکہ وہ ابھی جواہرلال کو نو آموز اور کل کا بچہ تصور کرتے تھے۔ ان کے خیال میں صدارت کے بہترین امیدوار بلکہ مستحق ولبھ بھائی پٹیل تھے۔ جنہوں نے حال ہی میں بردولی کے کاشتکاروں کی تحریک میں شاندار کردار ادا کیا تھا اس تحریک کی کامیابی نے ولبھ بھائی کو ملک گیر مقبولیت کا سیاسی لیڈر بنا دیا تھا حالانکہ اس سے قبل ان کی شہرت محض گجرات تک محدود تھی۔ ان کی خدمات کے صلے میں گاندھی جی نے انہیں "سردار" کہنے کی ہدایت خود جاری کی۔ سردار کا خطاب انہیں بردولی کے کسانوں نے عقیدتاً دیا تھا جسے گاندھی جی نے ان کے نام کا مستقل حصہ بنا دیا اور وہ ہندوستان کی تاریخ میں سردار پٹیل کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان حالات میں عوام اور سینیئر سیاسی رہنما اس بات پر متفق تھے کہ گاندھی جی کی معذرت کی صورت میں صرف پٹیل ہی کانگریس کی صدارت کے اہل ہیں۔ لیکن گاندھی جی کے عزائم کچھ اور تھے جن کی تکمیل کے لئے بہترین مہرہ جواہرلال ہی تھے۔ اپنی خود نوشت میں جواہرلال نے بڑے دلچسپ اور دلسوز انداز میں اس پورے واقعے کا تذکرہ کیا ہے کہ کس طرح وہ اس غیر متوقع اعزاز سے ششدر رہ گئے۔

"صوبائی کمیٹیوں نے عہدہ صدارت کے لئے گاندھی جی کا نام تجویز کیا۔ لیکن انہوں نے صدارت قبول نہیں کی ----- آخری لمحے پر انہوں نے میرا نام پیش کیا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی اس پر دم بخود رہ گئی ----- اس صورتحال پر کمیٹی کے متعدد ارکان نے غصے کا اظہار بھی کیا۔ لیکن آخر میں خانہ پری کی غایت سے انہوں نے نیم دلی سے میرا نام

منظور کر لیا۔ ایسے انتخاب سے مجھے نہایت شرمندگی اور ہزیمت محسوس ہوئی۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ بہت بڑا اعزاز ہے لیکن جس طریقے سے مجھے یہ ملا وہ نہایت شرمناک تھا اگر میرا انتخاب معمول کے طریق کار سے ہوا ہوتا تو میرے لئے اس سے بڑھ کر کوئی مسرت نہ ہوتی۔ میں کانگریس کے اس اعلیٰ ترین عہدے تک سیدھے یا پہلوی راستے سے نہیں بلکہ چور دروازے سے پہنچا تھا۔ یہ واقعہ اس قدر اچانک تھا کہ کانگریس کے تمام ارکان ہکا بکا رہ گئے اور انہیں اسے تسلیم کرنے میں سخت پس و پیش ہوئی۔ تاہم کانگریس کے ارکان نے غیر معمولی ڈسپلن اور کردار کا مظاہرہ کیا اور اہم دوا کی طرح مجھے نگل لیا۔ میری خود داری بری طرح مجروح ہوئی اور مجھے اس عزت پر ندامت محسوس ہونے لگی لیکن میں نے بڑی محنت سے خود پر قابو پایا اور بوجھل دل سے مجلس سے اٹھ آیا۔ تاہم ایک انسان اس موقعے پر غیر معمولی مسرور تھا' وہ میرے والد تھے"

(صفحات ۱۹۵-۱۹۴)

آیئے اب دوبارہ سائمن کمیشن کی جانب رجوع کریں۔ یہ کمیشن ٹوری حکومت نے قائم کیا جس کے وزیر اعظم سٹینلے بالڈون تھے۔ لیکن ۱۹۲۹ء میں ان کی حکومت ختم ہو گئی اور ریمزے میکڈونلڈ کی قیادت میں لیبر پارٹی نے اقتدار سنبھال لیا۔ وتیج وڈ بین کو وزیر خارجہ برائے امور ہند مقرر کیا گیا جن کے مشیر لارڈ اروِن بنے۔ لارڈ اروِن جون ۱۹۲۹ء میں ہندوستان سے انگلستان گئے اور اسی برس اکتوبر میں واپس ہندوستان لوٹ آئے۔ اپنی واپسی پر انہوں نے اعلان کیا کہ برطانوی حکومت نے سائمن کمیشن کی رپورٹ پر غور کے لئے انگلستان میں گول میز کانفرنس بلانے کا فیصلہ کیا ہے جس میں ہندوستان کے نمائندوں کو بھی مدعو کیا جائے گا تاکہ حکومت برطانیہ سمیت تمام فریقوں کی رائے کو خاطر خواہ عملی جامہ پہنایا جا سکے۔ ہندوستان بھر میں اس اعلان پر گرمجوشی کا اظہار کیا گیا اور ملک کی سیاسی فضا وقتی طور پر پر سکون ہو گئی۔ ہندوستانی مجلس قانون ساز کے صدر کی حیثیت سے ولبھ بھائی پٹیل نے تمام سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کا اجلاس دہلی میں طلب کیا۔ ان رہنماؤں

نے ایک متفقہ منشور جاری کیا جس میں وائسرائے کے اعلان نامے کو مشروط طور پر قبول کیا گیا تھا۔ منشور کی سب سے اہم شرط یہ تھی کہ مجوزہ گول میز کانفرنس میں ہندوستان کو مکمل ڈومینین کی حیثیت دی جائے اس سے کم پر کوئی بات نہیں ہو گی۔ اس منشور پر دستخط کرنے والوں میں گاندھی جی، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت مدن موہن سرتیج بہادر سپرو شامل تھے۔ سبھاش چندر بوس کے زیر اثر پہلے تو جواہر لال نہرو نے اس منشور پر دستخط کرنے میں ہچکچاہٹ ظاہر کی لیکن بعد ازاں وہ گاندھی جی کے بھرے میں آگئے جس کا انہیں عمر بھر افسوس رہا۔ بمبئی کے سیاستدانوں نے ایک علیحدہ منشور جاری کیا جس میں اس قرارداد پر اطمینان کا اظہار کیا گیا تھا ان سیاستدانوں کی سربراہی جناح اور چیمن لال سیتل واد نے کی۔

لارڈ اروِن ہندوستانی سیاستدانوں سے ملاقات اور باہمی افہام و تفہیم کے لئے سخت بے تاب تھے۔ ولبھ بھائی پٹیل نے اس موقع پر ان کی بے حد مخلصانہ مدد کی۔ جناح کی بھی شدید خواہش تھی کہ لارڈ اروِن کے دست دوستی کو تھام لیا جائے اور اسے جھٹکنے کی غلطی ہرگز نہ کی جائے۔ اسی خیال کے تحت وہ خود سابر متی گئے اور گاندھی جی کو وائسرائے سے ملاقات اور دوستانہ انداز اپنانے کے لئے قائل کیا۔ وائسرائے اور ہندوستانی رہنماؤں کے درمیان بات چیت کا انتظام ۲۳ دسمبر ۱۹۲۹ء کو کیا گیا جس میں گاندھی جی، پنڈت موتی لال نہرو، سرتیج بہادر سپرو، جناح اور ولبھ بھائی پٹیل شریک ہوئے۔ وہ سب ۲۲ دسمبر کو دہلی میں اکٹھے ہوئے لیکن اس دن گاندھی جی نے مون برت (چپ کا روزہ) رکھا ہوا تھا لہٰذا ان کی موجودگی میں کوئی بات چیت نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی لئے تمام سیاسی قائدین آپس میں کوئی صلاح مشورہ نہ کر سکے۔ کانفرنس میں گاندھی جی نے مطالبہ کیا کہ گول میز کانفرنس صرف اسی شرط پر منعقد ہو سکتی ہے کہ اس میں ہندوستان کو ڈومینین کا درجہ دیا جائے۔ لیکن وائسرائے نے جواب دیا کہ وہ اپنی حیثیت اور اختیارات سے بڑھ کر کوئی وعدہ نہیں کر سکتے۔ وہ صرف اس اعلان نامے کے پابند ہیں جو حکومت برطانیہ نے

جاری کیا ہے۔ اس ہٹ کا نتیجہ یہ نکلا کہ مذاکرات کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ناکام ہو گئے۔ ان مذاکرات کا اہتمام ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں نے مشترکہ کوششوں سے کیا تھا اور ان کا گاندھی جی کے بے لچک رویے کی نذر ہو جانا فی الواقعی المیہ تھا۔ اب بات چیت کے راستے مسائل کے حل کا موقع ضائع ہو چکا تھا۔ جناح، ولبھ بھائی اور سپرو نے اس پر شدید رد عمل ظاہر کیا لیکن وہ بے بس تھے ان کی پر خلوص مساعی کو گاندھی جی نے خاک میں ملا دیا تھا۔ گاندھی جی نے وہی رویہ دہرایا تھا جس کا مظاہرہ اس سے پہلے وہ دسمبر ۱۹۲۱ء میں کر چکے تھے۔ اس موقعے پر انہوں نے لارڈ ریڈنگ کی ہمدردانہ تجاویز ٹھکرا دیں تھیں جو انہوں نے پرنس آف ویلز کے دورہ کلکتہ سے پہلے پیش کی تھیں۔ اس مرتبہ گاندھی جی نے سی آر داس، پنڈت مدن موہن اور مولانا آزاد کی محنت پر پانی پھیرا تھا۔

وائسرائے کی رہائش گاہ سے گاندھی جی اور پنڈت موتی لال نہرو شدید دلبرداشتہ ہو کر لاہور پہنچے جہاں جواہر لال کی صدارت میں کانگریس کا اجلاس منعقد ہونے والا تھا۔ کانگریس کی ایک قرارداد میں کہا گیا کہ وائسرائے سے گاندھی جی، پنڈت موتی لال نہرو اور دیگر رہنماؤں کی ناکام ملاقات کے بعد کانگریس اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ان حالات میں مجوزہ گول میز کانفرنس میں شرکت نہایت بے سود اور لاحاصل رہے گی۔ قرارداد میں مزید کہا گیا کہ کانگریس اب ہندوستان کی مکمل ترین آزادی کے علاوہ کسی بات پر سمجھوتہ نہیں کرے گی کیونکہ سرکار برطانیہ نے نہرو کمیٹی رپورٹ کی تمام تجاویز سے انحراف کیا ہے۔ قرارداد کا ایک اقتباس درج ذیل ہے۔

> "تحریک آزادی کے ابتدائی قدم کے طور پر کانگریس اپنے تمام ارکان کو فوری طور پر سرکاری کمیٹیوں اور مجالس قانون ساز سے مستعفی ہونے کی ہدایت کرتی ہے ----- آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو اس امر کا اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ جب مناسب سمجھے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دے جس میں عدم ادائیگی محصولات بھی شامل ہے -----"

لاہور کانگریس کی یہ انتہا پسندانہ قرارداد لیبر حکومت کے لئے ایک نہایت ناشائستہ دھمکہ تھی جو ہندوستان کے مسائل پر امن بات چیت سے حل کرنے کی متمنی رہی تھی۔ جناح نے اس غیر متوازن قرارداد کو سیاسی پاگل پن کا نام دیا جو گاندھی جی کے زیر اثر پیدا ہوا تھا۔ انہوں نے گاندھی جی پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ فرانس کے بورنیز کی طرح گاندھی جی بھی سیاسی و آئینی دانشمندی سے محروم ہیں اور انہیں کوئی بھی کام کرنے یا نہ کرنے کا سلیقہ نہیں ہے۔ جناح نے مزید کہا کہ گاندھی جی ماضی میں بھی سنگین غلطیوں کا ارتکاب کر چکے ہیں لیکن ان کی آنکھیں پھر بھی نہیں کھلیں۔ قرارداد لاہور کے ۳ ماہ بعد ہی گاندھی جی نے اپنے مشہور زمانہ ڈنڈی مارچ کا آغاز کیا اور قانون شکنی کے لئے عوام کے جذبات کو بھڑکانے لگے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے نمک بنانے والے مزدوروں کو سب سے پہلے استعمال کیا۔

باب نمبر 17

ڈنڈی مارچ اور نمک ستیہ گرہ ○ پنڈت موتی لال نہرو کا انتقال (۱۹۳۰۔۱۹۳۱ء)

اگرچہ لاہور کانگریس ۱۹۲۹ء کی صدارت جواہر لال نہرو نے کی لیکن عملاً گاندھی جی خود اس کی کارروائی پر ہے۔ گاندھی جی ہی کے ایماء پر کانگریس کمیٹی کو ملک بھر میں تحریک سول نافرمانی بپا کرنے کا اختیار دیا گیا جس میں ٹیکسوں کی عدم ادائیگی بھی شامل تھی۔ ورکنگ کمیٹی کا اجلاس فروری ۱۹۳۰ء میں سابرمتی میں ہوا جہاں گاندھی جی اور ان کے "مومنین" کو اس امر کا مکمل مجاز بنایا گیا کہ وہ جب اور جیسے چاہیں، تحریک کا آغاز کر دیں۔ اس کے بعد گاندھی جی اور ان کے معتقدین نے سابرمتی ہی میں ایک اور جلسہ کیا جہاں یہ فیصلہ ہونا تھا کہ تحریک کس طرح شروع کی جائے۔ گاندھی جی کے دماغ میں ایک خیال کوندے کی طرح لپکا اور انہوں نے اپنے اگلے ستیہ گرہ کا پورا پروگرام بنا لیا۔ سب سے پہلے یہ فیصلہ کیا گیا کہ نمک سازی کے قوانین توڑے جائیں۔ اس مقصد کے لئے نمک خود بنایا جائے اور ملک بھر میں نمک فراہم کرنے کے تمام ڈپو تباہ کر دئے جائیں۔ کانگریس کے مورخ پٹہ بھائی ستیا رمیہ اس منصوبے کے متعلق لکھتے ہیں۔

"گاندھی کے تمام منصوبے ان کی اپنی عقل اور خواہشات کی اختراع ہوتے تھے جو ان پر یکلخت (غیب سے) وارد ہو جاتے تھے۔ گاندھی جی نے کبھی بھی سوچ سمجھ کر ٹھنڈے دل و دماغ سے منصوبہ سازی نہیں کی۔ ان کی اندرونی آواز ہی ان کے لئے استاد، نگران، دوست، فلسفی اور رہبر کی حیثیت رکھتی تھی۔"

(کانگریس کی تاریخ، جلد اول، صفحہ ۳۷۱)

"گاندھی جی کا رویہ ہمیشہ ان کے جذبات اور فوری رد عمل کا تابع رہا۔ اس

پاکباز انسان کے لئے عقل یا دانش کی بجائے وجدان اور ضمیر زندگی کے معتبر رہنما تھے"

(ایضاً صفحہ ۳۷۸)

لیکن جب گاندھی جی نے نمک ستیہ گرہ کے ذریعے ملک بھر میں سول نافرمانی کی تحریک کا احیاء کرنا چاہا تو ان کے بعض قریب ترین (لیکن دور اندیش) ساتھی بھی شدید شکوک و شبہات کا شکار ہو گئے۔ ان حضرات میں پنڈت موتی لال نہرو سرفہرست تھے۔ لیکن گاندھی جی کو اپنی عقل اور دانشمندی پر ہرگز کوئی شبہ نہ تھا اور وہ نمک کے قانون توڑنے کا پختہ عزم کئے ہوئے تھے۔ جیسا کہ پی ستیہ رمیہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔

"ایک خیال متعدد افراد کو پریشان کرتا تھا کہ مناسب وقت ابھی نہیں آیا۔ جب کہ گاندھی جی بالکل مطمئن تھے۔ انہوں نے نہایت سلیقے سے جواب دیا "کلکتہ کے واقعات کے بعد ملک کے خارجی حالات میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی لیکن میرے اندر کی کشمکش ختم ہو گئی تھی جس سے مجھے اطمینان ہو گیا کیونکہ یہ کشمکش میری راہ عمل کی سب سے بڑی رکاوٹ رہی تھی۔ اب مجھے حتمی وثوق ہو گیا تھا کہ تحریک چلانے کا مناسب وقت نہ صرف آگیا ہے بلکہ نکلا جا رہا ہے۔ مجھے اسے پہلے ہی شروع کر دینا چاہئے تھا۔"

گاندھی جی کو شائبہ تک نہ تھا کہ نمک کی تحریک انہیں جیل پہنچا دے گی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ جلد ہی اتنا بڑا بحران پیدا کر دیں گے جس کے نتیجے میں صحیح کانفرنس کا انعقاد حکومت برطانیہ کی مجبوری بن جائے گا۔ گول میز کانفرنس کی بجائے چوکور میز کانفرنس کروانی پڑے گی۔ جس میں شرکت کرنے والا ہر فرد اپنی صلاحیتوں اور نتائج سے آگاہ ہو گا۔ ان کے مطابق" اس ہونے والی کانفرنس کے حتمی خطوط پر میں ابھی روشنی نہیں ڈال سکتا لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ وہ کانفرنس دو برابر پارٹیوں کے درمیان ہو گی جو وہاں سر جوڑ کر بیٹھیں گی اور آزاد ہند کے آزاد دستور کی تشکیل کے لئے طریقے اور ذرائع وضع کریں گی۔" اس کے بعد انہوں نے وائسرائے کو ایک خط لکھا جس کا عنوان تھا "ایک

سول نافرمان کی سادہ اور مقدس ذمہ داری" یہ خط گاندھی جی کا ایک معتمد قاصد وائسرائے کے پاس دہلی لے کر گیا۔ یہ رینالڈ نیولڈ نامی ایک انگریز تھا جو گاندھی جی کا پیروکار اور ان کے آشرم کا رہائشی تھا۔ گاندھی جی کے مطابق وہ ہندوستان کا مخلص متوالا اور فلسفہ عدم تشدد کا سچا معتقد تھا اور اسے غالباً اسی مقصد کی تکمیل کے لئے قدرت نے ان کے پاس بھیجا تھا۔ گاندھی جی کا یہ خط انتہائی دلچسپ تھا اور اس سے ان کے حقیقی نظریات پر روشنی پڑتی ہے جو سول نافرمانی کی تحریک کے پیچھے کار فرما تھے۔ یہ خط ۲ مارچ ۱۹۳۰ء کو لکھا گیا۔ اس کے آغاز میں گاندھی جی رقم طراز ہیں۔

"عزیز دوست ----- میں انگریز راج کو لعنت کیوں قرار دیتا ہوں؟ اس نے کروڑوں ناسمجھ انسانوں کو روز افزوں استحصال سے مفلسی کی آخری حد تک پہنچا دیا ہے ----- اس نے سیاسی اعتبار سے ہمیں غلاموں سے بدتر بنا دیا ہے۔ اس نے ہمارے کلچر کی جڑیں تک چوس لی ہیں۔ اسلحے سے محروم کر کے انگریز راج نے ہمیں روحانی طور پر بھی کمزور اور کردار باختہ کر دیا ہے۔ (آخری جملہ ہر اس قاری کو متحیر کر دینے کے لئے کافی ہے جو گاندھی جی کے منہ سے عدم تشدد کی رٹ سنتے سنتے اکتا چکا ہے !!!)

(مہاتما از تندولکر' جلد سوم صفحہ ۱۴)

گاندھی جی مزید لکھتے ہیں۔

"میرا یہ یقین روز بروز گہرا ہوتا جا رہا ہے کہ صرف اور صرف خالص فلسفہ عدم تشدد سرکار برطانیہ کے منظم تشدد کا مقابلہ کر سکتا ہے ----- اس عدم تشدد کا اظہار سول نافرمانی کی تحریک کے ذریعے کیا جائے گا ----- میں جانتا ہوں کہ عدم تشدد کی تحریک شروع کر کے میں ایک دیوانہ وار اور خطرناک بازی کھیل رہا ہوں ----- میں ایک ایسی قوم کے عقائد میں تبدیلی لانا چاہتا ہوں جس کے افراد شعوری اور لاشعوری طور پر ایک ایسی قوم سے ٹکر لینا چاہتے ہیں جو تعداد' تاریخ کی قدامت اور تمدن میں ان سے کسی طرح کم نہیں۔ چنانچہ یہ تحریک بہت بڑا داؤ ہے"

"عقائد کی تبدیلی کا لفظ میں نے بہت سوچ سمجھ کر استعمال کیا ہے۔ میرے مقاصد اور ارادوں میں عدم تشدد کے ذریعے برطانوی قوم کے عقیدے بدلنا شامل ہے تاکہ انہیں ان مظالم کا احساس ہو سکے جو انہوں نے ہندوستان پر کئے۔"

(ایضاً)۔

اسی خط میں انہوں نے وائسرائے کو یہ بھی بتایا کہ اپنی تحریک کے آغاز کے لئے انہوں نے نمک کا انتخاب کیوں کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ نمک کے قوانین سب سے پہلے توڑنے کا فیصلہ اس لئے کیا گیا ہے کہ غریب آدمی کے لئے نمک ہی زندگی کی سب سے بڑی ضرورت ہے اور نمک پر ٹیکس عائد کرنا حکومت کا بدترین ظلم ہے۔

۱۲ مارچ ۱۹۳۰ء کو گاندھی جی نے ساحلی گاؤں ڈنڈی کی جانب مارچ شروع کر دیا۔ وہ نمود و نمائش اور تشہیر کی اہمیت کے بے حد قائل تھے۔ اس مارچ کے آغاز کی خبریں ملک بھر کے اخبارات میں طمطراق سے شائع ہوئیں۔ پوری دنیا سے اخبار نویس' رپورٹر' فوٹو گرافر' فلمساز اور کیمرہ آپریٹر سابرمتی اکٹھے ہوئے ۲۴ دن کے عرصے میں اپنے ۷۵ جانثاروں کے ہمراہ انہوں نے ۲۰۰ میل کا فاصلہ پیدل طے کیا۔ ان کے ہاتھ میں ایک لمبی چھڑی تھی۔ وہ جس گاؤں سے گزرتے وہاں اپنے نظریات کا پرچار کرتے۔ ان کا پیام سننے کے لئے ہزاروں دیہی عوام جوق در جوق اکٹھے ہوتے رہے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ وہ نمک سے ٹیکس اٹھوائے بغیر اپنے آشرم واپس نہیں جائیں گے۔ "یا تو میں اپنا مطالبہ منوا کر رہوں گا یا میری لاش سمندر کے کھارے پانی پر تیرے گی -----" ان کی تقریر کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

"اس عظیم ملک کو برطانوی راج نے اخلاقی' مادی' تہذیبی اور روحانی تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا ہے۔ میں اس راج کو لعنت تصور کرتا ہوں۔ میں اس نظام اور حکومت کو تباہ کرنے کے ارادے سے نکلا ہوں۔ میں نے بھی یہ ترانہ متعدد مرتبہ گایا ہے "خداوند کریم بادشاہ کو سلامت رکھ" اور دوسروں کو بھی گاتے سنا

ہے۔ میں بھی عرضداشتوں' وفود اور مذاکرات کی سیاست کا قائل رہ چکا ہوں۔
لیکن یہ سب باتیں اب بیکار ہیں۔ میں جان چکا ہوں کہ یہ حکومت ان طریقوں
سے راہ راست پر نہیں آئے گی۔ اب بغاوت ہی میرا مذہب ہے۔"

(پی ستیا رمیہ' جلد اول' صفحہ ۳۸۴)

وہ ۵ اپریل ۱۹۳۰ء کو ڈنڈی پہنچے۔ علی الصبح عبادت کرنے کے بعد انہوں نے ساحل سمندر سے نمک کا ایک ڈھیلا اٹھا کر رسمی طور پر نمک کا قانون توڑ دیا۔ نمک کا قانون توڑنے کے بعد گاندھی جی نے مندرجہ ذیل اخباری بیان جاری کیا۔

"میں نے تکنیکی اور رسمی طور پر نمک کا قانون توڑ دیا ہے۔ اب ہر وہ شخص جو سزائیں بھگتنے کا خطرہ مول لے سکتا ہے وہ ملک کے کسی بھی حصے میں اپنی مرضی اور سہولت کے مطابق نمک بنانے کا مجاز ہے۔"

(ایضاً' صفحہ ۳۸۷)

ان کی تحریک کا اگلا مرحلہ چار سدہ اور دھرسنا میں نمک کے سرکاری ڈپوؤں پر حملہ کرنا تھا۔ ان کا فرمان تھا کہ ہوا اور پانی کی طرح نمک بھی عوام کی فطری ملکیت ہے جس پر سرکار کو غاصبانہ قبضے کا کوئی حق نہیں۔ گاندھی جی کے مطابق ڈپوؤں میں ذخیرہ شدہ نمک عوام کی ملکیت تھا جسے لوٹ لینے کا حق وہ محفوظ رکھتے تھے۔ اس موقعے پر انہوں نے وائسرائے کو مندرجہ ذیل خط لکھا۔

"عزیز دوست خداوند کے کرم سے میرا ایک ارادہ ہے کہ میں اپنے رفیقوں کے ہمراہ دھرسنا روانہ ہو جاؤں اور نمک کے ذخائر پر قبضہ کر لوں ----- آپ کے لئے ۳ راستے کھلے ہیں جن کے ذریعے آپ میرے اس حملے کو رکوا سکتے ہیں۔ اگرچہ یہ لفظ غلط ہے لیکن اسے بڑی مہارت سے میری کاروائی کے لئے رائج کر دیا گیا ہے۔

۱۔ نمک پر سے ٹیکس ہٹا کر

۲۔ -----

۳۔ (تندولکر، جلد سوم، صفحہ ۳۶)

اب حکومت کے لئے گاندھی جی کی کارروائیوں کو نظرانداز کرنا ممکن نہ رہا تھا چنانچہ ۶ مئی ۱۹۳۰ء کو انہیں گرفتار کر لیا گیا اپنی گرفتاری کا اندازہ ہونے پر انہوں نے قوم کو پیغام دیتے ہوئے کہا۔

"اگر اتنے عمدہ آغاز کو منطقی نتیجے تک پہنچایا جائے تو مکمل سوراج کا قیام یقینی ہے ----- اگر مجھے گرفتار کر لیا گیا تو عوام کو دیہات سے آگے بڑھ کر میرے کام کو مکمل کرنا چاہئے اور نمک خود بنانا چاہئے۔ ہر گھر میں بوڑھوں اور جوانوں کو چرخہ کاتنا چاہئے۔ غیر ملکی کپڑے کو نذر آتش کر کے الاؤ دہکانے چاہئیں ----- طلباء کو سرکاری سکولوں میں تعلیم ترک دینی چاہئے اور حکومتی اہلکاروں کو مستعفی ہو جانا چاہئے-----"

(ستیا رمیا، جلد اول ۹۵۔۳۹۴)

گاندھی جی کی گرفتاری سے ملک بھر میں بے چینی اور اشتعال کی لہر دوڑ گئی۔ ہڑتالوں اور قانون شکنی کا ملک گیر سلسلہ شروع ہو گیا۔ شراب اور غیر ملکی کپڑے کی دکانیں لوٹ لی گئیں۔ غیر ملکی کپڑے کو بڑی مقدار میں جلا کر بھسم کر دیا گیا۔ گاندھی جی کے رضاکاروں نے نمک کے سرکاری ڈپوؤں اور کارخانوں کے مزدوروں پر حملے کیے۔ فوج اور پولیس نے بھی طاقت کا پورا استعمال کیا جس سے وسیع پیمانے پر جانی نقصان ہوا۔ اس سارے ہنگامے میں موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو اور ولبھ بھائی پٹیل کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

ایم آر جے کار نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں ایک دلچسپ واقعہ رقم کیا ہے جس میں انہوں نے نمک کے قوانین کے متعلق پنڈت موتی لال نہرو کے نہایت جراتمندانہ خیالات کا تذکرہ کیا ہے۔ اس دور میں پنڈت جی مرکزی مجلس قانون ساز میں سوراج پارٹی کے لیڈر اور خود جے کار نیشنلسٹ پارٹی کے ڈپٹی لیڈر تھے۔ موتی لال کی جماعت کے ایک رکن نے نمک کی قیمت میں کمی کے لئے تحریک پیش کی۔ اس تحریک

کے متعلق موتی لال کے گھر پر بھی ایک بحث کا اہتمام کیا گیا۔ اپنی اور موتی لال کے درمیان ہونے والی بحث کا خلاصہ جے کار نے اس طرح پیش کیا ہے۔

موتی لال میری رائے میں ابھی ہمیں سالٹ (نمک) ایکٹ کو نہیں چھیڑنا چاہیے لیکن مجھے اس بات کا بھی احساس ہے کہ ایک مقبول عام جماعت ہونے کے ناطے ہم اس تحریک کی مخالفت بھی نہیں کر سکتے اور غیر جانبدار بھی نہیں رہ سکتے۔ ذاتی طور پر میں فی الوقت سالٹ ایکٹ سے الجھنے کے حق میں نہیں ہوں۔

جے کار آپ کے خیالات جان کر مجھے حیرت ہوئی۔ فرض کریں کہ اگر آپ وزیراعظم ہوں جیسا کہ آپ ایک روز بن جائیں گے تو کیا آپ نمک کے موجودہ قوانین کو جاری رہنے دیں گے۔

موتی لال بالکل ان سے سالانہ ۶ کروڑ روپے کی رقم حاصل ہوتی ہے اور میں آمدنی کے اس ذریعے کو ختم کرنا پسند نہیں کروں گا۔

جے کار تو آپ کا گاندھی کے بارے میں کیا خیال ہے وہ تو ان قوانین کے شدید ترین مخالف ہیں۔ وہ تو آپ کی حکومت کے خلاف فوراً ستیہ گرہ کا آغاز کر دیں گے کیونکہ وہ افراد کے نہیں ہمیشہ اپنے اصولوں کے وفادار رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ کی حکومت نے نمک کے قوانین برقرار رکھے تو گاندھی آپ کے خلاف غیر ملکی حکومت کی نسبت کہیں شدت سے ستیہ گرہ شروع کریں گے۔

موتی لال (کھل کر قہقہے لگاتے ہوئے) آپ کا خیال ہے کہ گاندھی میری حکومت کے خلاف بھی اس قسم کے مظاہرے منظم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے"

جے کار جی ہاں۔

موتی لال پھر اس صورت میں میری حکومت گاندھی کے ساتھ وہ کرے گی جو موجودہ حکومت سوچنے کی بھی ہمت نہیں کر سکتی۔

جے کار اور موتی لال کھلکھلا کر ہنسے اور جے کار نے فیصلہ کیا کہ ان کی جماعت ایوان میں سوراج پارٹی کی تحریک کی حمایت کرے گی کہ نمک کی قیمت کم کی جائے۔

جے کار لکھتے ہیں کہ جب ۱۹۳۰ء کے آغاز میں گاندھی نے ڈنڈی مارچ شروع کیا تو موتی لال اس کی افادیت کے متعلق سخت تشکیک کا شکار تھے لیکن وہ گاندھی جی کے سچے وفادار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک با اصول سیاستدان بھی تھے۔ اس لئے وہ اپنی ذاتی رائے کے برعکس ایک فرمانبردار سپاہی کی طرح اسی وقت سول نافرمانی کی تحریک میں شامل ہو گئے جب گاندھی جی نے ڈنڈی مارچ شروع کیا۔ جب ان کی باری آئی تو وہ خوشی خوشی جیل کی دیواروں میں قید ہو گئے۔ جیل کی فضاء نے ان کی صحت پر بے حد برے اثرات مرتب کیے اور بیماری کی وجہ سے ان کی قید' میعاد سے پہلے ختم کر دی گئی لیکن وہ جیل سے رہائی کے محض دو ہفتے کے اندر ہی ۷ فروری ۱۹۳۱ء کو انتقال کر گئے۔

جب گاندھی جی نے ۲۱-۱۹۲۰ء میں کانگریس میں شمولیت اختیار کی تو موتی لال ان کے اولین رفیقوں میں شامل ہوئے جب ۱۹۲۰ء کی کلکتہ کانگریس میں گاندھی جی نے تحریک عدم تعاون شروع کرنے کی بات کی تو موتی لال نے گاندھی جی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی اور یہ موتی لال ہی کا رسوخ تھا کہ گاندھی جی کی قرارداد رائے دہی میں اکثریت سے کامیاب ہوئی۔ موتی لال نے آغاز کیا جس کے بعد کانگریس کے دیگر ارکان نے بھی آہستہ آہستہ گاندھی جی کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ گاندھی جی چاہتے بھی تو موتی لال کا قرض نہیں چکا سکتے تھے۔ اگر وہ ابتدا" گاندھی جی کی اتنی مدد نہ کرتے تو وہ کبھی بھی اپنے کیریئر کی بلندی پر نہ پہنچ سکتے۔ انہوں نے گاندھی جی کو آخری نذرانہ اپنی جان کی صورت میں پیش کیا۔

ہمیں موتی لال نہرو کی عظمت کو خراج عقیدت ضرور پیش کرنا چاہیے۔ اپنی نوجوانی میں انہوں نے تمام تر توجہ اپنے پیشے (وکالت) کی طرف مبذول رکھی اور سیاست میں زیادہ دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ لیکن ہندوستانی سیاست کی منجدھار میں کودنے کے بعد بھی وہ ہمیشہ

اعتدال پسندوں کے ہمراہ رہے۔ لیکن جلیانوالہ باغ کی انکوائری کمیٹی میں شامل ہونے پر انہیں زندگی کا پہلا صدمہ سہنا پڑا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے لاچار عوام پر سرکار برطانیہ کے مظالم کا مشاہدہ کیا اور انہوں نے دیکھا کہ عوام پر کس قدر ذلت مسلط کی گئی ہے۔ اس استبداد میں سول اور فوجی اہلکار برابر کے شریک تھے۔ اب ان کی زندگی کا اولین مقصد غیر ملکی حکومت کے طوق سے آزاد ہونا ٹھہر گیا اور انہیں اپنی پیشہ ورانہ کامیابی اور دولت سے کوئی سروکار نہ رہا۔ انہوں نے اپنی باقی ماندہ پوری زندگی قوم کے لئے وقف کر دی۔ اس مقصد کے لئے وہ نہ صرف اپنی ذات بلکہ اپنے پورے خاندان' دولت اور گھر بار سے دستبردار ہو گئے۔ انہوں نے اپنا اکلوتا بیٹا بھی قوم کی نذر کر دیا۔ ہندوستان ایک انتہائی خوش نصیب سرزمین ہے جس کی تحریک آزادی میں اس کے ایسے قابل اور باوفا فرزند نے حصہ لیا۔

گاندھی۔ ارون معاہدہ

۱۹۳۰ء کے موسم گرما میں ڈیلی ہیرالڈ لندن کے نمائندہ مسٹر جارج سلوکومب منظر عام پر آئے اور انہوں نے گاندھی جی اور حکومت کے درمیان سمجھوتہ کروانے کی کوشش کی۔ ۲۰ مئی ۱۹۳۰ء کو انہوں نے یرواد جیل میں گاندھی جی کا انٹرویو لینے کے بعد اپنے اخبار کو مندرجہ ذیل رپورٹ لندن روانہ کی۔

"ایسے فیصلہ کن موقعے پر بھی سمجھوتے کا امکان موجود ہے اور گاندھی جی کانگریس کو تحریک سول نافرمانی معطل کرنے کا حکم دینے پر تیار ہیں۔ وہ مندرجہ ذیل شرائط پر تحریک عدم تعاون کو معطل کرنے اور گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے بھی رضامند ہیں۔

1۔ گول میز کانفرنس کی شرائط میں ایسے آئین کی تیاری بھی شامل ہو جس سے ہندوستان کو مکمل آزادی مل سکے۔

2۔ گاندھی جی کے نمک پر سے ٹیکس اٹھانے، امتناع شراب اور غیر ملکی کپڑے پر پابندیوں جیسے مطالبات تسلیم کئے جائیں۔

3۔ سول نافرمانی کی مہم کے خاتمے پر تمام سیاسی قیدیوں کے لیے عام معافی کا اعلان کیا جائے۔

4۔ ....''

بعد ازاں سلوکومب نے کانگریس اور حکومت کو قریب تر لانے کے لئے دیگر ہندوستانی سیاستدانوں سے رابطے قائم کئے۔ ان کا مقصد کانگریس کو گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے رضا مند کرنا تھا۔ لیکن ان مذاکرات سے اس وقت کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ تاہم طے شدہ پروگرام کے مطابق پہلی گول میز کانفرنس لندن میں ۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء کو وزیراعظم ریمزے میکڈونلڈ کی سربراہی میں شروع ہو گئی۔ کانگریس کے علاوہ اس میں ہندوستان اور برطانیہ کی تمام سیاسی جماعتوں نے شرکت کی۔ کانفرنس کے اختتام ۱۹ جنوری ۱۹۳۱ء پر لیبر وزیراعظم میکڈونلڈ نے امید ظاہر کی کہ کانگریس دوسری گول میز کانفرنس میں شریک ہو گی۔ لارڈ ارون خود بھی کانگریس کی شمولیت کے بے حد خواہشمند تھے۔ چنانچہ خیر سگالی کی فضا قائم کرنے کے لیے انہوں نے ۲۵ جنوری ۱۹۳۱ء کو گاندھی جی سمیت تمام گرفتار شدہ کانگریسی رہنماؤں کی غیر مشروط رہائی کا حکم جاری کر دیا۔

رہا ہونے پر گاندھی جی نے وائسرائے کو خط لکھا جس میں باہمی گفت و شنید کی استدعا کی گئی تھی۔ وائسرائے اور گاندھی جی کی پہلی ملاقات ۱۷ فروری، ۱۹۳۱ء کو ہوئی اور آئندہ چند دن میں مزید ملاقاتیں ہوئیں۔ ان ملاقاتوں سے برطانیہ کے امپریلسٹ سیاستدان ونسٹن چرچل کے اعصاب تن گئے اور اس کی رگوں میں جوش مارتے ہوئے امپریلسٹ خون نے اپنا اظہار کچھ اس طرح کیا۔

''ایک دور میں انرٹمپل سے تعلق رکھنے والے اس قانون دان کا یہ کوفت انگیز اور شرمناک ناٹک۔ (یہ شخص) اب ایک شرپسند فقیر کا روپ دھار کر نیم برہنہ

حالت میں قدم بڑھاتا ہوا وائسرائے کے محل کی جانب رواں ہے تاکہ کنگ اور ایمپائر کے نمائندے سے برابری کی سطح پر مذاکرات اور شرائط طے کر سکے۔"

یہ مذاکرات بالاخر گاندھی۔ اروِن معاہدے پر منتج ہوئے جس پر دونوں نے ۵ مارچ ۱۹۳۱ء کو دستخط کر دیے۔ اس معاہدے کی اہم شرائط درج ذیل ہیں۔

ا..... کانگریس کے ایما پر گاندھی جی نے اتفاق کیا کہ ......

1۔ سول نافرمانی کی تحریک معطل کر دی جائے گی۔

2۔ آئندہ ہونے والی دوسری گول میز کانفرنس میں کانگریس ہندوستان کے نئے آئین کی تیاری کے لئے شریک ہو گی۔ لیکن اس کی شرط یہ ہو گی کہ آئین میں (۱) وفاق (۲) ذمہ داری (۳) ایسے تحفظات کی ضمانت دی جائے جو ہندوستان کے مفاد کے لئے ضروری ہوں۔

ب..... حکومت کے ایماء پر وائسرائے نے حامی بھری کہ۔

1۔ تحریک عدم تشدد کے تمام قیدیوں کو رہا کر دیا جائے گا۔

2۔ ایمرجنسی آرڈیننس واپس لے لیے جائیں گے۔

3۔ ساحل سمندر سے کچھ مخصوص فاصلے پر رہنے والے عوام کو نمک بنانے اور خریدنے کی اجازت ہو گی جس پر ٹیکس نہیں لیا جائے گا۔

مذکورہ بالا معاہدے کا سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ گاندھی جی نے کانگریس کے ایماء پر قبول کیا کہ ہندوستان کا آئندہ آئین وفاقی طرز کا ہو اور اس میں ملکی مفادات کے لئے تحفظات کی ضمانت دی جائے۔ لیکن جہاں تک نمک پر ٹیکس ہٹانے کا تعلق ہے۔ اس پر وائسرائے ٹس سے مس نہ ہوا۔ چنانچہ صاف ظاہر ہے کہ گاندھی اروِن معاہدہ' گاندھی جی کی شرائط پر نہیں ہوا۔ اس امر پر بھی حیرت نہیں ہونی چاہئے کہ سرکاری حلقوں نے اس بات پر اطمینان ظاہر کیا کہ وائسرائے نے اپنے قابل وزیر داخلہ (ہوم سیکرٹری)

سر ہربرٹ ایمرسن کی معاونت سے یہ جنگ جیت لی ہے۔ لندن ٹائمز نے اس پر لکھا "ایسی کامیابی شاذو نادر ہی کسی وائسرائے کے حصے آئی ہو گی۔"

جواہر لال نے بھی اپنی خود نوشت میں شدید اندوہ کے عالم میں مندرجہ ذیل الفاظ لکھے ہیں۔

"کیا اس کے لئے ہمارے عوام نے سال بھر اس بے جگری کا مظاہرہ کیا تھا؟ کیا ہمارے جرائمندانہ اقوال اور افعال کو اس (معاہدہ) پر منتج ہونا تھا؟" (صفحہ ۶۵۸)۔

گاندھی اروِن معاہدہ کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا جیسی محاوراتی کہانیوں میں سے ایک ثابت ہوا۔ حکومت کی طرف سے گاندھی جی کا ایک بھی بڑا مطالبہ تسلیم نہیں کیا گیا۔ بلکہ ان کے ان ۱۱ نکات میں سے کسی ایک کو بھی درخور اعتناء نہیں سمجھا گیا جو انہوں نے عبوری اقدامات کے طور پر پیش کئے تھے۔ یہاں ان ۱۱ نکات کے متعلق بھی چند الفاظ کہے جا سکتے ہیں۔ کانگریس کے کھلے اجلاس منعقدہ لاہور میں آزادی کامل ہندوستان کو کانگریس کا عزم و ہدف قرار دیا گیا اور ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کا دن آزادی کا حلف اٹھانے کے لئے مقرر کیا گیا۔ لیکن گاندھی جی کی حرکات ناقابل فہم تھیں۔ ابھی حلف آزادی کی روشنائی بھی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ گاندھی جی نے جدوجہد آزادی کے متبادل کے طور پر اپنے ۱۱ نکات پیش کر دیے۔ ان کے گیارہ مطالبات درج ذیل ہیں۔

مکمل امتناع شراب' روپے کی شرح تبادلہ بلحاظ (ایک شلنگ' ۴ پنی) ۱۱لیس۔ ۴ ڈی بحال کرنا' غیر ملکی کپڑے پر ٹیکس' نمک پر ٹیکس کا خاتمہ' زمین پر مالیے کا خاتمہ' فوجی اخراجات میں کمی' سول سرونٹس کی بھاری تنخواہوں میں کمی' محکمہ سی آئی ڈی کا خاتمہ' بھارتی بحری جہازوں کے مالکان کے لئے ساحلی ٹریفک میں کوٹے کا تقرر' سیاسی قیدیوں کی رہائی اور آتشیں اسلحے کے لائسنس کے اجراء پر پابندی کا خاتمہ (آخری مطالبہ عدم تشدد کے ایک حامی کے منہ سے نہایت حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے)۔ انہوں نے کہا "وائسرائے

ہندوستان کی ان نہایت اہم اور سادہ ضروریات سے متعلق ہمیں مطمئن کریں پھر وہ سول نافرمانی کا تذکرہ کبھی نہیں سنیں گے۔" ۲۳ جولائی ۱۹۳۰ء کو گاندھی جی نے پنڈت موتی لال نہرو کے نام ایک خط میں لکھا "میں جانتا ہوں کہ آپ نے اور جواہر لال نے میرے ان ۱۱ نکات کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا ہے جن کا تذکرہ میں نے وائسرائے کے نام اپنے پہلے خط میں کیا تھا۔ لیکن میرا اپنا ذہن ان کے متعلق نہایت صاف اور دو ٹوک ہے۔ میرے نزدیک یہ نکات آزادی کا جوہر ہیں۔"

کانگریس نے اپنے اجلاس کراچی منعقدہ مارچ ۱۹۳۱ء کو یہ معاہدہ (گاندھی۔ اروِن) قبول کر لیا۔ بنیادی قرارداد خود جواہر لال نہرو کو پیش کرنی پڑی جس میں وہ "شدید ذہنی کشمکش اور جسمانی کرب" کے بعد کامیاب ہوئے۔ سبھاش چندر بوس نے جو حالات و واقعات پر سخت مشتعل تھے، کھل کر اپنے غم و غصے کا اظہار کیا اور خصوصاً جواہر لال کو کڑی نکتہ چینی کا نشانہ بنایا۔ جس پر جواہر لال نے جواب دیا کہ اگرچہ وہ خود بھی مذکورہ معاہدے کی شرائط سے متفق نہیں ہیں لیکن ایک فرمانبردار سپاہی کی طرح وہ لیڈر کا حکم ماننے کے پابند ہیں۔

لیکن کانگریس کی جانب سے اروِن۔ گاندھی معاہدے کی منظوری کو ملک بھر میں ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اس لئے کہ کانگریس کے اجلاس کراچی کے دوران تین دہشت پسند محبان وطن کو پھانسی دے دی گئی جن میں بھگت سنگھ بھی شامل تھے۔ حالانکہ ان کی معافی کے لئے ملک گیر اپیلیں کی گئی تھیں۔ کانگریس کے سرکاری تاریخ نویس لکھتے ہیں۔

"سزائے موت پانے والے تینوں نوجوانوں کے بھوت مجمعے پر اپنی پرچھائیاں ڈال رہے تھے ....

"اتنا وقت گزرنے کے باوجود یہ نکتہ آج بھی مشتبہ ہے کہ اجلاس کراچی کی زیادہ اہم قرارداد کونسی تھی۔ بھگت سنگھ کی یا گاندھی۔اروِن معاہدے کی

منظوری کی۔ بھگت سنگھ والی قرارداد ایجنڈے پر پہلے نمبر پر چنی گئی"

(سیتہ رمیا، جلد اول، صفحہ ۴۵۶)

وسط اپریل ۱۹۳۱ء میں لارڈ ارون کے عہدے کی معیاد پوری ہو گئی اور ان کی جگہ لارڈ ولنگڈن وائسرائے بن کر ہندوستان آئے۔ نئے وائسرائے کی آمد کے ساتھ ہی حالات، گاندھی جی کے لئے ناساز گار ہونے لگے کیونکہ بیورو کریسی نے کبھی بھی گاندھی۔ ارون معاہدے کو پسند نہیں کیا تھا اب انہیں اپنی اہمیت ظاہر کرنے کا موقع ملا تھا۔ گاندھی جی بہر صورت حالات کو مزید بگاڑنا نہیں چاہتے تھے اس لئے انہوں نے کانگریس کو ہدایت کی کہ وہ (نوکر شاہی کے خلاف) کوئی پر تشدد تحریک شروع نہ کریں۔ (ملاحظہ کیجئے سیتا رمیہ، جلد اول صفحہ ۱۶۹)۔ لیکن پھر متعدد مرتبہ ایسا ہوا کہ ایک فریق نے دوسرے پر معاہدہ توڑنے کے الزامات عائد کئے۔ اگست کے وسط تک حالات کا بگاڑ اپنے عروج پر پہنچ گیا اور گاندھی نے وائسرائے سے کہا کہ وہ برطانوی وزیراعظم کو آگاہ کر دیں کہ وہ دوسری گول میز کانفرنس میں شریک نہیں ہوں گے۔ ۱۴ اگست کو وائسرائے نے گاندھی جی کو جواب دیا کہ اس نے ان کے فیصلے سے وزیراعظم کو آگاہ کر دیا گیا ہے۔ بعد ازاں گاندھی جی نے پھر اپنا فیصلہ تبدیل کر لیا اور وائسرائے سے شملہ میں بات چیت کی درخواست کی۔ آخری لمحے پر ایک ایسا آبرو مندانہ طریقہ اختیار کیا گیا جس کے ذریعے گاندھی ایک خصوصی ٹرین کے ذریعے شملہ روانہ ہوئے۔ تاکہ بمبئی سے ایک میل سٹیمر پکڑ سکیں۔

وسط اپریل ۱۹۳۱ء میں لارڈ ارون کی رخصتی کے بعد بیورو کریسی نے گاندھی۔ ارون معاہدے کو سرد خانے میں ڈال دیا۔ انہوں نے اس معاہدے کی اپنے انداز میں تشریح کرنی شروع کر دی۔ جولائی اور اگست میں بردولی میں ٹیکسوں کے سابق واجبات کی وصولی کا عمل شروع ہوا تو حکومت نے اس پر سخت جابرانہ اور اٹل موقف اختیار کیا۔ اس پر جب کانگریس نے احتجاج کیا تو بمبئی کی حکومت نے جواب دیا کہ کانگریس کوئی ایسا ادارہ نہیں

ہے جس کے کہنے پر سرکاری محصولات وصول یا معاف کیے جائیں اور اگر کانگریس نے اس معاملے میں مداخلت جاری رکھی تو حکومت اسے برداشت نہیں کرے گی۔ گاندھی جی کی خواہش تھی کہ قوم پرست مسلمان رہنما ڈاکٹر انصاری بھی ان کے ہمراہ دوسری گول میز کانفرنس میں شریک ہوں۔ انہوں نے اس خواہش کا اظہار لارڈ اروِن سے کیا اور گاندھی جی کے بقول لارڈ اروِن نے ان سے وعدہ بھی کر لیا۔ لیکن بعد میں لارڈ ولنگڈن نے بیوروکریسی کے دباؤ کے تحت ڈاکٹر انصاری کو مندوب نامزد کرنے سے انکار کر دیا۔ ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ گاندھی جی نے دوسری گول میز کانفرنس میں فاتح بن کر شرکت نہیں کی جیسا کہ انہیں امید تھی۔ اس کے برعکس ڈنڈی مارچ کی جنگ ہارنے کے بعد وہ نہایت عاجزی سے، جادہ امن کی خاطر گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے۔

باب نمبر 20

گاندھی جی گول میز کانفرنس میں (۱۹۳۱ء)

جیسا کہ ہم پہلے تذکرہ کر چکے ہیں کہ کانگریس نے اجلاس کراچی میں گاندھی۔اروِن معاہدے کی رسمی منظوری دے دی تھی۔ یہ واقعہ مارچ ۱۹۳۱ء کا ہے۔ کانگریس نے نہ صرف معاہدے کو قبول کر لیا بلکہ لندن میں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے بھی تیار ہو گئی۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ گاندھی جی اکیلے ہی کانفرنس میں کانگریس کی نمائندگی کریں گے۔ سبھاش چندر بوس نے اپنی کتاب "ہندوستان کی جدوجہد" میں گاندھی کو کانگریس کا واحد نمائندہ متعین کرنے پر ان الفاظ میں کڑی نکتہ چینی کی ہے۔"

میں کبھی سمجھنے کے قابل نہیں ہو سکا کہ فی الحقیقت اس فیصلے کے پیچھے کیا تھا۔ کیا یہ (فیصلہ) مہاتما کی انا کی خاطر کیا گیا جو دنیا کے سامنے لاکھوں گونگے بے نوا ہندوستانیوں کے واحد نمائندہ نظر آنا چاہتے تھے۔ یا یہ ورکنگ کمیٹی کا ایک اور غلط فیصلہ تھا؟ یا اس فیصلے کے پس پشت کچھ اور مقصد تھا؟

حقیقی وضاحت خواہ کچھ بھی ہو' فیصلہ بے حد غلط تھا۔ سو افراد کے ہجوم میں جہاں ہر قسم کے بے کردار' نا اہل' شیخی باز/ کمینے اور خود ساختہ لیڈر اکٹھے ہو کر ان کے سامنے ایک مضبوط دیوار کی صورت اختیار کر لیں گے وہاں گاندھی جی یقیناً بڑے خسارے ہی میں رہیں گے۔ خاص طور پر رجعت پسند مسلمان رہنماؤں سے مقابلہ کرنے کے لئے ان کی پشت پر کوئی نہیں ہو گا۔ لیکن سب باتیں بے سود تھیں۔ مہاتما کے اندھے پیروکاروں سے ان پر تنقید کی توقع نہیں رکھی جا سکتی اور جو ان کے کٹر مقلد نہیں تھے وہ ان پر کوئی اثر و رسوخ ہی نہیں رکھتے خواہ کتنے ہی بلند کردار' دانشمند اور تجربہ کار کیوں نہ ہوں۔"

گاندھی جی کو دوسری گول میز کانفرنس میں کانگریس کا واحد مندوب بنا کر کیوں بھیجا گیا اس سوال کا جواب پٹہ بھائی سیتا رمیا نے کانگریس کی تاریخ کی جلد اول کے صفحہ ۴۶۶ پر دیا ہے۔

"ورکنگ کمیٹی کی نشست برخاست ہونے سے پہلے جس آخری سوال کو طے کیا گیا وہ اس قرارداد سے متعلق تھا جو گول میز کانفرنس میں کانگریس کے وفد سے متعلق تھی۔ ورکنگ کمیٹی کے بیشتر ارکان کا خیال تھا کہ وفد ایک فرد پر نہیں بلکہ ۱۴ ارکان پر مشتمل ہونا چاہئے۔ حکومت ۲۰ شرکائے کار تک کو قبول کرنے پر تیار تھی..... اس ضمن میں جو بحث ہوئی اس میں اس نکتے کو خاص طور پر واضح کیا گیا کہ گاندھی آئینی تفصیلات طے کرنے کے لئے لندن نہیں جا رہے بلکہ وہ تو ایک دوسرے معاہدے کی مبادیات پر مذاکرات کے لیے جا رہے ہیں۔ جب اس نکتے کی وضاحت ہو گئی تو پھر اس موضوع پر دو آراء باقی ہی نہ رہیں اور سب اس رائے پر یک زبان ہو گئے کہ گاندھی جی تنہا ہی ہندوستان کی نمائندگی کریں گے..... ایک شخص، کئی افراد کی نسبت ہندوستان کی بہتر نمائندگی کرے گا۔"

گاندھی جی کانگریس کے واحد نمائندہ کی حیثیت سے ۲۹ اگست کو بذریعہ بحری جہاز دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے روانہ ہو گئے۔ سیٹھ گھنشام داس برلا بھی ان کے ہمراہ تھے جو ایک بہت بڑے صنعتکار اور کانگریس کی پشت پر بہت بڑی طاقت تھے۔ وہ ۱۲ ستمبر کو لندن پہنچ گئے اور ۵ دسمبر تک انگلستان میں رہے۔ پنڈت مدن موہن مالویہ اور مسز سروجنی نائیڈو علیحدہ علیحدہ ان سے ملاقاتیں کرتے رہے۔ اپنی کتاب "ہندوستان کی جدوجہد" میں سبھاش چندر بوس لکھتے ہیں۔

"جب ہم دہلی میں تھے تو ایک باخبر ذریعے سے ہمیں ان ہتھکنڈوں کی اطلاع ملی جو حکومت برطانیہ گول میز کانفرنس میں اپنانے والی تھی۔ ہمیں مطلع کیا گیا کہ کانفرنس کے آغاز ہی میں

مہاتما گاندھی کو فروعی مسائل میں الجھانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی تاکہ ہندوستانی آپس میں لڑ پڑیں اور بڑے مسائل پر حکومت برطانیہ کے خلاف متحد نہ ہو سکیں۔ میں نے یہ خبر مہاتما کو پہنچا دی تاکہ وہ اس کی اہمیت جانچ لیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ لندن پہنچنے کے فوراً بعد متعلقہ حکام سے ملنا ان کے پروگرام میں شامل ہے اور وہ بڑے مسائل پر اطمینان حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ اگر وہ مطمئن ہو گئے تو پھر وہ چھوٹے مسائل کو چھیڑیں گے ----- بصورت دیگر انگلستان میں ان کا کام وہیں ختم ہو جائے گا۔ لیکن بدقسمتی سے جب مہاتما انگلستان میں تھے ----- حالات نے بعینہ وہی رخ اختیار کیا جس کی پیشن گوئی اپریل میں دہلی میں کی گئی تھی۔"

گاندھی جی گول میز کانفرنس میں کانگریس کے واحد مندوب تھے چنانچہ انہیں اپنی پوری توجہ کانفرنس کے کام پر مرکوز رکھنی چاہئے تھی۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ "انگلستان میں اپنے قیام کے دوران انہوں نے بیک وقت دو کردار ادا کرنے کی کوشش کی' سیاسی رہنما اور ایک آفاقی استاد کا کردار ----- دوسرے کردار کے باعث انہیں اپنے وقت کا بیشتر حصہ ایسے افراد کے ساتھ گذارنا پڑتا تھا جو ان کے سیاسی مشن کے لئے یکسر بیکار تھے" غریب عوام کے لئے اپنی محبت ظاہر کرنے کے لئے انہوں نے لندن کے ایک مفلس علاقے ایسٹ اینڈ میں رہائش اختیار کی جو کانفرنس کے جائے انعقاد سینٹ جیمز پیلس سے ۵ میل دور تھا۔ وقت کے بے جا زیاں کو روکنے کے لئے ان سے کہا گیا کہ وہ کسی قریبی ہوٹل میں رہائش اختیار کر لیں۔ لیکن انہوں نے جواب دیا کہ وہ ویسٹ اینڈ کے مہنگے ہوٹل میں رہ کر پیسے ضائع کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور نہ ہی وہ ان ہندوستانی اور انگریز عوام کی مہمان نوازی قبول کریں گے جن کے گھر سینٹ جیمز پیلس کے قریب ہیں۔ ان کے روزمرہ معمولات بھی کچھ اس طرح کے تھے جن سے احساس ہوتا تھا کہ وہ گول میز کانفرنس کے کام کو محض ثانوی اہمیت دے رہے ہیں۔ صبح کے وقت وہ ایسٹ اینڈ میں کنگسلے ہال کے قریب کچی بستیوں میں گھومتے پھرتے۔ اس وقت مرد اور عورتیں

کام کاج کے لئے نکل رہے ہوتے تھے۔ وہ گاندھی جی سے علیک سلیک اور مسکراہٹوں کا تبادلہ کرتے اور کچھ ان سے بات چیت بھی کرنے لگتے۔ گاندھی جی مقامی افراد کے گھروں میں جاتے اور ان کے بچوں سے دوستی بڑھاتے۔ بلکہ وہ سیاستدانوں' صحافیوں' نامور خواتین' سماجی کارکنوں' ادیبوں اور فنکاروں سے ملاقات کے لئے بھی وقت نکال لیتے تھے۔ اس عرصے میں انہوں نے برنارڈشا اور چارلی چپلن سے بھی ملاقات کی۔ تاہم بعد میں انٹرویو لینے والے حضرات کی سہولت کے لئے انہوں نے لندن کے وسط میں ناٹسبرج میں دفتر قائم کرنے کی حامی بھرلی۔ ہفتے کے آخری ایام میں وہ آکسفورڈ' کیمبرج اور لنکا شائر کاٹن ملز جانے کی دعوتیں بھی قبول کر لیا کرتے تھے۔ جب کہ دوسری طرف ان کے پاس کانفرنس کے دیگر ہندوستانی شرکاء کو دینے کے لئے کوئی وقت نہ تھا۔ ہندوستان کے لبرل سیاستدان اس صورتحال سے خصوصاً بہت دل گرفتہ تھے۔ ان تمام سرگرمیوں کے نتیجے میں گول میز کانفرنس میں ان کی کارکردگی بہت پست معیار کی تھی۔ یہ شدید افسوس کا مقام تھا کہ گاندھی جی نے گول میز کانفرنس کے کمیٹی روم میں بیٹھ کر کام کرنے کی بجائے زیادہ توجہ عدم تشدد کی تبلیغ پر دی۔ اپنے ایک مقبول لیکچر میں انہوں نے کہا۔

"میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا کام کانفرنس سے باہر ہے ----- وہ بیج جو اب بویا جا رہا ہے برطانوی سپرٹ کی نرمی پر منتج ہو سکتا ہے ----- اس سے انسانوں پر ہونے والے استبداد کا انسداد ممکن ہے۔"

لیکن چرچ کے اہلکاروں' پروفیسروں اور خطیبوں کے سامنے ان کا یہ سارا پروپیگنڈہ اس مقصد کے اعتبار سے بالکل بے کار تھا جس کے لئے انہیں انگلستان بھیجا گیا تھا۔

پہلی گول میز کانفرنس کے دوران گاندھی جی جیل میں تھے لیکن ان کی روح کانفرنس کی میز پر منڈلاتی رہی تھی۔ کانفرنس میں شریک لبرل ہندوستانی رہنماؤں نے ان کے نام اور شہرت کو اپنے مقاصد کے لئے پوری طرح استعمال کیا تھا۔ لیکن دوسری گول میز کانفرنس جس میں وہ بہ نفس نفیس اور تنہا موجود تھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنے نام

سے وابستہ شکوہ اور عظمت کھو چکے ہیں۔ انہوں نے (برطانوی اہلکاروں نے) محسوس کیا کہ "کیا یہ نحیف و نزار دھوتی پوش انسان اس قدر طاقتور ہے کہ اتنی مضبوط برطانوی حکومت اس کے سامنے جھک جائے؟" مختلف کمیٹیوں کی پیش کردہ رپورٹوں میں نام نہاد اکثریت کے نظریات کو تو خاطر خواہ اہمیت دی گئی جب کہ گاندھی جی کے خیالات کو محض اختلافی نوٹ کی حیثیت دی گئی۔ جب انہیں کانفرنس میں اپنی مایوس کن پوزیشن کا احساس ہوا تو انہوں نے کہا "اس اجلاس کے تمام فریق مختلف دھڑوں کے مفادات کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ جب کہ کانگریس واحد (جماعت) ہے جو پورے ہندوستان اور سب کے مفادات کی نمائندگی کی دعویدار ہے ----- پھر بھی میں یہاں دیکھ رہا ہوں کہ کانگریس سے ایسی جماعتوں کا سا سلوک روا رکھا جا رہا ہے -----"

گاندھی جی کو بدترین ناکامی کا سامنا اس وقت کرنا پڑا جب کانفرنس میں فرقہ وارانہ نمائندگی کا سوال اٹھایا گیا۔ یہاں تو شاطر برطانوی سیاستدانوں نے انہیں بالکل بے بس کر دیا۔ سبھاش چندر بوس نے تو گاندھی جی کو انگلستان روانگی سے قبل ہی آگاہ کر دیا تھا کہ ان کے پاس اطلاع موجود ہے کہ برطانوی سیاستدان کانفرنس کے شروع ہوتے ہی فرقہ وارانہ نمائندگی کا مسئلہ ضرور اٹھائیں گے۔ تاکہ ہندوستانیوں کو آپس میں لڑایا جا سکے اور وہ بڑے مسائل پر حکومت برطانیہ کے مقابلے میں متحد نہ ہو سکیں۔ بوس کی پیشنگوئی درست ثابت ہوئی۔ جونہی کانفرنس نے اپنی کارروائی کا آغاز کیا تو یہ معلوم ہوا کہ مختلف اقلیتوں نے آپس میں ایک معاہدہ کر لیا ہے جس کی رو سے وہ مجوزہ وفاقی اور صوبائی مجالس قانون ساز میں بھاری نمائندگی کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ یہ تحریک' کانفرنس کے یورپی شرکاء کے زیر اثر پیش کی گئی تھی جو سر ایڈورڈ بینتھل کی قیادت میں ہندوستان سے آئے تھے انہیں برطانوی مندوبین کے ٹوری گروپ کی تائید و حمایت بھی حاصل تھی۔ گاندھی جی نے احتجاج کرتے ہوئے زور دیا کہ یہ کانفرنس بنیادی طور پر ہندوستان کے لئے دستوری خاکہ تیار کرنے کے لئے طلب کی گئی ہے اس لئے اس کے اساسی مقصد کو ترجیح دی جانی

چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ فرقہ وارانہ معاملات کی بات اصل مسائل کے حل کے بعد چھیڑنی چاہیے۔ لیکن ان کے احتجاج پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ ریمزے میکڈونلڈ نے جواز پیش کیا کہ اقلیتوں کا معاہدہ ہندوستان کے ساڑھے گیارہ کروڑ عوام کی رائے کا ترجمان ہے۔ اس لئے برطانوی حکومت اسے خاطر خواہ توجہ دینے کی پابند ہے۔ انہوں نے ہلکی پھلکی سرزنش کے انداز میں گاندھی جی کو انتباہ کیا کہ فرقہ وارانہ سوال پر ان کا رویہ آئین سازی کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہو رہا ہے۔ لیکن اس مسئلے پر سرے سے کوئی پیش رفت نہ ہو سکی اور کانفرنس یکم دسمبر ۱۹۳۱ء کو ناکامی سے دو چار ہو کر نفرت اور شک و شبے کی فضاء میں ختم ہو گئی۔ باہمی اتحاد و اتفاق پیدا کرنے میں ہندوستانیوں کی نااہلی پوری دنیا پر افشا ہو گئی۔

گاندھی جی کی شکست فاش کی پوری تصویر کشی سر ایڈورڈ بینتھل نے اپنے ایک خفیہ خط میں کی جو ان کے ان رفیقوں کو جاری کیا گیا جو گول میز کانفرنس میں ہندوستان میں برطانیہ کے تجارتی مفادات کی نمائندگی کر رہے تھے۔ گاندھی جی کانفرنس میں کانگریس کے واحد نمائندہ تھے انہوں نے کانگریس کے کسی اور رکن کو اس قابل نہیں سمجھا کہ اسے اپنے ساتھ لے جاتے لیکن یہاں یہ بات بے حد دلچسپ ہے کہ ان کے سرمایہ دار دوست جی ڈی برلا ان کے ہمراہ تھے۔ بھارت کے سرمایہ دار' گول میز کانفرنس کے نتائج میں سیاستدانوں سے کچھ کم دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اپنی خود نوشت سوانح کے صفحہ ۲۴۱ پر لکھتے ہیں۔

"یہ بات ہم پر پہلے سے کہیں زیادہ کھل کر واضح ہو گئی کہ قوم پرستی کے پر فریب پردے میں کس طرح باہم متصادم اقتصادی مفادات کار فرما تھے اور کس طرح یہ مفادات قوم پرستی ہی کے نام پر مستقبل میں خود کو قائم رکھنا چاہتے تھے۔ گول میز کانفرنس بھی انہی مفادات کا مجموعہ تھی۔"

جنگ عظیم اول (۱۸-۱۹۱۴ء) سے قبل ہندوستان میں سرمایہ داروں کا سیاسی رسوخ

بے حد معمولی تھا لیکن جنگ کے دوران ان کے کمائے ہوئے منافع اور ہندوستان کے منظر نامے پر گاندھی جی کے ظاہر ہونے سے یہ پوزیشن یکسر بدل گئی۔ لوگ اب ملک میں اقتصادی بالادستی کے ساتھ اس کی لازمی کڑی یعنی سیاسی بالادستی کے بھی خواہشمند تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مارواڑی اور گجراتی سرمایہ دار گاندھی جی کے اردگرد اکٹھے ہونے لگے اور انہوں نے نہ صرف گاندھی جی بلکہ کانگریس کو بھی بھاری عطیات دیے۔ گول میز کانفرنس کے پس پردہ ہندوستانی سرمایہ دار جنگ لڑ رہے تھے۔ سر ایڈورڈ بینتھل کے خفیہ خط کا متن ملاحظہ ہو۔

"اگر آپ گزشتہ اجلاس کے نتیجے پر نظر ڈالیں تو آپ دیکھیں گے کہ گاندھی اور انڈین فیڈرٹیڈ چیمبر' سینٹ جیمز پیلس کے دورے کے ماحصل کے طور پر سرکار برطانیہ سے کوئی ایک رعایت لینے میں بھی ناکام رہے ہیں۔ وہ تہی دست ہندوستان واپس لوٹے۔

"ایک اور واقعہ بھی ایسا ہوا جس سے انہیں (گاندھی جی کو) کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ انہوں نے فرقہ وارانہ مسئلہ حل کرنا چاہا۔ لیکن پوری دنیا کے سامنے ناکام ہو گئے۔

"مسلمانوں کا وفد مضبوط اور پرجوش تھا۔ قوم پرست مسلم رہنما علی امام نے کوئی کھنڈت پیدا نہیں کی۔ پورے دورانئے میں انہوں نے اپنے پتے بڑی مہارت سے کھیلے۔ انہوں نے ہم سے حمایت کا وعدہ کیا اور اسے پوری طرح نبھایا۔ جواباً انہوں نے ہم سے کہا کہ ہمیں بھی بنگال میں ان کی اقتصادی بدحالی کو نظرانداز نہیں کرنا چاہئے اور انہیں "بہلائے پھسلائے بغیر" یورپی فرموں میں ان کے لئے ملازمتیں تلاش کرنی چاہئیں تاکہ انہیں بھی اپنی معاشی حیثیت بہتر بنانے اور اپنے فرقے کی عمومی حالت مستحکم کرنے کا موقع مل سکے۔

"----- عام انتخابات کے بعد حکومت کے دائیں بازو (برطانوی قدامت پسندوں) نے

تہیہ کر لیا کہ وہ کانفرنس کو ناکام بنائیں گے اور کانگریس سے لڑیں گے۔ مسلمان جو مرکز میں کوئی ذمہ داری نہیں اٹھانا چاہتے تھے' (اس فیصلے پر) بے حد خوش ہوئے۔ -----

"مسلمان انگریزوں کے پختہ حلیف بن چکے ہیں۔ وہ اپنی حیثیت سے بے حد مطمئن ہیں اور ہمارے ساتھ کام کرنے پر تیار ہیں"

(از سیتا رمیہ' جلد اول صفحہ ۵۱۹)

یہ بات گہرے رنج والم سے تسلیم کرنی پڑے گی کہ سر ایڈورڈ بینتھل کے خفیہ خط نے گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کے کردار کو بے حد داغدار کیا ہے۔ گول میز کانفرنس کے نتائج کا خود اندازہ کرتے ہوئے گاندھی جی نے لندن سے واپسی پر اپنے ایک قریبی دوست سے جو کچھ کہا اس کے متعلق کانگریس کی سرکاری تاریخ میں پتہ بھائی سیتہ رمیہ لکھتے ہیں۔

"یہ تھے ملک کے مسائل جن سے گاندھی جی کے دوستوں نے انہیں آگاہ کیا۔ جب کہ ان کے پاس بھی دوستوں کو سنانے کے لئے ایک دکھ بھری کہانی موجود تھی جو وہ لندن سے لے کر آئے تھے ----- وہ خود لندن گئے تھے اور چیزوں کا اپنی نظر سے مشاہدہ کر کے آئے تھے۔ واپس آتے ہی جو پہلی بات انہوں نے اپنے رفقائے کار کو بتائی وہ یہ تھی کہ کسی چیز کا حقیقی روپ دھارنا اس کی تخیلاتی کیفیت سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ وہ ہندوستان کے اعتدال پسندوں کے خیالات سے آگاہ تھے لیکن وہ لندن میں ہونے والے واقعات کے لئے تیار نہ تھے۔ وہ مسلمانوں کے مزاج اور ان کے رجعت پسندانہ انداز فکر سے بھی واقف تھے لیکن انہیں اس قدر شدید علیحدگی پسندانہ رجحانات کا ہرگز اندازہ نہ تھا جن کا گول میز کانفرنس کے موقعے پر مظاہرہ کیا گیا۔ انہوں نے عزم کر لیا تھا کہ کانگریس کو کسی قسم کی فرقہ واریت کی حمایت نہیں کرنی چاہئے۔ کانگریس کو ہمیشہ خالص قوم پرستی کی علمبردار رہنا چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ اگر

ہندوستان بدستور قدامت پسندانہ انداز میں فرقہ وارانہ مسائل سے چمٹا رہا تو اس کے لئے کوئی موقع نہیں رہے گا۔ وہ اپنے مسلمانوں اور سکھ دوستوں سے یہی یقین دہانی چاہتے تھے کہ وہ ہندوستان کے آئندہ آئین پر صرف اس صورت میں متفق ہوں گے اگر وہ ہندوستانی قوم پرستی کی اساس پر تیار کیا جائے اور اس پر فرقہ واریت کی کوئی چھاپ یا دھبہ نہ ہو -----"

(جلد اول' صفحہ ۵۱۰)

مذکورہ بالا رپورٹ جو گاندھی جی نے گول میز کانفرنس سے لوٹنے پر اپنے احباب کو پیش کی' مذاکرات اور گفت و شنید کے میدان میں ان کی شدید کمزوری کی عکاس ہے۔ ان کی اس کمزوری کو گوکھلے نے مختصر سی ملاقاتوں کے بعد اسی وقت بھانپ لیا تھا جب وہ (گاندھی جی) جنوبی افریقہ سے لوٹے تھے۔ گوکھلے نے جے کار سے کہا۔

"ان (گاندھی) کے اندر کوئی ایسی چیز موجود ہے جو غریب آدمی کی توجہ فوری طور پر مبذول کر لیتی ہے اور وہ نہایت سرعت سے کمتر اور ستم رسیدہ انسانوں سے ناطہ قائم کر لیتے ہیں ----- لیکن محتاط رہیں' ہندوستان ایسے موقعوں پر ان پر بھروسہ نہیں کر سکتا جہاں احتیاط کے متقاضی نازک مذاکرات کرنے ہوں اور جہاں کامیابی کے لئے ضبط و توازن اور سمجھ بوجھ ضروری ہو۔ جہاں اس اصول پر عملدرآمد زیادہ اہم ہو کہ آدھا ٹکڑا بھی سرے سے روٹی نہ ہونے سے بہتر ہے۔

(میری داستان حیات از جے کار' صفحہ ۳۱۷)

گوکھلے کے الفاظ کس قدر الہامی تھے۔

باب نمبر21

گول میز کانفرنس کے بعد گاندھی جی کی سرگرمیاں

(۱۹۳۲۔۱۹۳۶ء)

گول میز کانفرنس کے بعد گاندھی جی ۲۸ دسمبر ۱۹۳۱ء کو بمبئی پہنچے۔ اس وقت تک ہندوستان کی سیاسی فضا بے حد کشیدہ ہو چکی تھی۔ کانگریس بغاوت کے موڈ میں تھی کیونکہ اس کے مطابق لارڈ ولنگڈن کی حکومت نے گاندھی۔ اروِن معاہدے کی شرائط کا رتی بھر احترام نہیں کیا تھا بلکہ وہ کانگریس پر براہ راست حملہ شروع کرنے پر تلی بیٹھی تھی۔ ان حالات میں واپس آتے ہی گاندھی جی نے وائسرائے سے بات چیت کی خواہش ظاہر کی جس کے جواب میں وائسرائے نے کہا کہ وہ گاندھی جی سے ان اقدامات پر گفتگو کے لئے تیار نہیں ہیں جو حکومت نے مختلف صوبوں میں امن و امان برقرار رکھنے کے لئے کیے ہیں۔ جس کے جواب میں گاندھی جی نے سول نافرمانی کی تحریک دوبارہ شروع کر دینے کی دھمکی دے دی۔ وائسرائے کے نام ان کے اس خط کا متن اس طرح سے ہے۔

"عدم تشدد میرا حتمی ضابطہ عمل ہے۔ مجھے یقین ہے کہ سول نافرمانی نہ صرف عوام کا فطری حق ہے بلکہ اس صورت میں جب اپنی ہی حکومت میں عوام کی کوئی موثر آواز نہ ہو' یہ تشدد یا مسلح بغاوت کا انتہائی پر اثر متبادل ہے۔ چنانچہ میں اپنے ضابطہ عمل سے کبھی انکار نہیں کروں گا۔ اس کے حصول کی خاطر ورکنگ کمیٹی نے میری ہدایت قبول کر لی ہے اور کچھ قراردادیں منظور کی ہیں جن میں سول نافرمانی کا تجرباتی خاکہ پیش کیا گیا ہے"

(تندولکر' جلد سوم' صفحات ۱۵۳۔۱۵۴)

حکومت نے جواب دیا کہ گاندھی جی اور کانگریس کے رویے کو دیکھتے ہوئے وہ امن

و امان کی صورتحال برقرار رکھنے کے لئے تمام ممکنہ اقدامات کرے گی۔ علاوہ ازیں حکومت نے متعدد آرڈیننس پاس کیے اور ۴ جنوری ۱۹۳۲ء کو گاندھی جی کو حراست میں لے لیا گیا۔ کانگریس کی تمام تنظیموں کو بھی غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ یہ سب کچھ گاندھی جی کی ہندوستان واپسی کے ایک ہفتے کے اندر اندر ہو گیا۔ جیل میں گاندھی جی نے نئے لائحہ عمل پر غور شروع کر دیا۔ دو ماہ کے غور و خوض کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب وہ پسماندہ طبقات کو جداگانہ حق انتخاب دینے کے مجوزہ منصوبے کے خلاف حکومت سے لڑیں گے۔ ۱۱ مارچ ۱۹۳۲ء کو انہوں نے وزیر خارجہ برائے امور ہند سر سموئیل ہور کو خط میں لکھا کہ اگر حکومت برطانیہ نے پسماندہ طبقات کے لئے جداگانہ طرز انتخاب کی تجویز ترک نہ کی تو وہ روزہ (احتجاجاً) رکھیں گے۔ یہاں ان حالات کا تذکرہ بھی ضروری ہے جن کے تحت حکومت برطانیہ کو عارضی طور پر مفلس طبقات کے لئے جداگانہ طرز انتخاب رائج کرنے کی تجویز پیش کرنی پڑی۔ دوسری گول میز کانفرنس کے دوران تمام اقلیتوں نے کانگریس کے خلاف مشترکہ اتحاد کیا لیکن فرقہ وارانہ نمائندگی کے مسئلے پر کوئی باہمی سمجھوتہ نہ کر سکیں۔ اس پر برطانوی وزیراعظم ریمزے میکڈونلڈ نے اپنے خلاف منشاء ایک انتہائی نیک ثالث کا کردار ادا کرتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ حضرات تمام جماعتوں کے لئے قابل قبول کوئی ایسا معاہدہ پیش نہیں کر سکتے جسے بنیاد بنا کر مزید پیش رفت کی جا سکے تو پھر سرکار برطانیہ فرقہ وارانہ نمائندگی کے لئے ایک عارضی سکیم نافذ کرنے پر مجبور ہو گی" اس مجوزہ سکیم کو "کمیونل ایوارڈ" کا نام دیا گیا جس میں ملک کے پسماندہ طبقات کو ہندو حلقہ جات انتخاب کی عام نشستوں کے علاوہ، صوبائی مجالس قانون ساز میں کچھ مخصوص نشستیں دینے کی تجویز پیش کی گئی۔ یہ نشستیں جداگانہ طرز انتخاب کی بنیاد پر دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کیمونل ایوارڈ کے ذریعے ملک کے پسماندہ اور اقلیتی طبقات کو دوہرا فائدہ پہنچایا گیا۔ اب اس عالم میں کانگریس اس ایوارڈ کو تسلیم کر سکتی تھی نہ مسترد۔ ۱۷ اگست ۱۹۳۲ء کو ایوارڈ کے اعلان کے موقعے پر گاندھی جی

یرداد جیل میں تھے۔ یہ سنتے ہی انہوں نے برطانوی وزیراعظم کو لکھا کہ وہ اس ایوارڈ کے خلاف احتجاجاً تادم مرگ روزہ (مرن برت) رکھیں گے۔ اس فاقہ کشی کا آغاز وہ ۲۰ ستمبر کی دوپہر سے کر دیں گے۔ ریمزے میکڈونلڈ نے اس کا نہایت تلخی سے جواب دیا۔

"مجالس قانون ساز میں پسماندہ طبقات کی نمائندگی کو ان کا حق گردانتے ہوئے' اس کے تحفظ کو ہم نے اپنا فرض جانا ہے۔ اور ہم اس بات میں بھی برابر محتاط رہے ہیں کہ وہ (پسماندہ طبقات) ہندوؤں سے کٹنے نہ پائیں سرکاری سکیم کی رو سے پسماندہ طبقات بدستور ہندو معاشرے کا حصہ رہیں گے اور ہندوؤں کے ساتھ برابری کی سطح پر ووٹ دیں گے۔

"لیکن ابتدائی ۲۰ برسوں کے دوران جب کہ وہ ہندو معاشرے ہی کا حصہ ہوں گے' محدود تعداد میں خصوصی حلقوں کے ذریعے انہیں ان کے حقوق اور مفادات کا تحفظ بہم پہنچایا جائے گا۔

"آپ نے فاقہ کشی کے ذریعے موت تک کا جو انتہا پسندانہ راستہ اپنانے کی بات کی ہے وہ اس لئے نہیں کہ پسماندہ طبقات کو دیگر ہندوؤں کی طرح مشترکہ طرز انتخاب کا حصہ بنایا جائے' کیونکہ ایسا تو پہلے ہی ہو چکا ہے بلکہ آپ کا مقصد صرف پسماندہ طبقات کو جو آج شدید مشکلات برداشت کر رہے ہیں' محدود پیمانے پر اپنے نمائندے مجالس قانون ساز میں پہچانے سے روکنا ہے جو ان کے ایماء پر بات کر سکیں -----"

(تندولکر' جلد سوم' صفحہ ۱۶۲)

جواباً گاندھی جی کا رویہ اس طرح تھا۔

"میں اپنی زندگی سے آپ کے فیصلے کے خلاف مزاحمت کروں گا ایسا کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ میں تادم مرگ بھوکا رہوں گا اور ہر قسم کی کھانے پینے کی اشیاء سے پرہیز کروں گا۔ سوائے نمک یا سوڈا ملے پانی سمیت یا

ان کے بغیر پانی کی۔"

(تندولکر، جلد سوم، صفحہ ۲۱۱)

طے شدہ معمول کے مطابق اس فاقہ کشی کا آغاز ۲۰ ستمبر ۱۹۳۲ء کی دوپہر کو پونا کی یرواد جیل میں ہو گیا۔ گاندھی جی کے روزے نے بے حد کھلبلی مچائی اور کانگریس کے رہنما، لبرل ہندوستانی سیاستدان، کروڑ پتی افراد اور سرمایہ دار برلا ہاؤس بمبئی میں اکٹھے ہو گئے۔ اب امیڈکر کے ساتھ نشستوں کے مسئلے پر دنگل شروع ہوا۔ امیڈکر کی شرائط سننے کے بعد سپرد، جے کار، راج گوپال اچاریہ، برلا اور راجندر پرساد یرواد روانہ ہوئے۔ بمبئی کے نامور ڈاکٹر، ڈاکٹر گلڈر اور ڈاکٹر پٹیل بھی وہاں موجود تھے۔ تار کے ذریعے گاندھی جی کے دل کی رفتار اور خون کے دباؤ کی پیمائش لندن اور پوری دنیا میں مشتہر کی جا رہی تھی۔ ٹیگور کلکتہ سے آئے اور انہوں نے اپنے منتخب نغمات گا کر مہاتما کو سنائے۔ ان کے سکون قلب کے لئے موسیقاروں کو جیل بھیجا گیا جنہوں نے ساز بجا کر بھجن گائے۔ آخر کار گاندھی جی نے ہریجن امیڈکر سے ہار مان لی اور دونوں کے درمیان یہ تصفیہ ہوا کہ ریمزے میکڈونلڈ کے کمیونل ایوارڈ کے تحت پسماندہ طبقات کو ۷۱ کی بجائے ۱۴۷ مخصوص نشستیں ملیں گی۔ گاندھی امیڈکر سمجھوتے کی تفصیل بھی بذریعہ تار، لندن بھیج دی گئی۔ ریمزے میکڈونلڈ اور سرسیموئل ہور نے اس کی منظوری دی اور اب مہاتما جی اپنا روزہ توڑ سکتے تھے۔ یہ تاریخی روزہ بڑی دھوم دھام، تشہیر اور جوش و خروش سے توڑا گیا۔

ہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ گول میز کانفرنس کے دوران اقلیتوں کے معاہدے میں شامل ہو کر ڈیڈ لاک پیدا کرنے میں پہلے پہل ڈاکٹر امیڈکر رضا مند نہیں تھے۔ وہ پسماندہ طبقات کے لئے کچھ رعایات کے طلبگار بن کر پہلے گاندھی جی کے پاس گئے تھے لیکن گاندھی جی نے انہیں یکسر کوئی توجہ نہیں دی۔ معاہدہ پونا طے ہونے پر ڈاکٹر امیڈکر نے کہا۔

"مجھے افسوس صرف اسی بات پر ہے کہ مہاتما جی نے یہی رویہ گول میز کانفرنس کے

دوران کیوں نہیں اپنایا۔ اگر انہوں نے اس وقت میرے نقطہ نظر سے ہمدردی ظاہر کی ہوتی تو ان کے لئے اس امتحان سے گزرنا ضروری نہ ہوتا۔"

(گاندھی از لوئیس منشر، صفحہ ۳۴۴)

سبھاش بوس کا تبصرہ درج ذیل ہے۔

"یہ معاہدہ (اقلیتوں کا معاہدہ) کرنے سے پیشتر ڈاکٹر امبیڈ کر مہاتما کے ساتھ ایک سمجھوتہ کرنا چاہتے تھے جس کی رو سے مجالس قانون ساز میں مشترکہ طرز انتخاب کی بنیاد پر پسماندہ طبقات اور ہندوؤں کے ہر فرقے / طبقے کے لئے کچھ نشستیں مخصوص کی جاسکیں۔ لیکن اس موقعے پر مہاتما کسی سمجھوتے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ جب ڈاکٹر امبیڈ کرنے اقلیتوں کے معاہدے میں شرکت کی تو نہ صرف انہیں مخصوص نشستوں کی بلکہ جداگانہ طرز انتخاب کی یقین دہانی بھی کروائی گئی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر اس وقت ڈاکٹر امبیڈ کر سے کوئی سمجھوتہ کر لیا جاتا تو اس کی شرائط ستمبر ۱۹۳۲ء کے معاہدہ پونا کی شرائط سے کہیں بہتر ہوتیں جو کہ مہاتما کے انتہائی اہم روزے کے بعد طے پایا۔"

(ہندوستان کی جدوجہد از سبھاش بوس، صفحات ۹۔۳۰۸)

لیکن گاندھی جی کے اگلے منصوبے میں جیل میں ایک اور روزہ رکھنا شامل تھا۔ اس روزے کا نام انہوں نے تزکیہ نفس کا روزہ رکھا۔ گاندھی جی کے اپنے الفاظ میں یہ روزہ ----- "اپنے نفس کی پاکیزگی کے لئے ایک دل کی دعا تھا (یہ روزہ) میرے رفقائے کار کے لئے بھی ایک دعا تھا تاکہ وہ ہریجنوں کے حقوق کے ضمن میں زیادہ چستی اور احتیاط کا مظاہرہ کر سکیں۔" لیکن روزے کے پہلے ہی دن ۸ مئی ۱۹۳۳ء کو حکومت نے انہیں رہا کر دیا۔ جیل سے نکلتے ہی انہوں نے سول نافرمانی کی تحریک عارضی طور پر معطل کر دی تاکہ حکومت سے مراسم کی بحالی اور تفہیم ممکن ہو سکے۔ لیکن ان کی تمام سرگرمیاں حکومت کی توجہ سرمو بھی مبذول کروانے میں ناکام رہیں۔ پھر گاندھی جی نے وائسرائے سے باہمی بات چیت کی درخواست کی تاکہ امن کے امکانات کھوجے جاسکیں۔ لیکن وائسرائے نے

انہیں ملنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد گاندھی جی نے انفرادی حیثیت میں ستیہ گرہ شروع کر دیا اور فی الفور دوبارہ جیل بھیج دیے گئے۔ جیل میں انہوں نے پھر سے فاقہ کشی کا آغاز کر دیا کیونکہ حکومت نے انہیں ہریجنوں سے متعلق سرگرمیاں جاری رکھنے کے لئے سہولتیں دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کی یہ بھوک ہڑتال جاری تھی کہ ۲۶ اگست ۱۹۳۳ء کو حکومت نے انہیں غیر مشروط طور پر رہا کر دیا۔ یہ رعایت انہیں صحت کی بنیاد پر دی گئی لیکن ساتھ ہی یہ بات ان پر اچھی طرح واضح کر دی گئی کہ سول نافرمانی کے احیاء کی کسی بھی کوشش سے سختی سے نمٹا جائے گا۔

ان حالات میں گاندھی جی نے ہریجنوں کے کام ہی میں مصروف رہنے کو دانشمندی سمجھا اور اس طرح ملک میں سیاسی سرگرمیاں جمود کا شکار ہو گئیں۔ لیکن یہ صورتحال کانگریس کے متعدد ارکان کو پسند نہ آئی اور انہوں نے سوچا کہ سی آر داس اور موتی لال نہرو کی قائم کردہ سوراج پارٹی کو از سر نو زندہ کیا جائے اور پارلیمانی سرگرمیاں بحال کی جائیں۔ ڈاکٹر انصاری' ڈاکٹر بیدھن چندر رائے اور بھولا بھائی ڈیسائی نے اس ضمن میں مرکزی کردار ادا کیا اور گاندھی جی پر دباؤ ڈالا۔ گاندھی جی کی رضامندی سے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں کونسلوں میں شمولیت اختیار کرنے کا پروگرام دوبارہ اپنایا گیا۔ چنانچہ گاندھی جی نے سول نافرمانی کی تحریک معطل کر دی لیکن انہوں نے اپنے انفرادی ستیہ گرہ کا حق برقرار رکھا اس سلسلے میں ان کا فیصلہ پٹنہ سے ۷ اپریل ۱۹۳۴ء کو ایک بیان کی صورت میں جاری ہوا۔

"میں محسوس کرتا ہوں کہ عوام تک ستیہ گرہ کا پیغام صحیح طرح نہیں پہنچ سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نشرو اشاعت کے دوران اس میں کافی ملاوٹ ہو گئی ہے۔ یہ بات مجھ پر واضح ہو گئی ہے روحانی پیاموں کی تاثیر' دوران تعلیم غیر روحانی ذرائع کے استعمال سے مجروح ہوتی ہے ----- ستیہ گرہ ایک خالصتاً روحانی ہتھیار ہے ----- ہر کوئی آلات جراحی استعمال نہیں کر سکتا۔

"اب اپنے دل کو اچھی طرح ٹٹولنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ موجودہ حالات میں صرف ایک شخص کو اور وہ بھی صرف مجھے وقتی طور پر سول مزاحمت کی ذمہ داری اٹھانی چاہئے اگر اسے پورن سوراج کے حصول کا کامیاب ذریعہ بنانا مطلوب ہے۔

"سول نافرمانوں کو کیا کرنے کے لئے رہا کیا گیا ہے؟ اگر وہ (میری) صدا پر کہ وہ جہاں سے بھی آئے لبیک کہنے کے لئے تیار ہیں تو انہیں نفی ذات اور رضاکارانہ غربت کے فن اور حسن سے ضرور آگاہ ہونا چاہئے۔ انہیں قوم کی تعمیر کی سرگرمیوں میں مصروف ہونا چاہئے اور اپنے ہاتھ سے کاتنے اور بننے کے ذریعے کھدر کے استعمال کو عام کرنا چاہئے"

(تندولکر، جلد سوم، صفحات ۶۰-۲۵۹)

جیل سے رہائی کے بعد گاندھی جی کی سرگرمیوں اور بالخصوص گاندھی جی کے مذکورہ بالا بیان "انہیں نفی ذات اور رضاکارانہ غربت کے فن اور حسن سے ضرور آگاہ ہونا چاہئے" نے جواہر لال کو سخت ہراساں اور پریشان کیا جو ان دنوں علی پور جیل میں قید تھے۔ انہوں نے اس پر اپنے غم و اندوہ کا اظہار اس طرح کیا ہے۔"

"یہ تھا وہ سیاسی پروگرام جس پر ہمیں عمل کرنا تھا۔ درد کی ایک ٹیس کے ساتھ میں نے محسوس کیا کہ وفاداری کے جن دھاگوں نے مجھے ان (گاندھی جی) کے ساتھ باندھ رکھا تھا ایک جھٹکے سے ٹوٹ گئے ہیں ----- میں نے جان لیا کہ کئی معاملات پر میرے نہایت واضح اور دو ٹوک ذاتی نظریات ہیں جو گاندھی جی سے متصادم ہیں ----- تاہم گاندھی جی کی عظمت، ہندوستان کے لئے ان کی خدمات اور مجھ پر ان کا ذاتی قرض، ان سب پر کوئی سوال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ان سب کی باتوں کے باوجود متعدد معاملات میں وہ بری طرح غلط تھے۔ آخر کار ان کا مطمع نظر کیا تھا؟ ان کے ساتھ برسوں کی قربت اور رفاقت کے باوجود میں ان کے مقاصد کا درست اور واضح ذہنی احاطہ نہیں کر پایا ہوں۔ وہ ایک غیر

معمولی معمہ تھے"

(جواہر لال نہرو' خود نوشت سوانح حیات' صفحات ۹-۵۰۶)

۱۹۳۴ء کے لگ بھگ ایک اور خیال گاندھی جی کے سر میں سما گیا اور انہوں نے شدید طیش یا گرمی جذبات کے عالم میں کانگریس میں اپنی حیثیت کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔ وہ اب کانگریس سے کنارہ کش ہونے پر غور کر رہے تھے۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۳۴ء کو گاندھی جی نے ایک طویل بیان جاری کیا جس میں انہوں نے ان اختلافات کا حوالہ دیا جو ان کے اور کانگریس کے متعدد ارکان کے درمیان موجود تھے۔ انہوں نے کانگریس سے علیحدگی اختیار کرنے کے ارادے کا بھی اعلان کیا۔

"یہ بات مجھ پر ظاہر ہو رہی ہے کہ میرے اور کانگریس کے ارکان کے نقطہ نظر میں اختلافات بڑھتے جا رہے ہیں ----- مجھے انہیں بیان کرنے کی اجازت دی جائے۔ میں چرخے کے پہیے اور کھڈی کو اولیت دیتا ہوں۔ جب کہ کانگریس کے دانشور اہل علم و دانش طبقے کی زندگی سے چرخہ کاتنا یکسر غائب ہو چکا ہے۔ جنرل باڈی کو اس پر کوئی یقین نہیں رہا لیکن اس کے باوجود اگر میں ان کے دلائل کو ذہن میں رکھ سکا تو میں روزانہ ہاتھ سے چرخہ کاتنے کی بجائے ۴ آنے کا فنڈ بطور متبادل رائج کر دوں گا۔

"پارلیمانی بورڈ ہی کو دوبارہ لیجئے ----- ہاں بھی آپ کو گہرا اختلاف رائے نظر آئے گا-----

"میں نے ایک سوشلسٹ گروپ کے قیام کا خیر مقدم کیا ہے ----- (لیکن) مجھے ان سے بنیادی اختلافات ہیں ----- اگر وہ کانگریس میں عروج حاصل کر لیں جیسا کہ وہ کر سکتے ہیں۔ تو میں کانگریس میں نہیں رہ سکتا-----"

(تندولکر' جلد سوم صفحہ ۲۹۷)

اپنے اور کانگریسی دانشوروں کے درمیان اختلافات بیان کرنے کے بعد انہوں نے کہا کہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ کانگریس میں ان کی بالادست موجودگی سے آزادی فکر کی راہ

مسدود ہو رہی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ایسی صورتحال میں ان کی موجودگی تنظیم کی صحتمند نشوونما کے لئے غیر مفید ہے لہٰذا انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ کانگریس سے باہر رہیں تاکہ کانگریس کے عام ارکان کسی پابندی کے بغیر کام کر سکیں اور وہ خود بھی مکمل علیحدگی کنارہ کشی اور آزادی عمل کے احساس سے متیہ گرہ کے ساتھ اپنے تجربات جاری رکھ سکیں۔

چند ماہ ٹھہر کر دسمبر ۳۴ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا جس کی صدارت بابو راجندر پرشاد نے کی۔ اس موقعے پر گاندھی جی نے کانگریس سے اپنی علیحدگی کا رسمی اعلان کیا۔ لیکن اپنی ریٹائرمنٹ سے پہلے انہوں نے کچھ احتیاطی تدابیر اختیار کیں تا کہ کانگریس ان کے راستے سے انحراف نہ کر سکے۔ گاندھی جی کی خواہشات کے مطابق کانگریس نے مندرجہ ذیل قرارداد پیش کی جس میں کانگریس کے ارکان پر لازماً کھدر پہننے کی پابندی عائد کی گئی تھی۔

"کانگریس کا کوئی رکن کسی عہدے پر یا کمیٹی میں منتخب ہونے کا اہل نہیں ہو گا تاوقتیکہ وہ صرف ہاتھ سے بنی اور کاتی ہوئی کھدر مستقلاً" اور عادتاً نہ پہنے"

(تندولکر، جلد سوم، صفحہ ۳۰۴)

ایک اور قرارداد بھی منظور کی گئی جس میں روزانہ ۴ آنے کے عطیے کو دستی مشقت کے متبادل کے طور پر پیش کیا گیا۔

"کوئی بھی شخص کسی کانگریس کمیٹی کا انتخابی امیدوار بننے کا اس وقت تک اہل نہیں ہو گا جب تک کہ وہ اپنی تاریخ نامزدگی کے فوراً بعد ۶ ماہ تک کوئی دستی کام نہ کرے۔ وہ کانگریس کے ایماء پر یا کانگریس کے لئے اتنا کام کرے جس کی قدر/مالیت فی مہینہ ۵۰۰ گز یا ۱۰ کاؤنٹ عمدہ سوت کے برابر ہو۔ وہ ۸ گھنٹے فی مہینہ وقت اس کام کے لئے وقف کرے۔"

(ایضاً صفحہ ۳۰۴)

اس دوران "آل انڈیا ولیج انڈسٹریز ایسوسی ایشن" کے نام سے ایک نئی تنظیم قائم کی

گئی جس کے چیف ایگزیکٹو جے سی کمار پہ تھے۔ جنہیں گاندھی جی کی مشاورت' رہنمائی اور نگرانی میں کام کرنا تھا۔ چنانچہ کانگریس کے آئین میں انقلابی تبدیلیاں کی گئیں ان قراردادوں نے کانگریس کو ایک خالصتاً گاندھی زدہ تنظیم بنا دیا جس میں صرف ان افراد کا داخلہ ممکن تھا جو چرخہ کاتنے کے ذریعے برین واشنگ کے عمل سے گزر چکے تھے۔ اس بات کا یقین حاصل کرنے کے بعد کہ کانگریس میں اللہ مومنین کے کوئی اور داخل نہیں ہو سکے گا' مومنین کے سالار نے کانگریس سے اپنی رسمی کنارہ کشی کا اعلان کر دیا۔ یہ سب کچھ گاندھی جی نے کانگریس کو ایک جمہوری اور نمائندہ تنظیم بنانے کے نام پر کیا۔

گاندھی جی کی ریٹائرمنٹ کے رسمی اعلان کے بعد کانگریس نے ان کے لئے اعتماد کی قرارداد مندرجہ ذیل الفاظ میں منظور کی۔

"کانگریس مہاتما گاندھی کی قیادت پر اپنے اعتماد کا اعادہ کرتی ہے۔ ----- یہ (کانگریس) قوم کے لئے گاندھی جی کی بے مثال خدمات کا گہرے تشکر سے اعتراف کرتی ہے اور ان کی اس یقین دہانی پر اطمینان کا اظہار کرتی ہے کہ جب بھی ضروری ہوا ان کی ہدایت و رہنمائی کانگریس کو میسر رہے گی"

یہ بھی حقیقت ہے کہ کانگریس نے ان کی یقین دہانی سے پورا پورا استفادہ کیا اور کوئی بڑا فیصلہ ان کی مشاورت کے بغیر کبھی نہیں کیا گیا۔ بظاہر وہ کانگریس سے الگ تھلگ رہے لیکن انہوں نے عارضی رخصت کے اس عبوری دور کو اپنی طرز کے سپاہی تیار کرنے میں صرف کیا۔ ان میں ان کی آل انڈیا سپنرز ایسوسی ایشن کے کھدر پوش تعمیری کارکن' گاندھی سیوا سنگھ' ویلج انڈسٹریز ایسوسی ایشن اور ہریجن سیوک سنگھ شامل تھے۔ یہ تنظیمیں گاندھی جی کے سپاہیوں کا حقیقی مرکز و محور تھیں یہ افراد ان کی بٹالین تھے جو ان کے اشارے پر کچھ بھی کرنے حتیٰ کہ مرنے کو بھی تیار تھے۔ کانگریس سے برائے نام ریٹائرمنٹ کے بعد بھی اس پر گاندھی جی کا کنٹرول یا گرفت کبھی ڈھیلی نہیں پڑی' کچھ عرصہ بعد فروری ۱۹۳۶ء میں انہوں نے گاندھی سیوا سنگھ سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

"میں محسوس کرتا ہوں کہ ایسی سوچ کے رجحانات موجود ہیں اور ایسے خیالات پائے جا رہے ہیں کہ یہ پروگرام (تعمیری اور سیاسی) ایک دوسرے سے یکسر علیحدہ فرق بلکہ متصادم ہیں ----- لیکن فی الحقیقت ایسا کوئی اختلاف موجود نہیں ----- سیاسی اور سماجی پروگراموں کے درمیان کوئی حتمی تفریق ہے ہی نہیں۔ ہمارے طریقہ کار میں کسی قسم کی سخت حد بندیاں نہیں ہیں"

(تندولکر، جلد چہارم، صفحہ ۵۴)

اپنی برائے نام ریٹائرمنٹ کے وقت اس قسم کے حربوں سے انہوں نے کانگریس میں اپنی حیثیت مزید مستحکم کر لی۔ وہ کانگریس کے ڈکٹیٹر (آمر) بن گئے جو اب "صرف سچے معتقدین کی بند فوج" میں تبدیل ہو چکی تھی۔ کانگریس اب کوئی جمہوری یا عوام کی نمائندہ تنظیم نہیں رہی تھی۔

باب 22

کانگریس سے اختلافات مٹانے اور تفہیم کے لئے جناح کی مساعی (۱۹۳۴ء۔۱۹۳۷ء)

گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کے وفد کی سربراہی آغا خان نے کی۔ جناح نے کانفرنس کی فضا کو اپنے مزاج سے موافق نہ پاتے ہوئے اس میں کوئی سرگرم حصہ نہیں لیا۔ علاوہ ازیں وہ کسی کے "نمبر دو" ہونے کا کردار ادا کرنے کے عادی نہ تھے۔ کانفرنس کے اختتام پر انہوں نے لندن ہی میں مستقل سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ غالباً سب سے پہلی وجہ ان کی اہلیہ کے انتقال کی تھی۔ ہندوستان کے سیاسی واقعات اور بیوی کی موت سے جناح بے حد ناخوش تھے۔ چنانچہ گول میز کانفرنس کے دوران ان کا مزاج مستقل افسردہ رہا اور وہ اس کی کارروائی کے دوران کم و بیش خاموش تماشائی ہی رہے۔ کانفرنس کے اختتام پر انہوں نے لندن کے نواحی علاقے ہمپسٹڈ میں ایک گھر خرید لیا اور پریوی کونسل میں وکالت کرنے لگے۔

بعد ازاں گاندھی اور کانگریس کی ہائی کمان سے سخت دلبرداشتہ ہونے کے بعد انہوں نے علی گڑھ میں تقریر کی اور گول میز کانفرنس کے بعد ہندوستان چھوڑنے کی وجوہات بیان کیں۔ انہوں نے کہا۔

"گول میز کانفرنس کی نشستوں میں مجھے زندگی کا (شدید) دھچکہ پہنچا۔ اس خطرے کے پیش نظر ہندوؤں کے جذبات' خیالات اور رویے سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اتحاد کی کوئی امید باقی نہیں رہی۔ مجھے اپنے ملک کے متعلق شدید مایوسی ہوئی۔ حالات نہایت خراب تھے۔ مسلمان تو نومینز لینڈ (علاقہ غیر؟) کے باشندوں کی طرح رہ رہے تھے۔ ان کی قیادت برطانوی حکومت کے کمتر اور سطحی سیاستدان یا کانگریس کے حلقہ بگوش رہنما کر رہے تھے۔

جب کبھی بھی مسلمانوں کو منظم کرنے کی کوششیں کی گئیں انہیں خوشامد پرستوں اور نا اہل رہنماؤں اور کانگریس سے تعلق رکھنے والے غداروں نے خاک میں ملا دیا۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں نہ تو ہندوستان کی مدد کر سکتا ہوں نہ ہندوؤں کی ذہنیت بدل سکتا ہوں اور نہ مسلمانوں کو ان کی تشویشناک حالت کا احساس دلا سکتا ہوں۔ مجھے اس قدر مایوسی اور افسردگی ہوئی کہ میں نے مستقلاً" لندن میں رہنے کا فیصلہ کر لیا اس لئے نہیں کہ مجھے ہندوستان سے محبت نہیں ہے بلکہ اس لئے کہ میں خود کو بالکل بے بس محسوس کرتا تھا"

(جناح از ایم ایچ سید، صفحہ ۵۹۱)

گول میز کانفرنس کے موقعے پر وہ ایک درمیانی راستے کے خواہشمند تھے لیکن ان کی کوششوں کو خود مسلمان رہنماؤں نے جنہیں وہ نا اہل اور خوشامدی کہتے تھے اور ہندو لیڈروں نے جو مذہبی جنونی ذہنیت رکھتے تھے، ناکامی سے دوچار کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے خود کو گول میز کانفرنس کی کارروائیوں سے الگ تھلگ رکھا اور ان تمام سازشوں اور چالبازیوں میں کوئی حصہ نہیں لیا جو سینٹ جیمز پیلس میں پس پردہ جاری تھیں۔ وہ براہ راست جنگ کے ماہر تھے لیکن سازشوں اور ذومعنی بیانات و اقدامات سے انہوں نے ہمیشہ گریز کیا۔ جناح آغا خاں کی قیادت سے غیر مطمئن تھے اس کا اندازہ درج ذیل واقعے سے ہوتا ہے۔ ۱۹۳۵ء کے اوائل سرما میں آغا خاں مختصر دورے پر ہندوستان آئے تو مسلمانوں کے کھوجہ فرقے نے (جناح خود بھی کھوجہ فرقے سے تعلق رکھتے تھے) ان کے اعزاز میں بہت بڑے عیشائیے کا اہتمام کیا۔ واضح رہے کہ جناح ضیافت میں مہمان یا میزبان کسی حیثیت سے بھی شامل نہ تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ واضح اشارہ تھا کہ جناح، آغا خاں کی اس روش کار سے متفق نہیں تھے جو انہوں نے گول میز کانفرنس میں مسلم وفد کے سربراہ کی حیثیت سے اپنا رکھی تھی۔ اس کے علاوہ وہ کانگریس سے معاہدہ کرنے کے لئے بھی اپنی فرصت بچا کر رکھنا چاہتے تھے۔

(جناح از ایچ ایم ایس، صفحہ ۵۲۳)

۱۹۳۴ء کے اختتام پر جب وہ ابھی انگلستان ہی میں مقیم تھے انہیں بمبئی کے ایک مسلم حلقے سے انڈین لیجسلٹو اسمبلی کے لئے چن لیا گیا۔ وہ اسمبلی کے پہلے اجلاس میں شرکت کے لئے جنوری ۱۹۳۵ء میں ہندوستان آئے۔ انہوں نے ریمزے میکڈونلڈ کے کمیونل ایوارڈ سے متعلقہ بحث میں حصہ لیا۔ ان کی تقریر بے حد مصالحت آمیز تھی۔ انہوں نے کہا:

"ذاتی طور پر کیوں کہ' میں کمیونل ایوارڈ سے ہرگز مطمئن نہیں ہوں اور دوبارہ میں ایک فرد کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ میری عزت نفس کو اس وقت تک اطمینان حاصل نہیں ہو گا جب تک ہم خود اپنے لئے کوئی منصوبہ تیار نہ کریں ---- لیکن وقتی طور پر اسے قائم رہنے دیں ---- جب تک کہ متعلقہ فرقے اس کے کسی متبادل پر متفق نہیں ہو جاتے -----"

(جناح از ایم اچ سید' صفحہ ۵۱۸)

جناح کی صلح جو تقریر سے اسمبلی کے تمام فریقوں میں امید پیدا ہوئی کہ باہمی گفت و شنید سے فرقہ وارانہ مسائل کا حل تلاش کر لیا جائے گا اس وقت ڈاکٹر راجندر پرشاد کانگریس کے صدر تھے اور وہ بھی ایسے معاہدے کے لئے شدید بے تاب تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے ملاقاتیں کیں تاکہ اسمبلی کے مباحثے میں رہ جانے والا جھول دور کیا جا سکے۔ دونوں نے مسئلے کے متفقہ حل کے لئے مخلصانہ مساعی کیں لیکن طرفین کے انتہا پسندوں نے ان کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ جناح کے پرائیویٹ سیکرٹری اور سوانح نویس ایم اچ سید لکھتے ہیں کہ وہ کانگریس سے معاہدے کے اتنے شدت سے متمنی تھے کہ ڈاکٹر راجندر پرشاد سے گفتگو جاری رکھنے کے لئے وہ اسمبلی کی کاروائی سے بھی غیر حاضر رہتے تھے۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد سے بات چیت کر کے جناح بے حد متاثر ہوئے اور انہیں ہندو مہاسبھا کے انتہاپسندانہ رویے کے باعث راجندر پرشاد کی مشکلات کا اندازہ ہو گیا۔ جناح کو

بہر طور امید تھی کہ۔

"کانگریس کے رہنما اپنے وسیع تجربے اور عمدہ تربیت کی بدولت اس فرقے (مہاسبھا) پر قابو پالیں گے اور مسلمانوں کو یقین دہانی کروائیں گے کہ' یہ ایک ہندو حکومت نہیں بلکہ ایک ہندوستانی حکومت ہو گی جس میں مسلمانوں کے ساتھ نہ صرف منصفانہ سلوک کیا جائے گا بلکہ انہیں ہندوؤں کے برابر درجہ دیا جائے گا۔"

(جناح از ایم ایچ سید' صفحہ ۵۲۶)

اس دور میں ان کی پوزیشن بھی کافی عجیب تھی۔ بلاشبہ دانشوروں اور تعلیم یافتہ ہندوؤں میں (کانگریس سے باہر) وہ اپنی حب الوطنی اور سیاسی سوجھ بوجھ کے لئے سراہے جاتے تھے لیکن انتہا پسند ہندو خصوصاً ہندو مہاسبھا انہیں شک کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ مسلمانوں میں بھی ایک حلقہ ایسا تھا جو ان کی قوم پرستی کو مسلمانوں کے مفادات کے لئے قطعاً قابل قدر یا مفید نہیں گردانتا تھا۔ نئے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پر کڑی تنقید کے باعث انگریز بھی انہیں پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔

آئینی اور قانونی ذرائع سے جناح کی وابستگی اور فرقہ وارانہ مسائل کو باہمی مفاہمت سے حل کرنے کے لئے ان کے ذوق و شوق کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے۔ مارچ ۱۹۳۶ء میں لاہور میں شہید گنج کی عمارت کے قبضے پر ہندوؤں' مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان شدید فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہو گئی۔ مسجد کی پرانی عمارت پر مسلمانوں نے دعویٰ کیا جب کہ اس دعوے کو سکھوں نے مسترد کر دیا۔

صورتحال قابو سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ ان حالات میں جناح سے مسئلے کے حل کے لئے کہا گیا۔ انہوں نے یہ دعوت قبول کر لی اور لاہور چلے آئے۔ وہ انتہائی دلبرداشتہ تھے کہ ان نہایت اہم لمحات میں مسلمان اور سکھ اپنی توانائیاں فرقہ وارانہ فروعات میں ضائع کر رہے ہیں۔ لاہور میں مسلمانوں کے ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"ہم شہید گنج پر اپنا دعوی ترک نہیں کریں گے لیکن ہم اپنے برادر مذہبی گروپ کے ساتھ عزتمندانہ مفاہمت پیدا کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کریں گے۔ ہم ہر مسئلے کا حل آئینی اور پرامن ذرائع سے تلاش کریں گے اور ہمارے سامنے متعدد راستے کھلے ہیں ----- اپنے برادر مذہبی گروپ کو دھمکانے یا خوفزدہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ----- سکھ ایک عظیم کمیونٹی ہیں اور ان کے ساتھ آبرو مندانہ معاہدے سے بڑھ کر ہمارے لئے کیا بات خوش کن ہو سکتی ہے -----"

(جناح از ایم ایچ ایس' صفحات ۵۳۳-۵۳۲)

جناح کی پیش رفت پر ایک مضبوط مصالحتی کمیٹی قائم کی گئی جس میں سر محمد اقبال' راجہ نریندر ناتھ' سردار بوٹا سنگھ اور دیگر متعدد نامور ہندو' مسلمان اور سکھ رہنما شامل تھے۔ یہ جھگڑا خوش اسلوبی سے طے پا گیا۔ عزت ماب گورنر پنجاب نے جناح کی امن کوششوں کو مندرجہ ذیل الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔

"میں صورتحال میں اس بہتری کے لئے مسٹر جناح کی کوششوں کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں اور میں ان کے اس کام پر انہیں بے پایاں خراج تحسین پیش کرنا چاہتا ہوں-----" گورنر کی تقریر کا ایک حصہ پنجاب میں اس دور میں فرقہ وارانہ تعلقات پر خاطر خواہ روشنی ڈالتا ہے۔

"عزت ماب نے اس خیال کا اعادہ کیا کہ پنجاب میں تین بڑے مذہبی گروہوں کی موجودگی نے اس بات کو ناممکن بنا دیا ہے کہ ایک گروپ دوسرے پر بالادستی قائم کرے۔ استحکام کو یقینی بنانے کے لئے بہت زیادہ تعاون درکار ہے اور تعاون کا مفہوم ہے قریبی تعلقات' وسیع تر ہمدردیاں اور بہتر افہام و تفہیم"

(جناح از ایم ایچ سید' صفحہ ۵۳۵)

۱۹۳۷ء اور ۳۸ء کے دوران جناح گاندھی جی سے ذاتی رابطے کی بھرپور کوشش

کرتے رہے تاکہ کانگریس اور لیگ کے جھگڑے طے کیے جا سکیں۔ لیکن گاندھی جی اور کانگریس کی ہائی کمان نے جناح کے جذبات خیر سگالی کو درخور اعتناء نہیں گردانا۔ جس پر دل گرفتہ ہو کر جولائی ۱۹۳۷ء میں جناح نے مندرجہ ذیل بیان جاری کیا۔

"میں مسلمانوں اور عوام کو یقین دلاتا ہوں کہ میں ماضی کے واقعات سے رتی بھر بھی متاثر نہیں ہوا ہوں اور مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان کسی آبرومندانہ معاہدے کا مجھ سے بڑھ کر کوئی خیر مقدم نہیں کرے گا۔ مجھ سے بڑھ کر اس کا شائق اور اس سلسلے میں مدد کرنے والا بھی کوئی نہیں ہو سکتا۔ میں نے گزشتہ مئی میں گاندھی جی کو ایک پیغام بھیجا تھا جب وہ تی تھل میں مقیم تھے۔ اس میں میں نے ان سے درخواست کی تھی کہ وہ ہندو مسلم معاہدے کا سوال اٹھائیں اور اس ضمن میں اپنے عظیم اثر و رسوخ اور مساعی کو کام میں لائیں جس کا یہ جواب مجھے ۲۲ مئی ۱۹۳۷ء کو اس طرح موصول ہوا۔

"عزیز مسٹر جناح، خیر نے مجھے آپ کا پیغام پہنچا دیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ میں کچھ کر سکتا لیکن میں بالکل بے بس ہوں۔ اتحاد پر میرا ایمان ہمیشہ کی طرح درخشاں ہے، صرف مجھے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں دن کی کوئی روشنی نظر نہیں آتی اور ایسی تاریکی اور بری حالت میں میں صرف خدا سے نور کے لئے فریاد کر سکتا ہوں۔ آپ کا مخلص ایم کے گاندھی۔"

(جناح از ایم ایچ سید، صفحہ ۵۹۲)

جناح نے گاندھی جی سے بالمشافہ بات چیت کے لئے مزید کوشش کی، نتیجتاً انہیں مندرجہ ذیل ترش و تند جواب ملا۔

"عزیز مسٹر جناح ----- ہندو مسلم مسئلے پر جہاں تک میرا تعلق ہے میری رہنمائی ڈاکٹر انصاری نے کی۔ آج جب کہ ڈاکٹر انصاری ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں میں نے مولانا ابوالکلام آزاد کو اپنا رہنما تسلیم کر لیا ہے۔ میرا آپ کو یہی مشورہ ہے کہ پہلے مرحلے میں گفتگو کا آغاز مولانا صاحب سے ہونا چاہئے۔"

(ایضاً صفحہ ۸۶)

نومبر ۱۹۳۶ء میں بمبئی کے مسلمانوں نے جناح کے اعزاز میں استقبالیہ دیا۔ اس استقبالیے میں جناح نے کانگریس پر کڑی نکتہ چینی کی۔ لیکن ساتھ ہی انہوں نے کانگریس سے اپیل کی کہ اسے مسلمانوں کے ساتھ اپنے وہ مسائل جن سے آج کل ہندوستان دو چار ہے، حل کر لینے چاہئیں کیونکہ آپس میں جھگڑنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ "مسلم لیگ کے مقاصد بھی وہی ہیں جو کانگریس کے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مسلمان صرف ہندوستان کے آئندہ آئین کے تحت خود کو محفوظ تصور نہیں کر رہے ہیں اور اگر انہیں اس سیاسی آزادی کی یقین دہانی کرا دی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ کیوں نہ دونوں بڑی تنظیمیں باہم متحد ہو کر مشترکہ پروگرام پیش کریں"۔

(ایضاً' صفحات ۸۵۔۵۸۴)

جناح صرف اس وقت بے حد تلخ ہوئے جب انہیں پتہ چلا کہ ان کی مصالحتی کوششوں کو حقارت سے نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ جب تک ان کی عزت نفس مجروح نہ ہوئی تھی ان کی تقاریر میں کبھی کسی تلخی کا شائبہ تک نہ گزرا تھا لیکن ساتھ ہی وہ دلائل سے دوسروں کو قائل کرنے کی کوشش بھی کرتے رہے جیسا کہ ان کی تقریر سے ظاہر ہے جو انہوں نے اپریل ۱۹۳۶ء میں جمیعت العلماء کانفرنس منعقدہ دہلی میں کی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں بڑی محنت سے واضح کیا کہ نئے آئین میں اقلیتوں کے لئے تحفظات کیوں ضروری ہیں انہوں نے کہا۔

"پہلی مرتبہ ہندوستان میں کوئی نمائندہ حکومت قائم کی جا رہی ہے۔ جس کا مفہوم ہے اکثریت کی حکومت۔ فطری طور پر اقلیتیں خوف محسوس کر رہی ہیں کہ اکثریت کیا کرے گی۔ اکثریتیں عموماً استبدادی رویہ رکھتی ہیں۔ طاقت اور اختیارات سے عام طور پر لوگوں کو نشہ ہو جاتا ہے ----- چنانچہ جمہوری آئین کے کسی بھی منصوبے میں اقلیتوں کے لئے تحفظات کی فراہمی بے حد ضروری ہے"

(جناح از ایم ایچ سید، صفحہ ۵۳۸)

آج کے تجربات کی روشنی میں یہ الفاظ کس قدر الہامی ہیں۔

اسی تقریر میں انہوں نے مندرجہ ذیل عمدہ الفاظ کہے۔

"ہندوستان کے ۸ کروڑ مسلمان مادر ہندوستان کی آزادی کی خاطر دیگر مذاہب کے پیرو کاران کے ہمراہ دست بدست لڑنے کے لئے ہر مذہب کے افراد سے زیادہ رضامند بلکہ بے تاب ہیں۔"

(جناح از ایم ایچ سید، صفحہ ۵۳۷)

باب 23

کانگریس کی جانب سے جناح اور مسلم لیگ کی پیش رفت مسترد (۱۹۳۷ء)

انتخابات ۱۹۳۷ء کے اوائل میں ہونا قرار پائے تھے۔ کانگریس اور لیگ نے اپنی اپنی الگ انتخابی تنظیمیں بنائیں۔ جناح نے کہا۔

"ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ منظم ہونا چاہئے' ایک مرتبہ جب وہ منظم ہو گئے تو ایک دوسرے کو بہتر سمجھ پائیں گے اور پھر ہمیں باہمی تفہیم کے لئے برسوں انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔

(جناح از ایچ ایم ایس' صفحہ ۴۳۹)

یہ بہر طور اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ ابھی تک ہندو اور مسلمان "ٹوریز" اور "وہگز" کی طرح دو الگ سیاسی دھڑوں کی طرح ایک دوسرے کے مقابل نہ آئے تھے۔ مسلم لیگ واقعتاً ایک فرقہ وارانہ جماعت تھی جس کے ارکان صرف مسلمان تھے لیکن سب مسلمان بہر کیف مسلم لیگ سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ اسی طرح تمام ہندو بھی کانگریسی نہیں تھے۔ ان میں سے بیشتر لبرل تھے اور کسی بھی جماعت سے تعلق نہیں رکھتے ہیں اور یہ مہاتما اور ان کے حواریوں کی پالیسیوں سے شدید اختلاف رکھتے تھے۔ جناح کی انتخابی تقریروں میں کانگریس اور لیگ کے درمیان مفاہمت کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ ان پر اعتدال پسندی کا عنصر غالب تھا اور ان میں باہمی برداشت اور تفہیم کی درخواست کی گئی تھی۔ یہاں پر جناح کی انتخابی تقریروں کے کچھ اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں۔

"ہماری تحریک نفرت اور بغض پر مبنی نہیں ہے۔ ہماری تحریک ہر مذہب کو زیتون کی شاخ پیش کرتی ہے۔ ہم تعاون کے لئے رضامند ہیں۔ ہم کسی ایسے

گروپ یا گروپوں کے ساتھ متحد ہونے پر بھی تیار ہیں جن کے نظریات و مقاصد کم و بیش ہم جیسے ہوں"

"مسلم لیگ ہندوستانی عوام کے لئے مکمل قومی خود مختار حکومت کا مطالبہ کرتی ہے۔ ہندوؤں، مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے درمیان اتحاد اور آبرومندانہ معاہدہ وہ محور ہے جس پر ۳۸ کروڑ افراد کی اپنی حکومت (سیلف گورنمنٹ) تشکیل پا کر قائم رہ سکتی ہے۔"

(پاکستان از خالد بن سعید، صفحہ ۳۸)

"کانگریس اور مسلم لیگ کے نظریات میں کوئی فرق نہیں ہے (خصوصاً ہندوستان کی مکمل آزادی کا نظریہ (دونوں میں مشترک ہے) کوئی بھی خوددار ہندوستانی ایسا نہیں ہو سکتا جو غیر ملکی حکمرانی کی حمایت کرے یا اپنے ملک کے لئے خود مختار حکومت نہ چاہے۔"

(ایضاً)۔

جب انتخابی نتائج سامنے آئے تو معلوم ہوا کہ مسلم لیگ اور دیگر جماعتوں کے مقابلے میں کانگریس نے عظیم الشان کامیابی حاصل کی ہے۔ ۷ صوبوں میں تو اس نے واضح اکثریت حاصل کی صرف بنگال، سندھ اور پنجاب میں یہ اکثریت حاصل نہ کر سکی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ مسلم لیگ، مسلم اکثریت کے صوبوں پنجاب اور بنگال میں بھی کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ پنجاب میں مسلم نشستوں کی اکثریت مسلم لیگ کی بجائے سر سکندر حیات کی یونینسٹ پارٹی نے جیت لی۔ جب کہ بنگال میں بھی مسلم نشستوں کی اکثریت مسلم لیگ کی بجائے مولوی فضل الحق کی کرشک پرجا پارٹی نے حاصل کی۔ کل ۴۸۵ مسلم نشستوں میں سے لیگ محض ۱۰۸ حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکی۔ قوم پرست مسلمانوں نے کانگریس کے ٹکٹ پر ۵۸ مسلم نشستوں پر انتخاب لڑا اور ۲۶ جیت لیں۔ اس عظیم اور شاندار فتح نے بدقسمتی سے کانگریس پر نشے کا سا اثر کیا اور اس کا غرور و تکبر نکتہ عروج پر پہنچ گیا۔

انتخابات جیتنے کے بعد کانگریس کو فیصلہ کرنا تھا کہ وزارتیں قبول کرے یا نہیں کیونکہ صوبائی وساتیر گورنر کے مخصوص اختیارات سے بھرے ہوئے تھے۔ آل انڈیا کانگریس نے کمیٹی نے اس شرط پر وزارتیں قبول کرنے کی اجازت دی کہ صوبہ جات میں کانگریس کے رہنما گورنر سے یقین دہانی حاصل کریں کہ وہ اپنے خصوصی اختیارات استعمال نہیں کرے گا اور آئینی ذرائع سے کی گئی وزراء کی مشاورت مسترد نہیں کرے گا۔ گورنر نے جواب دیا کہ اس کے پاس ایسی ضمانت دینے کا کوئی اختیار نہیں۔ چنانچہ اولاً کانگریس نے وزارتیں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

ان حالات میں گورنر نے صوبائی مجالس قانون ساز میں وزارتیں بنانے کے لئے دوسری سب سے بڑی نمائندہ جماعت کو دعوت دی۔ اس طرح متعدد صوبوں میں غیر کانگریسی وزارتیں قائم ہو گئیں۔ لیکن بہت جلد کانگریس کو پچھتاوہ ہونے لگا اور وہ حصول طاقت کے لئے روز افزوں بے تابی کا مظاہرہ کرنے لگی۔ لیکن اپنے گزشتہ رویے کے پیش نظر اب کانگریس کو وزارتیں قبول کرنے سے پہلے کسی آبرومندانہ فارمولے کی ضرورت تھی۔ لیکن نئے وائسرائے لارڈ لن لتھ گو نے ایک نہایت چالاکی اور احتیاط سے تیار کی گئی دستاویز کے ذریعے کانگریس کو بچالیا' اس تحریر نے کانگریس کے لچکدار ضمیر کو خاطر خواہ سکون پہنچایا۔ اگرچہ اس میں کوئی بھی حتمی' واضح یا دو ٹوک ضمانت نہیں دی گئی۔ وائسرائے کے اس تحریری بیان کو گاندھی جی نے کانگریس کے لئے اکثریتی صوبوں کی مجالس قانون ساز میں حکومت سازی کے لئے کافی' شافی گردانا۔

جب کانگریس نے وزارتیں قبول کرنے کا فیصلہ کیا تو مسلم لیگ نے اس کے ساتھ مخلوط حکومت بنانے پر رضامندی ظاہر کی۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ انتخاب سے قبل کانگریس اور لیگ' ٹوریز اور وہگز' کی طرح مدمقابل بن کر سامنے نہیں آئی تھیں۔ چنانچہ لیگ اور کانگریس کو مخلوط وزارتیں بنانے میں کوئی امر مانع نہ تھا۔ لیکن غرور اور شاندار کامیابی کے نشے نے کانگریس کا دماغ خراب کر دیا اور اس نے نہ صرف حکومت بلکہ دیگر

جماعتوں کے تیئں بھی شاہانہ طرز عمل اختیار کر لیا۔ مسلم لیگ کو حقارت سے نظر انداز کرتے ہوئے کانگریس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا کہ ملک کے سیاسی ارتقاء میں صرف دو فریق ہیں ----- کانگریس اور انگریز۔ مسلم لیگ کے اس حقارت سے استرداد پر جناح نے فوری جواب دیا "ایک تیسری جماعت بھی ہے ----- مسلمانوں کی' انہوں نے انتباہ کیا' جسے نظر انداز کرنا کانگریس کے لئے خود خطرے اور تباہی کا باعث ہو سکتا ہے" انہوں نے کانگریس کو متنبہ اور خبردار کرنے کے ساتھ ساتھ درخواست کرتے ہوئے کہا۔

"ہم کسی کے احکامات قبول نہیں کریں گے۔ ہم کسی بھی ترقی پسند اور آزاد گروپ سے تعاون کرنے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ اس کا پروگرام اور پالیسی ہم سے مطابقت رکھتا ہو۔ ہم کسی بھی جماعت کے حاشیہ نشین نہیں بنیں گے۔ ہندوستان کی فلاح کے لئے ہم برابری کی سطح پر کام کے لئے تیار ہیں"

(جناح از ہیکٹر بولتھیو' صفحہ ۱۱۳)

لیکن نہرو' گاندھی اور کانگریس کی ہائی کمان نے نہایت تکبر سے جناح کی اس پیشکش "برابری کی سطح پر ہندوستان کی فلاح کے لئے کام کرنے کے لئے تیار ہیں" کو قابل اعتناء نہ سمجھا۔ انہوں نے مسلم لیگ کو یکسر نظر انداز کر دیا۔

یوپی میں انتخابات کے بعد کے واقعات سے پنڈت نہرو کی کوتاہ بینی کھل کر سامنے آتی ہے۔ یہاں لیگ اور کانگریس نے شانہ بشانہ انتخاب لڑا تھا۔ جمیعت العلمائے ہند ایک بارسوخ مسلم تنظیم تھی۔ جمیعت نے اس خیال پر کانگریس اور لیگ دونوں کی حمایت کی تھی کہ انتخابات کے بعد کانگریس اور لیگ ایک دوسرے سے تعاون کریں گی۔ یوپی میں مسلم لیگ کے (سرکردہ) رہنما چودھری خلیق الزمان اور نواب اسماعیل خاں تھے۔ مسلم لیگ نے صوبائی اسمبلی میں خاطر خواہ نشستیں حاصل کیں اس لئے وہ وزارتوں میں بھی معقول حصے کی امیدوار تھی۔ لیکن جب یوپی میں حکومت سازی کا مرحلہ آیا' پنڈت نہرو نے ان کا جائز حصہ دینے سے انکار کر دیا۔ نہرو کے اس اقدام کے متعلق مولانا آزاد اپنی کتاب "ہندوستان کا

حصول آزادی" میں لکھتے ہیں۔

"اگر یوپی میں لیگ کی تجویز تعاون منظور کر لی جاتی تو مسلم لیگ پارٹی تمام عملی مقاصد کے لئے کانگریس میں ضم ہو گئی ہوتی۔ جواہر لال کے اقدام سے یوپی میں مسلم لیگ کو حیات نو مل گئی۔ ہندوستانی سیاست کے تمام طالب علم جانتے ہیں کہ یوپی ہی سے لیگ کی دوبارہ تنظیم ہوئی۔ مسٹر جناح نے اس موقعے کا پورا پورا فائدہ اٹھایا اور ایسا جارحانہ طرز عمل اپنایا جو بالآخر پاکستان پر منتج ہوا۔" یوپی کے مذکورہ بالا واقعے پر نہرو کے سوانح نویس بیچر لکھتے ہیں۔

"انتخاب کے دوران دونوں جماعتوں نے کسی حد تک تعاون کیا' خصوصاً صوبہ جات متحدہ میں بین السطور ایسی تفہیم پیدا ہو گئی تھی کہ ایک مخلوط حکومت قائم کی جائے گی۔ لیکن یہ انتخاب سے پہلے کا واقعہ ہے جب کانگریس کو واضح اکثریت کی امید نہیں تھی۔ لیکن فیصلہ ہو جانے کے بعد مزید رعایتیں دینا ضروری نہیں تھا۔ اب مسلم لیگ کی جانب سے تعاون کی پیشکش کو حقارت کی نظر سے دیکھا گیا۔"

نہرو کی سوانح میں فرینک مورائیس کہتے ہیں۔

"اگر کانگریس نے انتخاب کے بعد مسلم لیگ کے ساتھ زیادہ ذہانت سے معاملہ کیا ہوتا تو پاکستان کبھی وجود میں نہ آتا۔ لیکن کانگریس نے اپنے کردہ اور ناکردہ گناہوں سے اسے ممکن بنا دیا۔ انتخابات میں مسلم لیگ کی ناقص کارکردگی سے غلط اندازے لگاتے ہوئے کانگریس نے مسلم لیگ کی تعاون کی پیش کش مسترد کر دی۔ نتیجتاً مسلم لیگ نہ صرف سیاسی انتہا پسندی پر اتر آئی بلکہ مسلمانوں کے حقوق اور دعوؤں کے اولین علمبردار کے طور پر جناح کے ہاتھ بھی مضبوط ہوئے"

انڈین سول سروس کے رکن اور بعد ازاں مرکزی ہندوستانی مجلس قانون ساز میں یورپی گروپ کے قائد' سر پرسی وال گرفتھس اپنی کتاب "ہندوستان پر برطانوی اثرات" میں لکھتے ہیں ۔

"۱۹۳۷ء میں گیند کانگریس کے لیڈروں کے قدموں میں تھا۔ یہ سچ ہے کہ بنگال' پنجاب

اور سندھ میں وہ اقتدار میں آنے کی امید نہیں کر سکتے تھے۔ جب کہ آسام میں مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان نازک سا توازن قائم ہو سکتا تھا۔ بحیثیت مجموعی کانگریس ہندوستان کی سب سے اہم سیاسی جماعت تھی۔ اگرچہ مسلمان کانگریس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے بے چینی محسوس کر رہے تھے لیکن انہوں نے کبھی سنجیدگی سے پاکستان کے مطالبے کے متعلق نہیں سوچا تھا۔ اپنی طاقت مستحکم کرنے کے لئے کانگریس پارٹی کو صرف یہ کرنا تھا کہ وہ مسلمانوں سے معاملات میں قدرے مفاہمانہ رویہ اپناتی۔

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کانگریس نے نافہمی کی فاش غلطی کی۔ ایسی کوئی بھی سنجیدہ اقتصادی یا سیاسی پالیسی نہیں تھی جس کے باعث کانگریس اور لیگ کی مخلوط حکومت غیر فطری یا ناقابل عمل ہوتی۔ مسلمانوں نے اس پر صحیح یا غلط یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ انہیں وزارتوں سے اس لئے محروم رکھا جا رہا ہے کہ کانگریس ایک خالص ہندو جماعت ہے۔ اس سے مسلمانوں میں غم و غصے کے جذبات پیدا ہوئے اور انہوں نے مسلم لیگ کو مستحکم کیا۔ اس سے یہ خطرہ بھی بڑھ گیا کہ ہندوستان میں سیاسی تقسیم مستقلاً فرقہ وارانہ خطوط پر ہو جائے گی"

ڈاکٹر راجندر پرشاد اپنی خود نوشت سوانح عمری) کے صفحہ ۴۴۶ پر کانگریس کی کاروائی کا جواز فراہم کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"حقیقتاً" اس وقت تک مسلم لیگ کو زیادہ توقیر اور مقبولیت حاصل نہیں تھی -----
چنانچہ کسی مسلم لیگی کو وزارت میں شامل کرنا کانگریس کے لئے بے جواز تھا"

ڈاکٹر راجندر پرشاد کے مطابق۔

"ایسے صوبوں میں جہاں کانگریس نے اکثریت حاصل کی تھی وہاں مسلم لیگیوں کا بطور وزیر تقرر غیر آئینی ہوتا۔" ڈاکٹر راجندر پرشاد نے یہ موقف اس نظریے پر اختیار کیا تھا جس پر برطانوی پارلیمانی حکومت قائم ہے۔ انگلستان میں ایک ہی پارٹی کی غیر مخلوط کابینہ بنائی جاتی ہے جو ایک ہی سیاسی اور اقتصادی پروگرام پر متفق ہو۔ لیکن ہندوستان میں اکثریتی اور

اقلیتی مذہبی گروپوں کی موجودگی کے باعث صورتحال مختلف تھی۔ یہاں اقلیتی مذہبی گروہوں کا اعتماد حاصل کرنا اہم ترین ضرورت تھی۔ ایک دور اندیش قیادت انہیں اقتدار اور اختیارات میں شریک کر کے یہ اعتماد جیت سکتی تھی۔ لیکن یہ ہندوستان کی بدنصیبی کہ اس نازک موقع پر کانگریس کی ہائی کمان اس ضروری سیاسی دانش سے بری طرح محروم تھی۔

کانگریس ہائی کمان کا قیام

نظری طور پر آل انڈیا کانگریس کمیٹی' پارٹی میں سب سے زیادہ اختیارات کی حامل تھی جسے سالانہ کانگریس کی صوبائی کمیٹیاں منتخب کرتی تھیں۔ لیکن عملی طور پر پارٹی کی پالیسی اور لائحہ عمل کو مختصر سی کانگریس ایگزیکٹو (مجلس عاملہ) کنٹرول کرتی تھی جسے ورکنگ کمیٹی کہا جاتا تھا۔ ۱۹۳۴ء سے گاندھی جی کی ہدایت پر کانگریس میں مرکزیت کو مضبوط کرنے کے لئے مزید اقدامات کیے گئے اور یہ فیصلہ ہوا کہ آئندہ سے ورکنگ کمیٹی کو منتخب نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کے ارکان کانگریس کے صدر کی جانب سے نامزد کیے جائیں گے۔ بعد ازاں کانگریس کا مرکزی پارلیمانی بورڈ تشکیل دیا گیا۔ یہ بورڈ رابطے کا ایک بے حد مفید اور ضروری ادارہ تھا جو مختلف صوبوں میں کانگریس کی وزارتوں کی سرگرمیوں میں ربط استوار کرنے کے علاوہ انہیں کانگریس کی بنیادی پالیسیوں کے مطابق عمومی ہدایات بھی جاری کرتا تھا۔ لیکن عملاً اس بورڈ نے خود کو عمومی رہنمائی تک محدود نہ رکھا بلکہ صوبائی وزارتوں پر نہایت کڑا کنٹرول بھی قائم کرلیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وقت کے ساتھ ساتھ کانگریس کے صوبائی وزیر' صوبائی مجالس قانون ساز اور ووٹروں کے تئیں اپنی ذمہ داریاں فراموش کرتے ہوئے محسوس ہونے لگے اور انہوں نے خود کو صرف غیر آئینی طاقتور مرکزی اتھارٹی کے سامنے جوابدہ تصور کرنا شروع کر دیا جسے اب کانگریس ہائی کمان کہا جاتا تھا۔

کانگریس ہائی کمان نے صوبائی خود مختاری اور ذمہ دار حکومت کے تصورات کو صوبوں میں محض ایک ڈھونگ بنا کر رکھ دیا جس سے صوبوں میں پارلیمانی حکومت کی صحتمند نشوونما کو شدید زک پہنچی' جس کی تلافی آج تک نہیں ہو سکی۔ مسلمانوں نے محسوس کیا کہ ہندو اکثریت کے صوبوں پر درحقیقت کانگریس ہائی کمان کی حکمرانی ہے اور غیر کانگریسی مسلمانوں کے مطالبات پر رتی بھر توجہ نہیں دی جا رہی۔ مسلمانوں میں یہ خیال جڑ پکڑنے

لگا کہ اگر انہیں اپنے لئے کوئی عہدہ' اختیار یا مراعات مطلوب ہوں تو ان کا حصول محض کانگریسی حلقوں سے ممکن ہے۔ اس سے مسلمانوں میں بے چینی کا احساس بڑھنے لگا۔

مسلم لیگ کے اجلاس کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے جناح نے کہا۔

"میں جیو اور جینے دو کی پالیسی کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ میں معاشی و سیاسی معاملات میں افہام و تفہیم کو بھی خوش آمدید کہتا ہوں۔ لیکن ہم کانگریس ہائی کمان کے فرمودات اور احکامات کے سامنے ہتھیار ڈالنے اور سر جھکانے پر تیار نہیں ہو سکتے جو (کانگریس ہائی کمان) اب چند سرکردہ سیاستدانوں کی آمریت کی شکل اختیار کر رہی ہے۔

(جناح از ایم ایچ ایس' صفحہ ۶۰۵)

کانگریس نے بے عقلی پر مبنی چند مزید اقدامات کیے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کانگریس کو انتظامی ذمہ داریاں نبھانے کا موقع ملا تھا اور مسلمان دیکھ رہے تھے کہ کانگریس اپنے قومی کردار کے دعووں پر کس حد تک پورا اترتی ہے۔ ان حالات میں کانگریس کے صاحبان اختیار کو مسلمانوں کے خدشات کے پیش نظر مزید محتاط رویہ اپنانا چاہیے تھا خصوصاً اس امر کے پیش نظر کہ قبل ازیں کانگریس مخلوط وزارتوں کے ضمن میں مسلم لیگ کا بڑھا ہوا دست تعاون جھٹک چکی تھی۔ لیکن افسوس کہ یہ افراد بصیرت سے محروم تھے اور مسلمانوں کو حقیقی اور فرضی شکایات کا موقع بدستور فراہم کرتے رہے۔ مسلمانوں نے شکایت کی کہ بعض مجالس قانون ساز میں کارروائی کا آغاز' بندے ماترم گانے سے ہوتا ہے اور جابجا گاندھی ودیا مندر قائم کر دیے گئے ہیں۔ بلا تخصیص رنگ و نسل قائم کیے جانے والے سکولوں کا نام مندر رکھنے سے مسلمانوں کے مذہبی جذبات خصوصاً مشتعل ہوئے کیونکہ لفظ مندر سے بت پرستی کی بو آتی تھی۔ کانگریس کے جھنڈے کو قومی پرچم جیسی توقیر دی جانے لگی۔ ان جذباتی مسائل کے علاوہ مسلمانوں کو یہ شکایت بھی تھی کہ انتظامی اور معاشی میدانوں میں ان سے امتیاز برتا جا رہا ہے اور ان کی زبان اردو کو دبایا جا رہا ہے۔ فروغ ہندی کے جوش و خروش میں کانگریس کی ہائی کمان نے ایک نئی زبان ایجاد کی جس کا

نام قومی و بین الصوبائی مقاصد کے لئے' ہندوستانی رکھا گیا۔ بہر کیف یو۔پی کے مسلمان اردو کو ترک کرنے کے لئے ہر گز تیار نہ تھے کیونکہ اردو ان کے نزدیک ہندوؤں اور مسلمانوں کے اعلیٰ طبقات کی مشترکہ کوششوں سے وجود میں آئی تھی۔ انہوں نے سرتیج بہادر سپرد کا حوالہ بھی دیا جنہوں نے کہا تھا کہ اردو نے ہندوؤں کو مسلم کلچر کو سمجھنے اور مسلمانوں کو ہندو کلچر کو سمجھنے کا موقع دینے جیسا عظیم مقصد پورا کیا ہے۔ اور اس طرح اس نے بھائی چارے اور مشترکہ شہریت کو فروغ دیا ہے۔

(پاکستان از خالد بن سعید' صفحہ ۹۴)

زبان ہی وہ سب سے بڑا مسئلہ تھی جس پر یوپی کے مسلمانوں نے کانگریس کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ کانگریس کی ہائی کمان آج تک ہندی یا ہندوستانی زبان کو عوام پر ان کی مرضی کے خلاف مسلط کرنے میں مضمر خطرے کو نہیں سمجھ سکی۔ بدقسمتی سے گاندھی جی خود بھی مسلمانوں کی بے چینی کے پس پردہ نفسیات کو سمجھنے میں ناکام رہے۔ وہ خود بھی بار بار ہندوستان میں "رام راج" کا تذکرہ کر کے جلتی پر تیل چھڑکتے رہے۔ اگرچہ گاندھی جی نے یہ وضاحت بھی کی کہ رام راج سے ان کی مراد ایک ایسی مکمل فلاحی ریاست ہے جہاں ہر کوئی خوش ہو لیکن ان کی یہ وضاحت بھی معاملات کو سدھار نہیں سکی اور مسلمانوں کے ذہن میں یہ شبہات پرورش پاتے رہے کہ گاندھی جی اور کانگریس ہندوستان میں ہندو راج اور ہندو کلچر کے تسلط کی سازش کر رہے ہیں۔ جناح نے اس صورتحال کا اپنے مفاد میں بھرپور فائدہ اٹھایا اور گاندھی جی اور کانگریس کے خلاف (مسلمانوں کے) فرقہ وارانہ جذبات کو بھڑکایا صحیح یا غلط' غیر کانگریسی مسلمان اجتماعی طور پر کانگریس کے طرز حکومت سے متنفر ہو گئے۔ مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ منعقدہ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں غیر لیگی مسلمانوں کی موجودگی ان کی بے چینی کو بھی ظاہر کر رہی تھی۔ جناح نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا۔

"اس قدر معمولی طاقت اور اختیارات ملنے پر ہی اکثریتی فرقے نے ثابت کر دیا

ہے کہ ہندوستان ہندوؤں کا ہے۔ کانگریس صرف اس ڈھونگ کا مظاہرہ قوم پرستی کے نام پر کر رہی ہے جب کہ ہندو مہاسبھا الفاظ کا یہ کھیل نہیں کھیلتی۔ میں یہ کہنے کی ہمت رکھتا ہوں کہ کانگریس کی موجودہ پالیسی کا نتیجہ طبقاتی تلخی، فرقہ وارانہ تصادم اور استعمار کی طاقت میں اضافہ ہی ہو گا۔

(جناح از ایم ایچ ایس، صفحات ۷۷-۵۷۶)

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس وقت تک مسلم اکثریت کے صوبوں پنجاب اور بنگال میں مسلم لیگ کا اثر و رسوخ بالکل برائے نام تھا۔ ان دونوں صوبوں کے وزرائے اعظم سر سکندر حیات خان اور مولوی فضل الحق تھے۔ ان میں سے کسی کا تعلق بھی مسلم لیگ سے نہیں تھا۔ لیکن وہ بھی کانگریس کی ہائی کمان کی ذہنیت سے خوفزدہ تھے اور انہیں محسوس ہونے لگا تھا کہ اگر مسلمانوں نے خود کو ایک وحدت میں منظم نہ کیا تو انہیں اپنے وجود کا احساس تک دلانا مشکل ہو جائے گا۔ یہ گاندھی جی اور کانگریس ہائی کمان کی پالیسی کی شدید ناکامی تھی۔ المیہ یہ تھا کہ کانگریس ہائی کمان نے نوشتہ دیوار نہیں پڑھا۔ اس وقت تک مسلم لیگ کی مضبوطی محض مسلم اقلیتی صوبوں تک محدود تھی۔ اب ہندوستان بھر میں مسلمان خوفزدہ ہو گئے مسلمانوں کی جذباتی شدت کے ساتھ ساتھ جناح کی طاقت بڑھنے لگی۔

جناح اب ذہن بنا چکے تھے اور پورے ہندوستان پر کانگریس کی بالادستی کو مستحکم ہونے سے روکنے کے لیے کوئی انتہائی اقدام اٹھانے والے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مسلم اقلیت کو ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر ہرگز نہیں چھوڑنا چاہیے جو خود بھی گاندھی جی اور کانگریس ہائی کمان کے کڑے شکنجے میں جکڑی ہوئی تھی۔ اب انہوں نے اپنے دو قومی نظریے کو حتمی شکل دینی شروع کی جو کچھ عرصے سے ان کے ذہن میں پرورش پا رہا تھا۔ مارچ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں انہوں نے اعلان کر دیا۔

"صحیح معنوں میں اسلام اور ہندومت محض مذہب نہیں بلکہ در حقیقت یہ بالکل فرق اور الگ الگ سماجی نظام ہیں اور یہ صرف ایک خواب ہے کہ ہندو اور مسلمان بھی ایک مشترکہ قوم میں ڈھل سکتے ہیں۔ اور ایک ہندوستانی قوم کا یہ غلط تصور اپنی حدود سے بے حد متجاوز ہو چکا ہے اور ہماری متعدد مشکلات کا باعث ہے۔ اگر ہم نے اپنے خیالات پر بروقت نظر ثانی نہ کی تو یہ ہندوستان کو تباہی کی طرف دھکیل دے گا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا تعلق دو یکسر علیحدہ مذہبی فلسفوں، سماجی رسومات اور ادب سے ہے۔ ان کا اور ہمارا طرز حیات قطعی طور پر مختلف ہے۔"

(مہاتما از تندولکر، صفحہ ۲۶۸، جلد ۵)

مارچ ۱۹۴۰ء میں جناح کے مندرجہ بالا خیالات نے اس قرارداد کی شکل اختیار کر لی جو مسلم لیگ کے اجلاس لاہور میں منظور کی گئی۔

"آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس کا یہ طے شدہ نقطہ نظر ہے کہ اس ملک میں کوئی آئین اس وقت تک قابل عمل اور مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہیں ہو گا جب تک اسے ان بنیادی اصولوں پر استوار نہ کیا جائے۔ جغرافیائی طور پر متصل ان وفاقی اکائیوں کو ایسے (الگ) خطوں کی شکل دی جائے جن میں مسلمان عددی اکثریت میں ہیں جیسے شمالی مغربی اور ہندوستان کے مشرقی علاقے انہیں اس طرح یکجا کیا جائے کہ وہ "آزاد ریاستیں" بن جائیں جن میں اکائیوں کو خود مختاری اور آزادی حاصل ہو گی۔ اس مقصد کے لئے علاقائی حد بندیوں میں جس طرح کے ردو بدل کی ضرورت ہے وہ کی جائے"

(ایضاً)۔

جناح اب جنگ کے راستے پر چل نکلے تھے۔ کانگریس اور گاندھی سے شدید نفرت نے ان کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ پٹنہ میں ہونے والے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں انہوں نے ببانگ دہل کہا تھا کہ انہیں یہ کہتے ہوئے ہر گز کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ کانگریس کے اس رویے کے پس پردہ کام کرنے والا دماغ موہن داس کرم چند گاندھی کے سوا اور

کسی کا نہیں جو ان تمام آدرشوں کو تباہ کرنا چاہتا ہے جن کے ساتھ کانگریس کا آغاز ہوا تھا۔ انہوں نے مزید کہا ----- گاندھی وہ واحد ذمہ دار شخص ہے جس نے کانگریس کو ہندوستان میں ہندومت کے احیاء اور رام راج کے قیام کے لئے آلہ کار بنا کر استعمال کیا اور وہ کانگریس کو اسی مقصد کے حصول کے لئے استعمال کر رہا ہے"

(جناح از ایم ایچ ایس، صفحہ ۲۶۶)

قرارداد لاہور ۱۹۴۰ء کی منظوری کے ساتھ ہی پرانے قوم پرست جناح، انڈین نیشنل کانگریس کے عظیم محافظ اور سفیر ہندو مسلم اتحاد نے اپنی زندگی کا ایک نیا المناک دور شروع کیا۔ یہ نیا جناح ہندوستان اور ہندوستانی مسلمانوں کے لئے نہایت خطرناک ثابت ہوا۔ یہ غالباً ہندوستانی تاریخ کے المناک ترین واقعات میں سے ایک تھا۔

باب نمبر 24

جنگ عظیم دوم کا آغاز اور ہندوستانی سیاست پر اس کے اثرات (۱۹۴۱ء-۱۹۳۹ء)۔

ہٹلر اور نازی ازم کے ابھرنے کے بعد یورپ میں جنگ ناگزیر تھی۔ معاہدہ میونخ ۱۹۳۸ء کے ذریعے برطانوی وزیراعظم نیوائل چیمبرلین اور فرانسیسی سیاستدانوں نے عارضی امن کا انتظام کیا لیکن نازیوں کی جارحیت بدستور جاری رہی اور معاہدہ میونخ کے ایک برس کے اندر ہی حالات نے حکومت برطانیہ کو اس قدر مجبور کر دیا کہ اس نے ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اسی روز وائسرائے کے اعلان نامے کے تحت ہندوستان کو بھی متحارب ملک قرار دے دیا گیا۔ اس کے فوراً بعد وائسرائے لن لتھ گو نے گاندھی جی، جناح اور چیمبر آف پرنسز کے چانسلر کو ملاقات کے لئے شملہ مدعو کیا۔ گاندھی جی نے اس کا فوری عملی جواب دیا اور پہلی دستیاب ٹرین سے شملہ روانہ ہو گئے۔ انہوں نے اپنے اولین رد عمل کو اپنے ہی لفظوں میں یوں بیان کیا ہے۔

"جب میں ان (وائسرائے) کے سامنے دارالعوام، ویسٹ منسٹر ایبے اور ان کی ممکنہ تباہی کی تصویر کشی کر رہا تھا، میں رو پڑا، میں سخت افسردہ ہو گیا میں اس وقت ہندوستان کی آزادی کے متعلق نہیں سوچ رہا تھا۔ وہ ضرور حاصل ہو گی لیکن اگر وہ انگلینڈ اور فرانس کے زوال کے نتیجے میں ملے تو کس کام کی اور اگر وہ جرمنی کے مقابلے میں فتح یاب ہوں تو بھی تباہ شدہ اور کمزور ہوں گے۔

"انگلینڈ اور فرانس سے میری ہمدردی کسی وقتی جذباتیت یا بھونڈے الفاظ میں ہسٹریا کا نتیجہ نہیں ہے-----"

(تندولکر، جلد ۵، صفحات ۱۴۶، ۱۴۰)

انگلستان اور فرانس سے اپنی ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے گاندھی جی نے وائسرائے پر واضح کیا کہ وہ ذاتی حیثیت میں اس سے ملنے آئے ہیں اور اس ضمن میں انہیں ورکنگ کمیٹی کی ہدایات یا اشیرباد حاصل نہیں۔ انہوں نے وائسرائے کو بتایا کہ اگر اس معاملے (جنگ میں شمولیت) پر کوئی افہام و تفہیم ہوئی تو وہ کانگریس ورکنگ کمیٹی اور حکومت کے مابین ہو گی۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس واردھا میں ہوا تاکہ وائسرائے کے اعلان سے پیدا ہونے والی صورتحال پر غور کیا جا سکے جس کے تحت ہندوستان کو بھی لڑائی میں فریق قرار دیا گیا تھا۔ کئی روز جاری رہنے والے گہرے غور و خوض کے بعد ۱۵ ستمبر ۱۹۳۹ء کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے مندرجہ ذیل قرارداد منظور کی۔

"ورکنگ کمیٹی نے یورپ میں اعلان جنگ سے پیدا ہونے والے سنگین بحران پر گہرا غور و فکر کیا ہے ----- چونکہ حکومت برطانیہ نے ہندوستان کو بھی متحارب ملک قرار دے دیا ہے ----- ہندوستانی عوام کی رضامندی کے بغیر ----- ورکنگ کمیٹی کو اس پیش رفت کو نہایت سنجیدگی سے لینا چاہئے۔

"کانگریس نے بارہا فسطائیت اور نازی ازم کے نظریات و عمل پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے

۔ ورکنگ کمیٹی بلا ہچکچاہٹ جرمنی کی نازی حکومت کی پولینڈ کے خلاف تازہ ترین جارحیت کی مذمت کرتی ہے اور اس کے خلاف مزاحمت کرنے والوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتی ہے۔ ----- لیکن ہندوستان خود کو کسی ایسی جنگ سے وابستہ نہیں کر سکتا جو جمہوری آزادی کے نام پر لڑی جا رہی ہے جب کہ ہندوستان کو خود اس آزادی سے محروم رکھا گیا ہے اور جو محدود سی آزادی اس کے پاس ہے وہ بھی اس سے چھین لی گئی ہے۔

"جس بحران نے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے ----- وہ دنیا بھر میں اچھی اور بری تبدیلیوں کا باعث بن سکتا ہے یہ تبدیلیاں سیاسی، سماجی اور اقتصادی ہو سکتی ہیں۔ یہ بحران ان معاشرتی اور سیاسی آویزشوں اور تضادات کا

ناگزیر نتیجہ ہے جو گزشتہ جنگ عظیم کے بعد خطرناک حد تک بڑھ گئے ہیں اور یہ اس وقت تک حل نہیں ہو گا جب تک کہ یہ آویزشیں اور تضادات دور نہ کیے جائیں اور ایک نیا توازن قائم نہ کیا جائے۔ یہ توازن صرف اس صورت میں قائم ہو سکتا ہے جب ایک ملک کی دوسرے پر بالادستی اور استحصال ختم ہو ----- نیا نظام (آرڈر) صرف اس اساس پر تعمیر ہو سکتا ہے۔ اس نئے ورلڈ آرڈر کے لئے جدوجہد میں کمیٹی ہر قسم کے تعاون کے لیے خواہاں اور مدد کے لیے تیار ہے۔ لیکن یہ کمیٹی کسی ایسی جنگ سے وابستہ نہیں ہو سکتی اور نہ تعاون کر سکتی ہے جو استعماری خطوط پر لڑی جا رہی ہے اور جس کا مقصد اسی استعمار (امپیریلزم) کو ہندوستان اور دیگر علاقوں میں مستحکم کرنا ہے۔

"چنانچہ ورکنگ کمیٹی برطانوی حکومت کو دعوت دیتی ہے کہ وہ واضح اور دو ٹوک الفاظ میں واضح وضاحت کرے کہ جمہوریت' امپریلزم اور نیو آرڈر کے حوالے سے اس کے مقاصد کیا ہیں اور خصوصاً اُن کا ہندوستان پر اطلاق کس طرح ہو گا اور حال میں ان کا نفاذ کیسے کیا جائے گا ----- کسی بھی اعلان نامے کی حقیقی جانچ زمانہ حال میں اس کے عملی اطلاق سے ہوتی ہے کیونکہ یہ حال ہی ہے جو آج کے عمل پر قادر ہے اور مستقبل کو شکل عطا کرے گا۔

"کمیٹی پوری شدت اور تہہ دل سے ہندوستانی عوام سے اپیل کرتی ہے کہ وہ اندرونی کشمکشوں اور تضادات کو ختم کر دیں اور تکلیف کے اس کڑے وقت میں ایک متحد قوم بن جائیں اور وسیع تر آزادی عالم میں ہندوستان کی آزادی کے حصول کے لئے اپنے مقصد اور عزم کے لئے کمربستہ ہو جائیں"

ورکنگ کمیٹی کے اندر گاندھی جی نے سرکار برطانیہ کی غیر مشروط حمایت کے لئے تنہا جنگ لڑی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے مندرجہ بالا قرارداد پر گاندھی جی نے کچھ یوں تبصرہ

کیا۔

"عالمی بحران پر ورکنگ کمیٹی کے بیان کو حتمی شکل اختیار کرنے میں چار روز لگے۔ ہر رکن نے اس خاکے پر اپنی رائے کا آزادانہ اظہار کیا جسے کمیٹی کی دعوت پر پنڈت جواہر لال نہرو نے تیار کیا تھا۔ مجھے خود کو برطانوی حکومت کی غیر مشروط حمایت کے معاملے پر خود کو تنہا پا کر بے حد رنج پہنچا۔

(تندولکر، جلد ۵، صفحہ ۱۶۶)

بعد ازاں مسلم لیگ نے بھی جنگ پر اپنی قرارداد منظور کی۔ اس میں اتحادیوں کے ساتھ گہری ہمدردی کا اظہار کیا گیا تھا اور کانگریسی قرارداد کے برعکس اس میں حکومت سے یہ یقین دہانی طلب کی گئی تھی کہ ہندوستان میں دستوری پیش رفت سے متعلق کوئی اعلان نامہ جاری نہ کیا جائے اور نہ مسلم لیگ کی رضامندی اور منظوری کے بغیر کوئی آئین تیار کیا جائے۔

دریں اثناء کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اپنی قراردادمیں حکومت کے رویے پر بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی وزارتوں کو مستعفی ہونے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۳۹ء کے اواخر میں وہ سب مستعفی ہو گئیں۔ جب کانگریسی وزارتوں کے استعفیٰ کی خبر جناح کو پہنچی تو انہوں نے مسلمانوں سے آئندہ ۲۲ دسمبر کو یوم نجات و تشکر' منانے کے لئے کہا تا کہ وہ کانگریسی استبداد کے خاتمے پر اپنی راحت کا اظہار کر سکیں۔ کانگریسی وزارتوں کے استعفیٰ سے وائسرائے کا رویہ کانگریس کے تئیں تبدیل ہو گیا کیونکہ کانگریسی وزارتوں کے استعفے کے بعد صوبوں میں تمام اختیارات گورنروں کے کنٹرول میں چلے گئے اور عسکری کارروائیوں کے لیے اب وائسرائے کو کانگریس کی تائید کی کوئی ضرورت نہ رہی تھی۔ جناح نے اس موقعے کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور مسلم لیگ کو (برطانوی حکومت سے) بھرپور تعاون اور حمایت کی حامی بھرنے پر آمادہ کیا۔ جنگی کارروائیوں کے ضمن میں یہ یقین دہانی مسلمانان ہند کی جانب سے اس شرط پر کی گئی کہ ان کے مطالبات پورے کیے جائیں

گے۔ جناح کے نام ۲۳ دسمبر ۱۹۳۹ء کو لکھے گئے ایک خط میں وائسرائے نے لیگ کو مطلوبہ یقین دہانی کروادی۔ "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ تاجدار برطانیہ کی حکومت مسلم فرقے کے اطمینان کی اہمیت سے متعلق کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہے۔" چنانچہ وائسرائے اور حکومت برطانیہ نے کانگریس کو نظرانداز کر کے جناح اور مسلم لیگ کو زیادہ اہمیت دینی شروع کردی "کانگریس کی راہ غیر متعین ہونے اور جناح کے ہاتھ خاطرخواہ مضبوط ہونے سے نیمے دروں نیمے بروں (ڈھلمل یقین) رویہ رکھنے والے مسلمان تیزی سے لیگ میں شامل ہونے لگے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اکتوبر ۱۹۳۹ء میں جب وائسرائے بمبئی میں تھا تو لبرلز' شیڈولڈ کاسٹوں (نیچ ذات ہندوؤں)' ہندو مہاسبھا اور پارسیوں نے ایک مشترکہ احتجاجی جلوس نکالا اور وائسرائے کو ایک مشترکہ عرضداشت پیش کی جس میں اس کی توجہ کانگریس اور مسلم لیگ کے علاوہ دیگر جماعتوں کی جانب مبذول کروائی گئی تھی۔ ان جماعتوں کی نمائندگی علی الترتیب سر چمن لال سیٹلواڈ' ڈاکٹر امبیڈکر' وی ڈی ساورکر اور سر کاؤس جی جہانگیر نے کی۔ وہ کانگریس کے بالادست رویے سے نالاں تھے۔ وہ خصوصاً اس نکتے پر زور دے رہے تھے کہ اگر کانگریس کے اس دعویٰ کو تسلیم کرلیا جائے کہ وہ ملک کی واحد جماعت ہے تو یہ جمہوریت کے لئے بہت بڑا دھچکہ ہوگا۔

اگرچہ وائسرائے کے ساتھ پہلے مذاکرات میں جو جنگ چھڑنے کے فوراً بعد ہوئے گاندھی جی نے انگلستان اور اس کے اتحادیوں کے لئے گہری جذباتی وابستگی کا اظہار کیا تھا اور انہیں غیر مشروط حمایت کی پیشکش کی تھی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کے رویے میں تبدیلی آگئی۔ بعد میں انہوں نے وضاحت کی کہ غیر مشروط حمایت کا مفہوم خالصتاً عدم تشدد کی بنیاد پر اخلاقی تائید کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ان کے رویے میں یہ تختی کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس پٹنہ منعقدہ ۲۸ فروری ۱۹۴۰ء کو نمایاں طور پر ظاہر ہوئی۔ یہ اجلاس اس پالیسی قرارداد کا خاکہ تیار کرنے کے لئے بلایا گیا تھا جسے کانگریس کے آئندہ

اجلاس رام گڑھ میں پیش کیا جانا تھا۔ اس کانگریس کے صدر مولانا ابو الکلام آزاد تھے۔ یہ قرارداد ہندوستان میں برطانوی راج پر کڑی نکتہ چینی سے شروع ہوئی اور اس میں مکمل آزادی کا مطالبہ کیا گیا۔ اس میں کسی ایسی جنگ میں شرکت سے معذوری ظاہر کی گئی تھی جو استعماری مقاصد کے حصول کی خاطر لڑی جا رہی ہو۔ آخر میں اس میں دھمکی دی گئی کہ کانگریس وزارتوں سے استعفیٰ کے منطقی نتیجے کے طور پر سول نافرمانی کی تحریک دوبارہ شروع کر دے گی۔

غیر کانگریسی حلقوں نے ہندوستان بھر میں قرارداد رام گڑھ کی منظوری پر افسوس کا اظہار کیا۔ لبرل رہنماؤں نے اسے قومی و بین الاقوامی صورتحال سے مکمل لاتعلقی پر مبنی قرار دے کر نکتہ چینی کی۔ جناح نے اس قرارداد کو سیاسی فہم و دانش سے یکسر محروم قرار دیا۔ انگلستان اس وقت حیات و موت کی صورتحال سے دوچار تھا۔ اس نازک موقعے پر جناح نے انگلستان کو تعاون کی پیشکش کی جب کہ گاندھی جی پہلے تو بہت پیچھے تھے لیکن بعد میں سول نافرمانی کی دھمکیاں دینے لگے۔

رام گڑھ کی قرارداد کی منظوری کے بعد یہ ایک فطری امر تھا کہ سول نافرمانی کی دھمکیاں دینے پر وائسرائے اور سرکار برطانیہ نے کانگریس سے منہ پھیر لیا اور ہر ممکن طریقے سے جناح اور مسلم لیگ کی حوصلہ افزائی کی۔ لیگ کو واضح یقین دہانی کروائی گئی کہ اس کے نقطہ نظر کا ہمیشہ احترام کیا جائے گا۔

کانگریس کے اجلاس رام گڑھ کے فوراً ہی بعد اتحادیوں کے لئے جنگ کی صورتحال بے حد بگڑ گئی۔ جرمنی کی فوج نے ہالینڈ اور بلجیئم پر قبضہ کر لیا اور فرانس کی مزاحمت بھی ٹوٹ گئی۔ خود ڈنکرک کے مقام پر برطانیہ کی تیز رفتار فوج کو شکست فاش ہوئی اور اب انگلستان پر جرمنی کا حملہ یقینی تھا۔ نئی صورتحال پر غور کرنے کے لئے کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس دہلی میں ہوا۔ اس لمحے گاندھی جی کے دماغ میں خیالات کی نئی رو آئی اور اہنسا' اور "عدم تشدد" جیسے خیالات نے ان پر غلبہ حاصل کر لیا" اس نے مجھے حتی

الامکان عدم تشدد سے بھر دیا ہے' انہوں نے کہا میرے خیال میں برطانیہ اور شکست خوردہ اقوام کو عدم تشدد سے بہتر کوئی چیز پیش نہیں کی جا سکتی" (تندولکر' جلد ۵) اپنے معروف خط ہر برطانوی کے نام میں انہوں نے لکھا۔

"میں ہر برطانوی سے درخواست کرتا ہوں ---- وہ بین الاقوامی تعلقات کو بحال کرنے کے لئے جنگ کی بجائے عدم تشدد کا راستہ اپنائیں۔

"میں آپ کو ایک شریفانہ اور جراتمندانہ راستہ پیش کرتا ہوں جو بہادر ترین سپاہیوں کے قابل ہے۔ میں آپ سے چاہوں گا کہ آپ نازی ازم کا مقابلہ اسلحے کے بغیر کریں اور اگر میں فوجی اصطلاح استعمال کروں تو آپ کو نازی ازم کے خلاف عدم تشدد کے ہتھیاروں سے لڑنا چاہیے۔

"آپ ہٹلر اور مسولینی کو دعوت دیں گے کہ وہ آپ کے ملک سے جنہیں آپ اپنی ملکیت کہتے ہیں جو چاہیں لے جائیں۔ آپ انہیں اپنے خوبصورت جزائر پر خوبصورت عمارتوں سمیت قبضہ کرنے کی اجازت دے دیں۔ آپ انہیں اپنا سب کچھ دے دیں کے لیکن اپنی روحیں اور ذہن نہیں۔ اگر یہ حضرات آپ کے گھروں پر قبضہ کرنا چاہیں تو آپ انہیں خالی کر دیں گے۔ اگر وہ آپ کو آزادانہ گزرنے کا راستہ نہ دیں تو آپ انہیں خود کو مردوں' عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے کی اجازت دے دیں گے لیکن آپ ان کی وفاداری سے انکار کر دیں گے۔

(کانگریس کی تاریخ از پتہ بھائی سیتہ رمیا' جلد دوم' صفحہ ۲۱۸)

اس غیر ارضی بیان پر کوئی بھی تبصرہ غیر ضروری ہے تاہم موازنے کے لئے نئے برطانوی وزیراعظم ونسٹن چرچل کا بلند بانگ اعلان قابل ذکر ہے۔

"ہم اپنے جزائر کا دفاع کریں گے' خواہ اس کی کوئی بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔ ہم ساحلوں پر لڑیں گے' ہم خشکی پر لڑیں گے' ہم کھیتوں میں اور گلیوں میں لڑیں گے' ہم پہاڑوں پر لڑیں گے' ہم کبھی ہتھیار نہیں ڈالیں گے"

چرچل کی اس ''ہتھیار نہیں ڈالیں گے'' تقریر نے برطانوی عوام کے دلوں میں مزاحمت کا ایک ناقابل تسخیر جذبہ جگا دیا اور انہوں نے جرمنی کی جارحیت کی تند رو موج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور بالآخر ہٹلر اور نازی ازم کو تباہ کر دیا۔ جب کہ گاندھی جی کا دماغ بھی ابھی خیالات پر قائم تھا جن کا اظہار انہوں نے اپنے خط ''ہر برطانوی کے نام'' میں کیا تھا۔ اہنسا اور عدم تشدد کے بہت سے خیالات نے ان کے ذہن میں ادھم مچانا شروع کر دیا (ملاحظہ فرمایئے کانگریس کی تاریخ از پٹہ بھائی صفحات ۹۲۔ ۱۹۱)

''یکلخت انہوں نے ایک نئی روشنی دیکھی' کانگریس کی تمام تر سابق تاریخ ان کی نظر سے یوں محو ہو گئی گویا یہ صبح کی دھند تھی جسے ابھرتے ہوئے سورج نے ختم کر ڈالا۔ ایک کشمکش اب زیادہ واضح صورت میں حتمی طور پر پہلے سے کہیں زیادہ وجود میں آچکی تھی۔ گاندھی اپنے اب تک بیان کردہ نظریات کے مطابق ''جو اس دور کے تسلیم شدہ روایتی خیالات سے اس قدر دور از کار تھے' اس دور کے قائد کیسے بن سکتے تھے''؟

''اگر افغان آتے ہیں تو ہمیں ان کے سامنے مر جانا چاہیے۔ حتیٰ کہ اگر آج میرے پاس پورا ہندوستان بھی ہوتا تو میں یہی کرتا۔ میں فوج نہیں چاہتا۔ بالکل اسی طرح ڈاکوؤں کے متعلق بھی میرا یہی خیال ہے۔ یہ ہوگی وہ ریاست جس کا کانگریس اقتدار سنبھالے گی ---- وہ محسوس کرتے تھے کہ وقت آگیا کہ عدم تشدد خود کو مستحکم کرے۔''

''اگر کانگریس طاقت کے استعمال سے گریز نہیں کر سکتی تو کانگریس کو اس وقت تک اقتدار طلب نہیں کرنا چاہیے۔ جب تک کہ وہ عوام پر غیر متشدد کنٹرول حاصل نہیں کرتی ---- عدم تشدد کو ترک کرنے سے ورکنگ کمیٹی ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کی مرتکب ہو گی۔ اسے واضح کرنا ہو گا کہ ہندوستان قوم کو غیر ملکی حملوں کے خلاف مزاحمت کے لئے ترک اسلحہ کی جانب سے لے جائے گا اور غیر متشدد افراد پر مشتمل ایک ایسی کھیپ تیار کی جائے گی جو جارح کے خلاف ایک زندہ دیوار بن جائیں گے۔ اس کے لئے کانگریس کو اپنے مشکوک ارکان کی تطہیر کرنی ہو گی بلکہ ترجیحاً ایسے ارکان کو رضاکارانہ ریٹائرمنٹ

اختیار کر لینی چاہئے جو عدم تشدد پر ایمان نہیں رکھتے"

آخری پیرا گراف میں بیان کردہ خیالات کا واضح مفہوم یہی ہے کہ تمام غیر گاندھی ارکان کو کانگریس سے نکال باہر کیا جائے اور اسے صرف ان کھدر پوش ارکان پر مشتمل ہونا چاہئے جن کی برین واشنگ ہو چکی ہو اور وہ ملک کے طول و عرض میں گاندھی ازم کا پرچار کریں۔ ملک میں گاندھی ازم کے علاوہ اور کوئی سیاست نہیں ہونی چاہئے۔

ورکنگ کمیٹی اسی وقت شدید کشمکش میں مبتلا تھی کیونکہ اس کے سرکردہ ارکان گاندھی جی کے خیالات پر عمل درآمد کے متعلق شکوک و شبہات میں مبتلا تھے۔ بالآخر کمیٹی نے مندرجہ ذیل قرارداد منظور کی۔

"وہ تسلیم کرتے ہیں کہ مہاتما گاندھی کو اپنے عظیم آدرشوں پر اپنے انداز میں عمل کرنے کی آزادی ہونی چاہئے چنانچہ انہیں کانگریس کے اس پروگرام اور سرگرمیوں کی ذمہ داری سے مستثنیٰ رہنا چاہئے جس پر وہ ہندوستان اور پوری دنیا کی موجودہ صورتحال' بیرونی جارحیت اور اندرونی شورشوں کے تناظر میں عمل کرنا چاہتی ہے۔"

(پی۔ سیتا رمیا صفحات ۱۹۳-۱۹۲' جلد دوم)۔

گاندھی جی کو کانگریس کے سیاسی پروگرام سے بری الذمہ کرنے کے بعد ورکنگ کمیٹی کا ایک ہنگامی اجلاس دہلی میں ۳ سے ۷ جولائی تک منعقد ہوا جس میں خطرناک صورتحال کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا گیا۔ حکومت کے ساتھ مفاہمت کے اظہار کے لئے ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں حکومت کو ملکی دفاع کے لئے ایک موثر تنظیم کے قیام کی خاطر بھرپور تعاون کی یقین دہانی کروائی گئی تھی بشرطیکہ ہندوستان کی مکمل آزادی کے فوری اعلان کے ساتھ ہی مرکز میں ایک عبوری قومی حکومت قائم کی جائے۔ اس قرارداد کے حقیقی مصنف چکرورتی راج گوپال اچاریہ تھے۔ جولائی کے اختتام تک آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس پونا میں ہوا جہاں اسی قرارداد کی رسمی منظوری دی گئی اسے ہی کانگریس کی

جانب سے "پونا پیشکش" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا پونا پیشکش کے جواب میں وائسرائے نے ٹوری وزیر خارجہ برائے امور ہند آمرے کی ہدایت پر حکومت برطانیہ کے ایماء پر ۸ اگست کو ایک اعلان کیا جسے "اگست پیشکش" کہا جاتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اس پیشکش میں ایک اعلان نامہ شامل تھا۔

"حکومت برطانیہ امن اور فلاح ہند کے لئے اپنی ذمہ داریاں کسی ایسے نظام حکومت کو منتقل نہیں کر سکتی جس کے اختیارات کی ہندوستان کی قومی زندگی کے زیادہ اور طاقتور عناصر نفی کر رہے ہیں نہ ہی حکومت برطانیہ ایسے کسی نظام میں فریق بن سکتی ہے جو ان عناصر کو طاقت کے بل بوتے پر اپنا حامی بنائے۔

(مہاتما از تندولکر' جلد ۵' صفحہ ۳۱۷)

یہ بھی بہت بڑی بدقسمتی تھی کہ کانگریس کے مفاہمانہ رویے کا اس قدر غیر دانشمندانہ جواب دیا گیا اور فطری طور پر کانگریس نے محسوس کیا کہ اسے بری طرح ٹھکرایا گیا ہے چنانچہ ورکنگ کمیٹی نے فوری اجلاس منعقد کیا اور بیان دیا کہ۔

"کانگریس کی تجاویز کا مسترد ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ حکومت برطانیہ نے ہندوستان پر بزور شمشیر قبضہ جاری رکھنے کا پختہ ارادہ کر رکھا ہے"

(مہاتما از تندولکر' جلد ۵' صفحہ ۳۱۸)

۱۵ ستمبر کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس بمبئی میں ہوا جس کی صدارت کرتے ہوئے مولانا آزاد نے کہا۔ "وائسرائے کے ذریعے برطانیہ نے جو پیشکش کی ہے وہ قطعاً قابل توجہ نہیں ہے۔ ان واقعات نے ہمیں یہ فیصلہ کرنے کے قابل کر دیا ہے کہ ہم دوبارہ مہاتما گاندھی سے درخواست کریں کہ وہ کانگریس کی سرگرم قیادت سنبھال لیں۔ میں آپ کو بتاتے ہوئے بے حد مسرور ہوں کہ وہ اس پر رضامند ہو گئے ہیں اور اب ان کے اور ورکنگ کمیٹی کے درمیان کوئی اختلاف باقی نہیں رہا۔"

(مہاتما از تندولکر' جلد ۵' صفحہ ۳۱۸)

کانگریس کی سرگرم قیادت دوبارہ سنبھالنے کے بعد گاندھی جی نے عدم تشدد کی جنگ از سرنو شروع کر دی۔ یہ نئی جنگ عوامی سطح پر استوار نہیں کی گئی بلکہ اسے کچھ منتخب افراد تک محدود رکھا گیا۔ ستیہ گرہی بننے کے لئے جس پہلے شخص کو منتخب کیا گیا وہ ابھی تک گاندھی جی کے آشرم کا ایک غیر معروف رہائشی تھا۔ اس کا نام ونوبھاوے تھا جس نے بعد ازاں بھودن تحریک کا رہنما بن کر بے حد شہرت پائی۔ یہ انفرادی ستیہ گرہ آزادی اظہار کے بنیادی حق کی اساس پر شروع کیا گیا۔ اس (ونوبھادے) نے کہا۔

"مجھے وہ آزادانہ کہنے کا حق ہونا چاہئے جو کچھ میں اس جنگ کے متعلق محسوس کرتا ہوں ---- میں بمبئی کی سڑکوں پر گھومنے کی آزادی چاہتا ہوں یہ کہتے ہوئے کہ مجھے اس جنگ سے کوئی سروکار نہیں کیونکہ میں اس جنگ میں یقین نہیں رکھتا"

(مہاتما از تندولکر' جلد ۵' صفحہ ۳۲۳)

لیکن یہ انفرادی ستیہ گرہ تحریک نسبتاً غیر موثر ثابت ہوئی اور بالآخر بالکل ختم ہو گئی۔ بہت جلد گاندھی جی اور ورکنگ کمیٹی کے درمیان آویزش دوبارہ شروع ہو گئی۔ یہ کشمکش اس وقت ابھری جب ۷ دسمبر ۱۹۴۱ء کو جاپان نے پرل ہاربر پر حملہ کیا اور اس کے بعد ملایا اور سنگاپور کا رخ کیا جس سے جنگ بالکل ہندوستان کے دروازے تک پہنچ گئی۔ اب گاندھی جی اور ورکنگ کمیٹی دونوں کو خطرے کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینا تھا چنانچہ ایک مرتبہ پھر گاندھی جی سے کہا گیا کہ وہ کانگریس کی قیادت سے دستبردار ہو جائیں۔ کانگریس اور ورکنگ کمیٹی کے ساتھ گاندھی جی کی وقتاً فوقتاً آویزشیں اور کانگریس سے ان کی جزوی کنارہ کشی اور پھر ان کا اپنے تعمیری کام کی جانب متوجہ ہو جانا ان کی نفسیات کے ایک لطیف نکتے کا عکاس ہے۔ یہ چپقلشیں حقیقی سے زیادہ ظاہری ہوتی تھیں اور وہ کسی مقصد کے حصول کی خاطر انہیں سوچ سمجھ کر پیدا کرتے تھے۔ کانگریس کی قیادت سے ان کا وابستہ ہونا' پھر علیحدہ ہونا اور پھر وابستہ ہو جانا فی الاصل انگریزوں کے خلاف ان کی جنگی

چالوں کا ایک حصہ تھا جس کا عدم تشدد کے ارفع اصولوں سے کوئی تعلق نہیں تھا

ای ایم ایس نمبودری پد اپنی کتاب مہاتما اور ازم' کے صفحہ ۹۴ پر لکھتے ہیں۔

"کانگریس اور ورکنگ کمیٹی کے درمیان اصل مسئلہ اخلاقی یا قومی دفاع کے لئے طاقت کے استعمال سے متعلق ہرگز نہیں تھا بلکہ اصل وجہ نزاع یہ تھی کہ انگریزوں سے بات چیت کیسے کی جائے اور ان پر دباؤ کیونکر ڈالا جائے۔

"گاندھی جی کی تبلیغ عدم تشدد اور جنگ کو غیر متشدد انداز میں لڑنے کا عزم انگریزوں کے خلاف دباؤ کے لئے موثر حربہ ثابت ہوا۔ چنانچہ جب کبھی بھی جدوجہد کی دھمکی دینے یا جدوجہد شروع کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی' ورکنگ کمیٹی خود کو فوراً گاندھی جی کی قیادت کی تحویل میں دے دیتی تھی۔

"دوسری جانب جب کبھی انگریزوں کے ساتھ بات چیت کا موقع آتا تھا ورکنگ کمیٹی فوراً "حقیقت پسندانہ انداز" اپنا لیتی تھی کہ بات چیت صرف اس بنیاد پر ہو گی کہ ہندوستان کے تعاون کی پیشکش انتقال اقتدار کے ساتھ مشروط ہو گی۔ ایسے تمام مواقع پر گاندھی جی خود کہتے تھے کہ انہیں قیادت سے سبکدوش کر دیا جائے جس سے ورکنگ کمیٹی فوراً متفق ہو جاتی تھی۔ یہ بلاشبہ بہت عمدہ انتظام تھا جو بنیادی لائحہ عمل کے لئے بے حد موزوں تھا۔ ہارن مکرجی اپنی کتاب "گاندھی جی" کے صفحہ ۱۳۳ پر لکھتے ہیں۔

"گاندھی جی یوں مظاہرہ کر رہے تھے جیسے وہ بیک وقت ایک صوفی سنت اور سیاستدان ہوں اور وقتاً فوقتاً نظریاتی تبلیغ سے قطع نظر' وہ اور کانگریس فی الحقیقت کسی اخلاقیات یا قومی دفاع میں "عدم تشدد" کے استعمال سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے بلکہ انہیں زیادہ دلچسپی ان موثر حربوں سے تھی جو برطانیہ پر دباؤ ڈالنے کے لئے اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ نہایت آسانی سے ایک موقف کو دوسرے موقف میں بدل لیا جاتا تھا۔ جب کبھی بات چیت کے ذریعے معاملہ کرنے کے امکانات روشن نظر آتے' کانگریس عدم تشدد کا نام تک لینا ترک کر

دیتی تھی۔ لیکن جب برطانیہ کو دھمکانا مقصود ہوتا تو گاندھی جی کو مع عدم تشدد
دوبارہ طلب کر لیا جاتا۔ یہ ایک ایسا انتظام تھا جس میں گاندھی جی اپنے ساتھ
کوئی تشدد کیے بغیر فریق بن سکتے تھے کیونکہ وہ نہ تو مکمل سیاستدان تھے اور نہ
کوئی ثابت قدم صوفی۔"

گاندھی جی کی کانگریس سے علیحدگی یا ریٹائرمنٹ حقیقتاً اس لئے بے معنی تھی کہ خواہ وہ
کانگریس کے اندر ہوتے یا باہر ورکنگ کمیٹی ان کی ہدایت کے بغیر ایک قدم تک نہیں
اٹھاتی تھی۔ چنانچہ ورکنگ کمیٹی نے انہیں کانگریس کی عملی قیادت سے بری الذمہ کر کے
اپنے عظیم آدرش کو اپنے طریقہ سے حاصل کرنے کے لئے آزاد کیا تھا' یہ عمل دھوکے یا
ڈھونگ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔

۱۹۴۱ء اور ۴۲ء میں گاندھی جی اور کانگریس کے کارکنوں سے معاملات طے کرنے
کے متعلق نمبودری پد اپنی کتاب کے صفحہ ۹۴ پر لکھتے ہیں۔

خاص اس مقصد کے لئے کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی مذاکرات جاری رکھنے کے قابل
ہو سکے' گاندھی جی نے ۱۹۴۱ء کے اختتام اور ۱۹۴۲ء کے آغاز میں کانگریس کی قیادت
چھوڑی۔ جب کانگریس کے صدر اور ورکنگ کمیٹی باقاعدہ طور پر مذاکرات کر رہی تھی تب
بھی ہر قدم پر گاندھی جی سے ہدایت لی جاتی تھی۔ اگرچہ گاندھی جی نے رسمی طور پر خود کو
مذاکرات سے باہر رکھا لیکن کانگریس کے مذاکرات کی پالیسی تشکیل دینے میں فیصلہ کن
آواز انہی کی تھی۔ لیکن جونہی بات چیت کا سلسلہ ٹوٹا' جونہی یہ واضح ہوا کہ انگریز
کانگریس کے پیش کردہ کم سے کم مطالبات تسلیم کرنے پر بھی تیار نہیں گاندھی جی فوراً
جنگ اور انگریزوں کے خلاف عوامی تحریک کے رہنما بن کر محاذ پر آ گئے۔"

آیئے دوبارہ "اگست پیشکش" کا رخ کریں۔ آمرے کو ہرگز یہ توقع نہ تھی کہ
کانگریسی حلقے' ۸ اگست کے برطانوی اعلان نامے پر اس قدر شدید احتجاج کا طوفان کھڑا کر
لیں گے۔ وہ اگست پیشکش کے اس تاثر کو ختم کرنے کے لئے بے چین تھا کہ اس سے

حکومت برطانیہ نے ہندوستان کی تقسیم کے لئے منصوبہ پاکستان کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

نومبر ۱۹۴۰ء میں اس نے ایک تقریر میں: ہندوستان کی لازمی وحدت پر زور دیا اور اسے برقرار رکھنے کی ضرورت اجاگر کی۔ اس نے جنوب مشرقی یورپ کے عوام پر بلقانستان کے قیام سے پڑنے والے ہولناک اثرات کی جانب اشارہ کیا۔ اس نے کہا کہ اس کا مقصد ایک ایسے دستور کی بنیاد رکھنا ہے جو ہندوستان میں موجود تفرقات کو مٹائے اور ہندوستان کی وحدت کو لازماً قائم رکھے۔ اس نے افسوس ظاہر کیا کہ "ہندوستان کے مفاد کو اولیت دینے" کا جذبہ اس قدر توانا نہیں رہا کہ وہ ایک طرف غیر عملی مطالبات کے اصرار پر غالب آسکے اور دوسری طرف بے جا شکوک و شبہات کا ازالہ کرسکے۔" جب کہ آمرے کی تقریر پر مسلم لیگ کا رد عمل ۲۲ فروری ۱۹۴۱ء کو ورکنگ کمیٹی کی مندرجہ ذیل قرار سے ظاہر ہوتا ہے۔

"ورکنگ کمیٹی وزیر خارجہ برائے امور ہند مسٹر آمرے کے حالیہ بیان پر اختلاف کا اظہار کرتی ہے۔ جو مسلمانوں کے ذہنوں میں گہرے خوف کی پیدائش کا موجب بن سکتا ہے۔ یہ بیان ان کے سابق اعلانات سے متضاد ہے اور اس میں کہا گیا ہے کہ سرکار ابھی تک ایسے آئین کے امکان پر غور کر رہی ہے جو ہندوستان کی اقتصادی اور سیاسی وحدت پر مبنی ہو-----"

(انتقال اقتدار از وی پی مینن، صفحہ ۱۰۴)

"یہ بھی بدنصیبی ہے کہ مسٹر آمرے کو وزیر خارجہ برائے امور ہند کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ہندوستان کے مفاد کی اولیت جیسے نعروں میں ملوث نہیں ہونا چاہئے۔

"ہندوستان کے مسلمان، ہندوستانی ہونے پر فخر کرتے ہیں اور ان کا پختہ عقیدہ ہے کہ ہندوستان ہندوستانیوں کے لیے ہے اور اسی مفہوم میں قرارداد لاہور منظور کی گئی تھی کیونکہ مسلمانوں کو یقین ہے کہ ہندوستان کے دستوری

مسائل کا واحد حل یہی ہے اور اسی سے اس وسیع و عریض ملک کے تمام عناصر، مفادات اور باشندوں کے درمیان امن، ہم آہنگی اور اطمینان کی ضمانت مل سکتی ہے۔"

(ایضاً)۔

مندرجہ بالا قرارداد کا آخری پیراگراف خصوصی طور پر قابل غور ہے۔ اس سے ہم دوبارہ مشہور قرارداد لاہور کی جانب آتے ہیں جو قرارداد پاکستان کے نام سے بھی معروف ہے۔ کیا اس قرارداد میں فی الحقیقت ہندوستان کو دو مکمل، علیحدہ اور خود مختار ریاستوں میں تقسیم کرنے کی بات کی گئی تھی؟ یا ہندو اور سکھ پریس نے خوف کے عالم میں اس میں کوئی ایسی چیز دیکھ لی تھی جو فی لاصل اس میں موجود ہی نہ تھی۔ غالباً وہ جناح کے دو قومی نظریے سے مغلوب ہو گئے تھے۔ حالیہ قرارداد میں کہا گیا تھا۔

"ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندوستانی ہونے پر ناز ہے اور ان کا پختہ عقیدہ ہے کہ ہندوستان، ہندوستانیوں کے لئے ہے۔"

یہی وہ مفہوم ہے جس میں قرارداد لاہور منظور کی گئی تھی" اس فقرے سے بالتصریح سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک مسلم لیگ کا ہرگز کوئی ایسا ارادہ نہیں تھا کہ ہندوستان کو قطعی طور پر دو ممالک میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس نقطہ نظر کی تائید پنجاب کے وزیراعظم سر سکندر حیات خان کی تقریر سے بھی ہوتی ہے۔ جو انہوں نے پنجاب کی مجلس قانون ساز میں ۱۱ مارچ ۱۹۴۱ء کو کی۔ اس تقریر کا تفصیلی تذکرہ کچھ دیر ٹھہر کر کیا جائے گا۔

ہم یہاں قاری کی توجہ جناح کے اس خط کی جانب مبذول کروانا چاہیں گے جو انہوں نے ۱۹۴۰ء کے سال نو کے موقعے پر گاندھی جی کو لکھا "آج آپ سے بڑھ کر ہندوستان میں کوئی ایسا انسان نہیں جس پر ہندو انڈیا کو اس قدر اعتماد ہو اور آپ اس کے ایماء پر اقدام کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔ یہ امید تو

اب بعید از قیاس ہے کہ آپ اپنا جائز کردار ادا کریں گے اور سراب کا پیچھا کرنا چھوڑ دیں گے۔ واقعات تیزی سے متحرک ہیں آپ کی زبانی جمع خرچ کی مہم یا ہفتہ وار ہریجن میں آپ کے مابعد الطبیعات، فلسفے، اخلاقیات یا کھڈی، اہنسا اور چرخہ کاتنے سے متعلق مخصوص نظریات ہندوستان کے لئے آزادی حاصل نہیں کر سکتے۔ آگے بڑھنے میں صرف عمل اور سیاسی دانش ہی ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ آپ اب بھی ہمارے ملک کی خدمت کے لئے اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں اور ہندوستان کو اطمینان اور مسرت کی طرف لے جانے میں اپنا مناسب حصہ شامل کر سکتے ہیں۔"

(جناح از ایم ایچ سید، صفحات ۶۵۸-۶۵۵)

اس سے اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ اس وقت تک جناح اور مسلم لیگ صرف ایک ایسا آئین چاہتے تھے جو مسلم ہندوستان کی بنیادی وحدت کو برقرار رکھتے ہوئے مسلم اکثریت کے علاقوں میں مسلمانوں کے حق خود ارادی کی ضمانت دیتا ہو۔

باب 25

ہندوستان چھوڑ دو بمقابلہ گاندھی جی کا مقصد حیات

(۱۹۴۲ء)

جنگ عظیم دوم میں جاپان کی شرکت سے ہندوستان کی صورتحال ایک نئے دور میں داخل ہو گئی۔ امریکہ اور چین کو ہندوستان کے پورے تعاون کی ضرورت شدت سے محسوس ہوئی اور انہوں نے برطانیہ پر دباؤ ڈالا کہ وہ ہندوستان کے لئے ایسی نئی پالیسی کا اعلان کرے تاکہ اتحادیوں کے لئے اس کا مکمل تعاون حاصل کیا جا سکے۔ فروری ۱۹۴۲ء میں چیانگ کائی شیک اور ان کی بیوی ۔نے ذاتی طور پر ہندوستان کا دورہ کیا اور وائسرائے اور ہندوستانی رہنماؤں سے ملاقات کی۔ سقوط رنگون ۷ مارچ کو عمل میں آیا یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہندوستان پر حملہ یقینی ہے۔ صدر روزویلٹ اب بہت پریشان ہو گئے اور انہوں نے برطانیہ پر از سر نو دباؤ ڈالا کہ وہ ہندوستان کو آزادی دے دے اور اس سلسلے میں اپنے ذاتی نمائندے کرنل لوئی جانسن کو ہندوستان بھیجا۔ ہر طرف سے دباؤ کا شکار ہونے پر ونسٹن چرچل' سر سٹیفورڈ کرپس کو ہندوستان کی آزادی سے متعلق کچھ تجاویز دے کر بھیجنے پر رضامند ہو گئے۔ سر سٹیفورڈ کرپس ۲۲ مارچ ۱۹۴۲ء کو ایک قرارداد کے خاکے سے لیس ہو کر دہلی آن وارد ہوئے۔ اس قرارداد میں حکومت برطانیہ کی جانب سے کہا گیا تھا کہ وہ جنگ کے خاتمے پر ہندوستان کو آزادی دینے کے لئے تیار ہے۔ ۲۹ مارچ کو ایک پریس کانفرنس میں انہوں نے وضاحت کی کہ فوری طور پر انتقال اقتدار کیوں ممکن نہیں۔ انہوں نے کہا کہ جنگ کے جاری رہنے تک حکومت برطانیہ خود کو ہندوستان کے دفاع کی ذمہ داری سے مبرا نہیں کر سکتی۔ جب گاندھی جی کرپس سے ملے اور ان کی تجاویز کا جائزہ لیا تو ان سے کہا "اگر یہی پیش کرنا تھا تو آنے کی ضرورت کیا تھی؟" اگر ہندوستان

کے لئے آپ کی کل تجاویز یہی ہیں تو میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ اگلے ہی طیارے سے وطن لوٹ جائیں" کہا جاتا ہے کہ انہوں نے کرپس کی تجاویز کو ایسے چیک قرار دیا جن کی تاریخ گزر چکی ہو اور انہیں ایک دیوالیہ بینک میں کیش کروایا جا رہا ہو۔ بعد ازاں گاندھی جی نے ان تجاویز میں مزید کوئی دلچسپی نہیں لی۔ تاہم راج گوپال اچاریا، نہرو اور مولانا آزاد برطانیہ کے ساتھ کوئی قابل عمل معاہدہ کرنے کے شدید خواہشمند تھے۔ لیکن اچانک ۱۱ اپریل ۱۹۴۲ء کو کرپس نے اپنی بات چیت کو مختصر کر دیا اور لندن روانہ ہو گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خود ونسٹن چرچل نے کانگریس اور کرپس کے درمیان مذاکرات بند کروا دیے کیونکہ انہیں گاندھی اور کانگریس میں سے کسی پر بھی بھروسہ نہیں تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ گاندھی جی اپنی امن پرستی اور عدم تشدد جیسے نظریات سے عسکری معاملات میں رکاوٹ ڈالیں گے۔ چرچل گاندھی جی کے ساتھ کسی خطرے میں پڑنے کے لئے تیار نہ تھے۔

کرپس کی واپسی سے نہرو شدید مایوس ہوئے کیونکہ کرپس کے ساتھ کسی معاہدے کے امکانات نہایت روشن نظر آتے تھے۔ یہاں تک کہ مذاکرات کا سلسلہ یکلخت ٹوٹ جانے پر بھی وہ یہ کہنے کا حوصلہ رکھتے تھے "جو کچھ ہوا اس کے باوجود ہم برطانیہ کو عسکری کاروائیوں میں پریشان نہیں کریں گے ----- ہمارا مسئلہ تو یہ ہے کہ ہم اپنی (کاروائیوں کو) کس طرح مرتب کریں" نہرو جاپان کی پیش رفت سے بے حد پریشان تھے اور انہوں نے جاپانی جارحیت کے خلاف خود بھی گوریلا جنگ لڑنے کی تجویز پیش کی جو کہ ہندوستان کی طرف سے آزادانہ جنگی کاروائی ہوتی۔ اس پر گاندھی جی نے یہ تبصرہ کیا "مجھے افسوس ہے کہ جواہر لال نے گوریلا جنگ کا خیال پال لیا ہے لیکن مجھے اس امر میں کوئی شک نہیں یہ محض نو روزہ بے سود کرشمہ ثابت ہو گا کیونکہ یہ (گوریلا جنگ) سرزمین ہندوستان کے لئے اجنبی ہے۔"

بہر طور کرپس کی واپسی کے بعد گاندھی جی نے خود بھی بڑے جلالی خیالات کا اظہار

کیا۔ ۱۹ اپریل ۱۹۴۲ء کو انہوں نے ایک مضمون تحریر کیا جو ۲۶ اپریل کے "ہریجن" میں شائع ہوا۔ اس میں گاندھی نے پہلی مرتبہ اپنے اس نظریے کا عوامی سطح پر اظہار کیا جسے ان کی "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کی صورت اختیار کرنا تھی۔ اس مضمون میں گاندھی جی نے کہا کہ اگر برطانیہ ہندوستان کو اس کے حال پر چھوڑ دے جیسے اسے سنگاپور کو چھوڑنا پڑا تھا تو غیر متشدد ہندوستان کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور شاید جاپان بھی ہندوستان کو تنہا چھوڑ دے۔ ان کے خیال میں ہندوستان اور برطانیہ دونوں کا مفاد' برطانیہ کے ہندوستان سے بروقت اور منظم انخلاء میں مضمر تھا۔ "مجھے بعد از جنگ آزادی سے کوئی دلچسپی نہیں میں ابھی آزادی چاہتا ہوں۔"

گاندھی جی نے اپنی خودنوشت سوانح عمری کا نام صداقت کے ساتھ میرے تجربات رکھا تھا اور غالباً ہندوستان چھوڑ دو' تحریک ان کی منفرد زندگی کا سب سے بڑا تجربہ تھی۔ یہ انہی خیالات کا نتیجہ تھی جنہوں نے انہیں ۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت میں کود پڑنے پر اکسایا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت کی قیادت کے بعد گاندھی جی کی تمام سرگرمیوں کے محرکات میں ایک تسلسل نظر آتا ہے۔ ۱۹۴۲ء میں انہوں نے سوچا کہ ہندوستان چھوڑ دو۔ تحریک سے انہیں وہ سب مل جائے گا جو وہ ۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت سے حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے۔ اگر "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ گاندھی جی بڑے عظیم مجاہد تھے۔ جنہوں نے اپنی حکمت عملی پنولین کی تکنیک اور میکاولی کی عیاری کے امتزاج سے تیار کی تھی۔ دور جنگ کے معروف امریکی صحافی لوسیس فشر نے گاندھی جی سے دریافت کیا کہ انہیں ہندوستان چھوڑ دو۔ کا خیال کیسے اور کہاں آیا؟ جواباً گاندھی جی نے کہا کہ اپریل ۱۹۴۲ء کے دوسرے ہفتے میں کرپس کی واپسی کے فوراً بعد اس خیال نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا۔ "میرے سوموار کے یوم خاموشی کے دوران یہ خیال میرے اندر وارد ہوا" ان کے وجدان نے اپنی چال چلنے کے لئے نفسیاتی لمحے کے انتخاب میں ان کی مدد کی۔ اس وقت تمام محاذوں پر اتحادیوں کو پسپائی کا سامنا تھا۔ مصر میں

رومیل قاہرہ اور نہر سویز کی جانب بھاگ رہا تھا۔ روس اور چین میں بھی صورتحال برابر خراب تھی۔ جہاں تک جنوب مشرقی ایشیاء کا تعلق ہے فیلڈ مارشل ا۔ینچلیک کا سوانح نگار لکھتا ہے۔

"اپریل ۱۹۴۲ء میں جنگ کی مجموعی صورتحال بے حد مایوس کن تھی کیونکہ جنوب مشرقی ایشیاء مکمل طور پر جاپان کے کنٹرول میں تھا۔ برما سے الیگزنڈر بچی کھچی شکست خوردہ فوج کو واپس لا رہا تھا اور جاپان کے جنگی بحری بیڑے اور ہوائی جہاز بحرہند کی حدود میں داخل ہو رہے تھے"

۲۳ اپریل کو دارلعوام کا ایک خفیہ اجلاس ہوا جس میں وزیراعظم نے پوری تفصیل سے ان تمام شدید پسپائیوں کی وجوہ اور نتائج پر روشنی ڈالی جنہیں اب بھگتنا تھا۔ گاندھی جی نے انگلستان کے اسی تاریک لمحے کو "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کے لئے منتخب کیا۔ مولانا آزاد کے مطابق "گاندھی جی کا خیال یوں تھا چونکہ جنگ ہندوستان کی سرحدوں تک پہنچ گئی ہے اس لئے تحریک کا آغاز ہوتے ہی برطانیہ کانگریس کے مطالبات تسلیم کر لے گا" چنانچہ جونہی یہ خیال گاندھی جی کے ذہن میں آیا انہوں نے الہ آباد میں ہونے والے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں زیر بحث لانے کے لئے ایک قرارداد کا مسودہ تیار کر کے بھیج دیا۔ گاندھی جی کی قرارداد کچھ اس طرح تھی۔

"برطانوی جنگی کابینہ کی تجاویز نے جو سرسٹیفورڈ کرپس نے پیش کیں، برطانوی امپیریلزم کو اس کے ننگے پن کے ساتھ اس طرح ظاہر کیا ہے جیسا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ۔

"آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی رائے میں برطانیہ ہندوستان کا دفاع نہیں کر سکتا۔ یہ بھی فطری کی ہے کہ جو کچھ بھی وہ کر رہا ہے اپنے دفاع کے لئے کر رہا ہے۔ برطانیہ اور ہندوستان کے مفادات کے درمیان دائمی تصادم ہے۔ جاپان کا جھگڑا ہندوستان کے ساتھ نہیں ہے وہ برطانوی ایمپائر کے خلاف لڑ رہا ہے ----- اگر

ہندوستان کو آزادی دے دی جائے تو غالباً اس کا پہلا اقدام جاپان سے مذاکرات ہو گا۔ کانگریس کا خیال ہے کہ اگر برطانیہ' ہندوستان سے نکل جائے تو بھارت جاپان یا کسی اور کی جارحیت کی صورت میں اپنا دفاع کرنے کے قابل ہے۔

"لہٰذا آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی یہی رائے ہے کہ برطانیہ کو ہندوستان سے نکل جانا چاہئے -----

"اکثریت اور اقلیت کا مسئلہ بھی برطانوی حکومت کی پیداوار ہے کہ ہندوستان کو ان سے یا دنیا کی کسی بھی قوم سے کوئی دشمنی نہیں ہے ----- چنانچہ کمیٹی امید کرتی ہے کہ جاپان ہندوستان کے خلاف کوئی عزائم نہیں رکھے گا۔ لیکن اگر جاپان بھارت پر حملہ کرتا ہے اور برطانیہ کوئی کارروائی نہیں کرتا تو کمیٹی ان تمام لوگوں سے توقع رکھتی ہے جو رہنمائی کے لئے کانگریس کی طرف دیکھتے ہیں کہ وہ جاپانی افواج کو مکمل عدم تشدد اور عدم تعاون کی پیشکش کریں گے۔

"آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی رائے میں غیر ملکی سپاہیوں کا ہندوستان میں داخلہ' ہندوستان کے مفادات اور اس کی تحریک آزادی کے لئے نقصان دہ ہے۔ ہندوستان کی لامتناہی افرادی قوت کی موجودگی میں غیر ملکی افواج کی آمد نہایت شرمناک ہے۔ -----"

اس مسودے پر کانگریس کے رہنماؤں میں نمایاں اختلاف رائے دیکھنے میں آیا۔ قرارداد کی مخالفت پنڈت نہرو اور سی راج گوپال اچاریا نے کی جب کہ موافقت کرنے والوں میں سردار پٹیل' ڈاکٹر راجندر پرشاد اور کرپلانی شامل تھے۔ نہرو اور راج گوپال اچاریا کا نقطہ نظریہ تھا۔

نہرو "اگر باپو کی بات مان لی جائے تو اس کا مطلب ہے کہ ہم فسطائی طاقتوں (جاپان' اٹلی' نازی جرمنی) کے خاموش شریک بن گئے ہیں ----- اس سودے کا تمام پس

منظر یہ ہے جو بلاشبہ پوری دنیا کو یہ سوچنے پر مجبور کردے گا کہ ہم خاموشی سے فسطائی قوتوں کے ہمراہ کھڑے ہیں۔ انگریزوں کو نکل جانے کے لئے کہا گیا ہے۔ ان کے جانے کے بعد ہم جاپان سے مذاکرات کریں گے اور غالباً اس سے کوئی معاہدہ طے کرلیں ----- آپ جاپان کو عدم تعاون یا عدم تشدد سے نہیں روک سکتے ----- اس مسودے کا واحد مفہوم اور پس منظر جاپان کی حمایت ہے۔

راج گوپال اچاریا: میں اس سے اتفاق نہیں کرتا کہ اگر برطانیہ نکل جائے تو ہندوستان خود کو منظم کر سکتا ہے۔ برطانیہ کے انخلاء سے پیدا ہونے والی جگہ فوراً جاپان لے لے گا ----- خود کو جاپان کے بازوؤں میں مت دھکیلیں"

اس کے بعد ہریجن میں گاندھی جی کا پروپیگنڈہ شروع ہوا۔

(ہریجن، ۱۷ مئی ۱۹۴۲)۔

"میں ہر برطانوی شہری سے کہتا ہوں کہ وہ برطانیہ سے میری اس اپیل کی حمایت کرے کہ وہ اسی وقت اپنے تمام ایشیائی اور افریقی قبضوں سے دستبردار ہو جائے اور کم از کم ہندوستان سے (فوراً نکل جائے) یہ اقدام دنیا کے تحفظ کے لئے بے حد ضروری ہے۔

"ہو سکتا ہے میرے عوام میرے ان نظریات سے متفق ہوں یا نہ ہوں۔ میں نے کسی سے مشورہ نہیں کیا۔ یہ اپیل میں نے اپنے ایام خاموشی کے دوران لکھی۔

ہریجن ۲۴ مئی۔

"اب تک ہمارے حکمران کہتے رہے ہیں ہم بخوشی ہندوستان سے نکل جاتے اگر ہمیں علم ہوتا کہ اس کی باگ ڈور کس کے سپرد کرنی ہے۔ میرا جواب اب یہ ہے ہندوستان کو خدا کے حوالے کر دیں اگر یہ بہت زیادہ ہے تو اسے انتشار، بد نظمی، نراجیت (انارکی) کو سونپ دیں۔"

"میں سادہ ترین الفاظ میں کہہ چکا ہوں کہ میرے خیال میں انتظامیہ کسی ایک فرد یا جماعت کے حوالے کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے ----- میرے خیال میں انہیں

ہندوستان کو خدا کے حوالے کر دینا چاہئے۔ لیکن جدید اصطلاح میں انہیں ہندوستان کو نراجیت (انارکی) کے سپرد کر دینا چاہیے کیونکہ انارکی ہمیں باہمی جنگوں کی راہ دکھائے گی یا کچھ عرصے کے لئے بے لگام ڈاکوؤں کے حوالے کر دے گی۔ اور انہی حالات سے اس چھوٹے ہندوستان کی جگہ جسے ہم دیکھ رہے ہیں ایک حقیقی ہندوستان پیدا ہو گا۔

ہریجن' ۳۱ مئی ۱۹۴۲ء۔

اس سرزمین کو نفرت سے نجات دلانے کا واحد راستہ قابل نفرت طاقت (برطانیہ) سے نجات پانا ہے۔ جب وجہ ختم ہو جائے گی تو نفرت بھی یقیناً ختم ہو جائے گی۔

"جہاں تک میں دیکھ سکتا ہوں دو فرقے اس وقت تک نہ سوچ سکتے ہیں اور نہ چیزوں کو ان کے مناسب تناظر میں دیکھ سکتے ہیں۔ جب تک کہ وہ ایک سنہری طاقت کے زیر اثر ہیں۔"

ہریجن' ۱۴ جون ۱۹۴۲ء

"میں انتظار کرتا رہا اور انتظار کرتا رہا یہاں تک کہ میں ملک میں عدم تشدد کی اتنی طاقت پیدا ہو جائے جو غیر ملکی طوق کو اتار پھینکنے کے لئے ضروری ہے۔ لیکن اب میرا رویہ بدل گیا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ یقینی خدشات کے باوجود مجھے عوام سے ضرور کہنا چاہئے کہ وہ غلامی کے خلاف مزاحمت کریں۔"

اب منظر واردھا میں تبدیل ہوتا ہے جہاں ورکنگ کمیٹی کا اجلاس گاندھی جی کے افکار پر مزید غور و فکر کے لئے منعقد ہوا۔ راج گوپال اچاریہ' نہرو اور مولانا آزاد نے یہاں بھی ان خیالات کی مخالفت کی۔ واردھا میں ہونے والی بحث کا احوال مولانا آزاد یوں بیان کرتے ہیں۔

"جب ورکنگ کمیٹی نے بحث کا آغاز کیا ----- جواہر لال نے میری حمایت کی اور بعد میں صرف ایک خاص حد تک ----- جواہر لال کے علاوہ جو اکثر مجھ سے متفق رہے' دیگر

ارکان گاندھی جی کی قیادت میں چلنے پر رضامند تھے۔ سردار پٹیل' ڈاکٹر راجندر پرشاد اور اچاریہ کرپلانی جنگ کے متعلق کوئی واضح تصور نہیں رکھتے تھے۔ وہ شاذ و نادر کسی چیز کو اپنے طور پر جانچتے تھے اور ہر حال میں گاندھی جی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے عادی تھے۔ چنانچہ ان کے ساتھ کسی قسم کی بحث بے سود تھی۔ ہماری تمام بحث کے بعد وہ محض اتنا کہہ سکے کہ ہمیں، گاندھی جی پر لازماً یقین (ایمان) رکھنا چاہئے۔ انہوں نے ۱۹۲۰ء کے نمک ستیہ گرہ کی مثال دی۔"

"ہمارے مباحث ۵ جولائی کو شروع ہوئے اور کئی روز جاری رہے۔ ہم پہلے بھی کئی موقعوں پر گاندھی جی سے اختلاف کرتے رہے تھے لیکن ہمارے اختلافات اس قدر مکمل کبھی نہیں تھے۔ یہ معاملہ اس وقت عروج پر پہنچ گیا جب انہوں نے مجھے خط لکھا کہ میرا موقف ان سے اس قدر مختلف ہو چکا ہے کہ ہم اکٹھے کام نہیں کر سکتے۔ اگر کانگریس چاہتی ہے کہ گاندھی جی تحریک کی قیادت نہ کریں تو مجھے اس کی صدارت سے لازماً استعفیٰ دے دینا چاہیے اور ورکنگ کمیٹی سے بھی علیحدہ ہو جانا چاہئے۔ جواہرلال کو بھی یہی کرنا چاہیے۔ میں فوراً جواہرلال سے ملنے گیا اور انہیں گاندھی جی کا خط دکھایا۔ سردار پٹیل بھی آ گئے اور اس خط کو پڑھ کر بھونچکا رہ گئے۔ وہ فوراً گاندھی جی کے پاس گئے اور ان کے اس اقدام پر احتجاج کیا۔ پٹیل نے کہا کہ اگر میں (مولانا آزاد) کانگریس کی صدارت سے مستعفی ہو جاؤں اور میں اور جواہرلال دونوں ورکنگ کمیٹی چھوڑ دیں تو اس کے اثرات ملک پر بہت برے ہوں گے۔ نہ صرف عوام کے خیالات میں الجھاؤ پیدا ہو گا بلکہ خود کانگریس کی بنیادیں ہل جائیں گی۔

"گاندھی جی نے یہ خط مجھے ۷ جولائی کی صبح کو بھیجا۔ تقریباً دوپہر کو وہ مجھے ملنے آئے۔ انہوں نے ایک طویل تقریر کی جس کا لب لباب یہ تھا کہ یہ خط انہوں نے صبح کو عجلت میں لکھا تھا۔ اب انہوں نے اس بات پر مزید غور کیا ہے اور وہ خط واپس لینا چاہتے ہیں۔ میں ان کے دلائل سے قائل ہوئے بغیر اور کچھ نہ کر سکا۔"

"ہم نے مجوزہ تحریک کے مختلف عناصر کی گہری تفصیلات پر بات چیت شروع کی ----- جواہر لال نے کہا کہ جو کچھ گاندھی جی کے ذہن میں ہے وہ درحقیقت کھلی بغاوت ہے خواہ یہ بغاوت غیر متشدد ہی کیوں نہ ہو۔ گاندھی جی نے اس لفظ کو سراہا اور کئی مرتبہ کھلے غیر متشدد انقلاب کا تذکرہ کیا۔"

(ہندوستان کا حصول آزادی، صفحہ ۷۵)

واردھا میں ورکنگ کمیٹی کی قرارداد، آلہ آباد میں گاندھی جی کے مسودے سے صرف ایک بنیادی نکتے پر مختلف تھی۔ اس قرارداد میں کانگریس نے جاپانی حملے سے بچاؤ کے لئے اتحادی افواج کے ہندوستان میں قیام پر رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ اس بنیادی نکتے میں گاندھی جی کی تبدیلی غالباً دو وجوہ کی بنیاد پر تھی۔ اول، پوری ورکنگ کمیٹی کو متحد رکھنے کی ضرورت۔ دوم۔ امریکی ہمدردی حاصل کرنے کی ضرورت۔ وہ اپنی "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کے لئے امریکی ہمدردی حاصل کرنے کے شدید متمنی تھے۔ اسی مقصد کے پیش نظر انہوں نے "امیرکن پریس" میں اشاعت کے لئے ایک مضمون تحریر کیا جس کا عنوان تھا "میرے امریکی دوستوں کے نام"

"جیسا کہ مجھے انڈین نیشنل کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کی بہت زیادہ موضوع بحث بننے والی اور برابر مطعون ہونے والی اس قرارداد کی حقیقی روح سمجھا جاتا ہے یہ میرے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ میں اپنی پوزیشن واضح کروں ----- میں آپ کے لئے اجنبی نہیں ہوں ----- سب سے بڑھ کر آپ نے مجھے تھورو کی شکل میں ایک استاد دیا جس کے مضمون "سول نافرمانی کا فرض" نے میرے اس کام کو سائنسی اثبات فراہم کیا جو میں جنوبی افریقہ میں کر رہا تھا۔ برطانیہ نے مجھے رسکن دیا جس کے (مضمون) "اس انتہا تک" (Untle this Last) نے راتوں رات میری کایا کلپ کر دی اور مجھے وکیل اور شہر کے باشندے سے ایک سادہ دیہاتی میں بدل دیا جو ڈربن سے دور ایک ایسے فارم پر رہنے لگا جہاں سے قریب ترین ریلوے اسٹیشن بھی ۳ میل دور تھا۔ اور روس نے مجھے ٹالسٹائی دیا ایک ایسا استاد جو

میرے نظریات عدم تشدد کی عقلی اساس بنا۔ یہی وہ انسان تھا جس نے میرے نام اپنے خط میں پیشن گوئی کی تھی کہ میں ایک ایسی تحریک کی قیادت کروں گا جو روئے ارض کے کچلے ہوئے انسانوں کے لئے امید کا پیام ثابت ہو گی۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ میرا موجودہ کام بھی کسی پہلو سے برطانیہ یا مغرب سے دشمنی پر مبنی نہیں۔ اس انتہا تک کے پیغام کو اچھی طرح سمجھنے اور اپنے اندر جذب کرنے کے بعد میں فاشزم اور نازی ازم کی حمایت کا خطاوار نہیں ہو سکتا جن کا نظام ہی فرد اور اس کی آزادی کو دبا دینے پر مشتمل ہے۔

"میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ میری جانب سے پیش کردہ انخلاء کے اس فارمولے کو جسے عام طور پر "ہندوستان چھوڑ دو" کہا جاتا ہے اس پس منظر میں پڑھیں آپ اس کو اس کے سیاق و سباق سے ہٹ کر نہیں پڑھ سکتے۔"

(کانگریس کی تاریخ از پٹہ بھائی سیتا رمیا' جلد دوم صفحات ۵۶-۳۵۷)

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے۔ گاندھی جی کا اندازہ تھا اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ حقیقتاً چاہتے تھے کہ عوام اتنے بھرپور انداز میں اٹھ کھڑے ہوں جس سے بے پناہ عوامی توانائی یا تشدد کے بے لگام اظہار میں مدد مل سکے۔ انہوں نے یہ اندازہ بھی کر لیا تھا کہ عوام نہ صرف سرکار برطانیہ بلکہ ہندوستان کے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے خلاف بھی اٹھ کھڑے ہو سکتے ہیں۔ امریکی صحافی لوییس فشر سے انہوں نے کہا "۱۵ دن بے حد انتشار اور بدنظمی کے ہو سکتے ہیں لیکن میرے خیال میں ہم جلد ہی اس پر قابو پا لیں گے۔"

ورکنگ کمیٹی نے ایک ہفتہ جاری رہنے والے مکمل غور و خوض کے بعد ۱۴ جولائی ۱۹۴۲ء کو ایک قرارداد منظور کر لی جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ ہندوستان میں انگریز راج فوری طور پر ختم ہو جانا چاہیے۔

واردھا قرارداد میں یہ بھی کہا گیا کہ اگر انگریزوں سے ہندوستان چھوڑ دینے کی اپیل ناکام رہی تو کانگریس نہ چاہنے کے باوجود اپنی وہ تمام غیر متشدد طاقت استعمال کرنے پر مجبور ہو گی جو اس نے ۱۹۲۰ء سے اب تک اکٹھی کی ہے جب اس نے عدم تشدد کی یہی پالیسی سیاسی

حقوق اور آزادی کے اظہار کے لئے استعمال کی تھی۔ ایسی وسیع پیمانے پر ہونے والی جدوجہد لازماً گاندھی جی کی قیادت میں ہونی چاہیے۔

جناح نے اس پر فوری رد عمل کا اظہار کیا اور مندرجہ ذیل بیان شائع کروایا۔

"۱۴ جولائی ۱۹۴۲ء کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کا تازہ ترین فیصلہ' جس میں کہا گیا ہے کہ اگر انگریز ہندوستان سے نہ نکلے تو ان کے خلاف عوامی تحریک شروع کی جائے گی۔ مسٹر گاندھی اور ان کی انگریزوں کو بلیک میل کرنے والی ہندو کانگریس کی پالیسی اور پروگرام کا نقطہ عروج ہے۔ کانگریس انہیں مجبور کرنا چاہتی ہے کہ وہ اسے ایک نظام حکومت تشکیل دینے کی اجازت دیں اور اقتدار اس حکومت کو منتقل کر دیں جو فوراً ملک میں ایک ہندو راج قائم کر دے گی اور مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے مفادات کو کانگریس کے رحم و کرم پر چھوڑ دے گی۔"

"انتقال اقتدار از وی پی مینن' صفحہ ۱۴۱)

سر تیج بہادر سپرو اور شری نواس شاستری نے ورکنگ کمیٹی کی جانب سے اس قرارداد کی منظوری پر گہرے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے ورکنگ کمیٹی کے ارکان کو ملک کے بہترین مفادات کا مخالف قرار دیا۔ ملک کی دیگر جماعتوں نے بھی کانگریس کی قرارداد کی مذمت کی۔ حکومت برطانیہ نے بھی توقع کے مطابق اس پر شدید رد عمل ظاہر کیا۔ وزیر خارجہ برائے امور ہند مسٹر امرے نے دارالعوام میں اعلان کیا کہ حکومت کانگریس کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے کوئی بھی ممکنہ اقدام کرنے سے گریز نہیں کرے گی۔

اپنی "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک میں گاندھی جی جنونی سے بھی کچھ بڑھ کر بن گئے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی سحر میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ورکنگ کمیٹی کے سرکردہ رہنما ان کے خیالات سے متعلق شکوک و شبہات میں مبتلا تھے اور انہوں نے گاندھی جی کو قائل کرنے کی بے حد کوشش کی لیکن ان کے سامنے گاندھی جی بے حد طاقتور تھے اور

انہوں نے انہیں یکسر مسترد کر دیا۔ واردھا میں ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں نہرو نے گاندھی جی کو ان کے بے ربط لائحہ عمل سے ہٹانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ خود گاندھی جی کے مطابق "وہ (نہرو) میری پوزیشن کے خلاف اس شدت سے لڑے کہ میرے پاس اسے بیان کرنے کے لئے الفاظ نہیں ہیں" ----- ورکنگ کمیٹی کے منحرفین نے صرف اس آخری مقام پر ہتھیار ڈالے جب گاندھی جی نے انہیں کانگریس سے اپنے قطع تعلق کی دھمکی دے دی اور کہا کہ وہ "ہند کی مٹی سے دور چلے جائیں گے تاکہ ایسی تحریک تشکیل دے سکیں جو خود کانگریس سے بھی بڑی ہو گی۔"

(نہرو از مائیکل بریشر، صفحہ ۲۵۸)

بعد ازاں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ۷ اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی میں ہوا جہاں قرارداد وارھا کی رسمی منظوری دی گئی۔ یہاں گاندھی جی نے کہا-----

"اگر دنیا کی تمام اقوام میری مخالفت کریں اگر پورا ہندوستان مجھے قائل کرنے کی کوشش کرے کہ میں غلط ہوں، لیکن میں آگے بڑھتا رہوں گا محض ہندوستان کی خاطر نہیں بلکہ پوری دنیا کی خاطر"

(مہاتما گاندھی ----- آخری دور، جلد اول، صفحہ ۹)

اس اندرونی تیقن اور استقامت سے، جس نے سب کو ہلا کر رکھ دیا وہ تمام مخالفتوں پر غالب آگئے۔ اور غیر ملکی تسلط کے خلاف ایک اور 'آخری' سب سے بڑی اور بہترین جنگ لڑنے کے لئے اپنے پرانے محافظوں کو اپنی اخلاقی اور عملی مدد کے لئے تیار کر لیا۔

(مہاتما گاندھی ----- آخری دور از پیارے لال، جلد اول، صفحہ ۹)

گاندھی جی نے مزید کہا میں مکمل آزادی کے سوا کسی چیز سے مطمئن نہیں ہوں گا۔ میں آپ کو ایک مختصر سا منتر دیتا ہوں آپ اسے اپنے دل پر مرتسم کر سکتے ہیں اور اپنے ہر سانس کو اس کا اظہار بنا سکتے ہیں۔ یہ منتر ہے۔ کرو یا مرو، ہم یا تو آزاد ہندوستان دیکھیں گے یا اس جدوجہد میں مر جائیں گے ----- میں نے خود کو کانگریس سے وابستہ کر دیا ہے اور

کانگریس نے خود کو اس عزم سے وابستہ کر لیا ہے کہ وہ (جدوجہد آزادی) کرے گی یا مر جائے گی"

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے بمبئی میں اپنے ۷ اور ۸ اگست کے اجلاسوں میں ورکنگ کمیٹی کی ۱۴ جولائی کی قرارداد کو مکمل طور پر منظور کر لیا۔ یہ پنڈت نہرو تھے جواب تک گاندھی جی کے نظریات پر مکمل طور پر ایمان لا چکے تھے' وہ اس قرارداد کی منظوری کے لئے آگے بڑھے جس میں انگریزوں سے فوری طور پر ہندوستان چھوڑ دینے کے لئے کہا گیا تھا۔ اس قرارداد میں انگریز راج کے فوری خاتمے کا مطالبہ نہ مانے جانے کی صورت میں گاندھی جی کی قیادت میں عدم تشدد کے خطوط پر عوامی تحریک شروع کرنے کی مکمل منظوری دی گئی تھی۔ حکومت بھی اس چیلنج سے نمٹنے کے لئے تیار تھی اور ۸ اور ۹ اگست کی درمیانی شب گاندھی جی' ورکنگ کمیٹی کے ارکان اور دیگر سرکردہ کانگریسی رہنماؤں کو گرفتار کر کے حراست میں لے لیا گیا۔ گاندھی جی کو پونا میں آغا خاں کے محل میں رکھا گیا جب کہ دیگر رہنماؤں کو قلعہ احمد نگر میں قید کیا گیا۔ گاندھی جی کو طبی بنیادوں پر مئی ۱۹۴۴ء میں رہا کر دیا گیا جب کہ دیگر رہنماؤں کو جنگ کے خاتمے کے بعد جون ۱۹۴۵ء میں رہا کیا گیا۔

اچاریہ کرپلانی نے ۴ دسمبر ۱۹۶۱ء کو لوک سبھا میں اپنی تقریر کے دوران کہا "کانگریس ورکنگ کمیٹی کے بیشتر ارکان ہندوستان چھوڑ دو تحریک کے خلاف تھے۔ پھر گاندھی جی نے کہا آپ کانگریس کے ارکان ایک قابل احترام اور بہت ذمہ دار تنظیم ہیں۔ آپ یہ جوا نہیں کھیل سکتے۔ لیکن میں نے تمام عمر جوا کھیلا ہے اور میں اسے تنہا کھیل لوں گا"

آیئے دیکھیں کہ اس عظیم جوئے میں کیا داؤ پر لگایا گیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گاندھی جی کو مخلصانہ طور پر یہ یقین تھا کہ اگر انگریز ہندوستان سے نکل گئے تو جاپان کے پاس اس پر حملہ کرنے کا کوئی جواز نہیں ہو گا۔ اسی نقطہ نظر سے ہندوستان چھوڑ دو' کا نعرہ بے حد معقول نظر آتا ہے۔ بلاشبہ یہ عامل بھی ان کے ذہن میں کام کر رہا تھا لیکن غالباً ان

کی مرکزی محرک قوت ایک دوسری جانب سے آئی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ان کی زندگی کا عظیم لمحہ تب آئے گا جب وہ اپنی زندگی کے اس مشن کو پورا کرنے کے قابل ہوں گے جس کے لئے وہ جنوبی افریقہ سے ہندوستان آئے تھے۔ انہیں اس کا پہلا موقع تحریک خلافت کے دوران اور دوسرا اب نظر آیا تھا۔ اگر انگریزوں کو ہندوستان سے نکال دیا جاتا تو ہندوستان کی کوئی طاقت گاندھی جی کے عروج کو نہ روک سکتی۔ گاندھی جی کی ذات میں پیغمبر اور سیاستدان کے امتزاج نے انہیں ایک نہایت عظیم اور طاقتور قوت بنا دیا تھا۔ ۱۹۲۰ء سے اب تک وہ متواتر فتح مند ہوتے آئے تھے اور تمام مخالف قوتوں نے ان کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے سوائے جناح کے جو ان کی راہ کی واحد رکاوٹ تھے۔ جناح اب ایک قلعہ بند حیثیت حاصل کر چکے تھے کیونکہ سرکار برطانیہ اور برطانوی حکام مضبوطی سے ان کی پشت پر کھڑے تھے۔ ایک مرتبہ یہ ہندوستان سے نکل جاتے تو گاندھی جی ایک لمحے میں جناح کو کچل کر رکھ دیتے اور پورا ہندوستان ان کے قدموں پر گر جاتا اور وہ ملک کے طول و عرض میں ہر شے کے مالک ہوتے ----- راج چکرورتی یا ہندوستان میں مقدس گاندھی سلطنت کے پوپ۔ اس طرح گاندھی ازم ہندوستان میں پوری طرح مستحکم ہو جائے گا اور ہر شخص کو گاندھی جی کے فرامین کی اطاعت کرنی ہو گی۔ اس کے بعد ان کے مبلغین پوری دنیا میں گاندھی ازم کے پیغام کی تبلیغ کریں گے جو پھر دنیا بھر میں گونجے گا۔ ان کے "ہندوستان چھوڑ دو" جوئے کا غالباً یہی مقصد تھا یہ وہ عظیم خیال تھا جس نے انہیں متحرک کیا اور اس وقت ان کے مزاج کو پاگل پن کے قریب پہنچا دیا جب انہوں نے اپنی "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کا آغاز کیا۔ یہ ناممکن تھا کہ محض غیر ملکی تسلط کے خاتمے کی خواہش ان کے مزاج کو اس نہج تک پہنچاتی۔ بعد ازاں جب گاندھی جی نے کیبنٹ مشن کو سبوتاژ کیا اور ورکنگ کمیٹی کی اکثریت کی ہدایت کو مسترد کر دیا اس وقت بھی وہ اسی محرک کے زیر اثر تھے۔ اگر عین اس دن سے گاندھی جی کے لائحہ عمل کی کڑی جانچ کی جائے جب وہ ۱۹۱۵ء میں سرزمین ہندوستان پر وارد ہوئے تھے تو علم ہو گا کہ اپنی گونا

گوں سرگرمیوں کے باوجود انہوں نے اس امر کو ایک لمحے کے لئے بھی فراموش نہیں کیا جسے وہ اپنی زندگی کا مقصد تصور کرتے تھے ----- یہی کہ ان کے پاس پوری دنیا کے لئے ایک پیغام ہے۔ اس ضمن میں گاندھی جی کا وہ جواب دہرانے کے قابل ہے جو انہوں نے رابندر ناتھ ٹیگور کو دیا تھا۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے ۱۹۲۱ء کی تحریک عدم تعاون میں گاندھی جی کی کچھ سرگرمیوں پر احتجاج کیا تھا جس پر گاندھی جی نے لکھا تھا ----- "میرے انکسار نے مجھے گھر کی چھت پر چڑھ کر یہ اعلان کرنے سے روک رکھا ہے کہ عدم تعاون اور عدم تشدد کا پیغام پوری دنیا کے لئے ایک پیغام ہے۔ اگر یہ اس مٹی میں ثمر آور نہ ہو جس میں پیدا ہوا ہے تو پھر یہ لازماً ناکام ہو جائے گا"

گاندھی جی کی "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک مکمل طور پر ناکام ٹھہری اور ہندوستان کو گاندھی جی کے عالمی نجات دہندہ بننے کی کوشش کی قیمت ادا کرنی پڑی۔ یہ سزا ہندوستان کی تقسیم تھی۔ اس لمحے سے جب کانگریس نے ۱۹۳۷ء میں وزارتیں قبول کی تھیں گاندھی جی ہی کانگریس کے سب سے بڑے رہنما اور مشیر تھے اور وہ کانگریس ہائی کمان کے ذریعے اپنی بالادستی اور طاقت کا اظہار کرتے رہے۔ اس عرصے کے دوران ہونے والی ہر غلطی کی حتمی ذمہ داری لازماً مشیر اعلیٰ ہی کو قبول کرنی چاہیئے۔ کانگریس کے وزارتیں قبول کرنے کے وقت خصوصاً اعلان جنگ کے بعد اس کا ہر ہر اقدام غلط اور سمجھ بوجھ سے عاری تھا کیونکہ اس نے حقائق اور خاص طور پر صورتحال کو کبھی پیش نظر نہیں رکھا۔ جناح نے کانگریس کی غلطیوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور حکومت برطانیہ اور مسلم عوام دونوں کی نظر میں اپنی حیثیت کو مضبوط اور مستحکم کر لیا۔ جناح اور مسلم لیگ دونوں اب نظرانداز کیے جانے کے قابل نہ رہے تھے۔

یہ سچ ہے کہ ہندوستان کو ہندوستانی مقننہ کی رضامندی کے بغیر متحارب ملک قرار دیا گیا تھا لیکن وائسرائے نے کانگریس اور خصوصاً گاندھی جی کو اپنے ساتھ ملائے رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ فی الواقعہ وہ جزوی طور پر اس میں کامیاب بھی ہو گیا لیکن

بعدازاں گاندھی جی نے اپنا ذہن بدل لیا اور ان کا رویہ سخت ہونے لگا اور انہوں نے کانگریس کو وزارتوں سے مستعفی ہونے کی ہدایت جاری کی۔ ۱۹۴۰ء کے آغاز میں انہوں نے کانگریس کے اجلاس رام گڑھ میں سول نافرمانی کی تحریک دوبارہ شروع کر دینے کی دھمکی دی تھی۔ پس گاندھی جی نے ایسی صورتحال پیدا کر دی کہ لارڈ لن لتھ گو کے پاس مسلم لیگ اور جناح سے ہمدردی حاصل کرنے کے سوا کوئی اور چارہ نہ رہا۔ ان حالات میں مسلمانوں کو مطمئن رکھنے کے لئے حکومت برطانیہ نے انہیں واضح یقین دہانی کروائی کہ آئندہ ہندوستان کا دستور تیار کرتے وقت مسلمانوں کے جذبات اور خواہشات کا پورا احترام کیا جائے گا۔ اس طرح پاکستان کا بیج بویا گیا۔

آسمانی فضاؤں میں پرواز کرنے اور مسیحا کا کردار ادا کرنے کی شدید خواہش میں گاندھی جی نے ہندوستان کے ارضی مفادات کو یکسر فراموش کر دیا۔ انہوں نے راستے کے سرخ نشان بھی نہیں دیکھے۔ ہندوستان چھوڑ دو' تحریک نے جلتی پر تیل کا کردار ادا کیا اور ایک الگ اور خودمختار مسلم ریاست کے قیام کے لئے مسلم لیگ کے راستے کی تمام رکاوٹیں جلا دیں۔ "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک نے قیام پاکستان راستہ ہموار کیا۔ گاندھی جی کا جوا خود ان کی اور ہندوستان کی تباہی پر منتج ہوا۔

باب نمبر ۲۶

رہائی کے بعد گاندھی جی کی سرگرمیاں (۱۹۴۴ - ۱۹۴۵ء)

اول : حکومت کو مطمئن کرنے کے لئے ان کی کوششیں

مئی ۱۹۴۴ء میں قید سے رہائی کے بعد گاندھی جی نے ایسا رویہ اختیار کیا جو ان کے پہلے نظریات سے یکسر الٹ تھا اور فطری طور پر رویے کی اس تبدیلی سے بہت سی الجھنیں اور غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ ان کے نئے لائحہ عمل کا آغاز ایک پریس انٹرویو سے ہوا جو انہوں نے لندن کے اخبار دی نیوز کرونیکل' کے نمائندے سٹیورٹ گیلڈر کو دیا۔ گاندھی جی نے یہ پریس انٹرویو کیوں دیا؟ ان کے سوانح نویس پیارے لال نے "آخری دور" کی جلد اول کے صفحہ ۲۸ پر لکھا ہے۔

"اس بات کا (گاندھی جی نے) درست اندازہ لگا لیا تھا کہ بداعتمادی ہندوستان اور برطانیہ کے تعلقات کو خراب کر رہی ہے---- کانگریس سے بداعتمادی---- ہندوستان کی آزادی سے بداعتمادی---- اور خاص طور پر خود ان سے شدید ناگوار بداعتمادی ان کے عدم تشدد اور ہندوستان چھوڑ دو کے مطالبے سے بداعتمادی۔ چنانچہ گاندھی جی نے اس بد اعتمادی پر قابو پانے اور خیر سگالی کو بحال کرنے کے لئے تمام وسائل بروئے کار لانے شروع کر دیئے۔"

سٹیورٹ گیلڈر سے ان کی بات چیت کا مقصد' مفہوم اور لب لباب یہ تھا کہ وہ خود بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۴ء تک دنیا بہت بدل چکی ہے اور اب سول نافرمانی کی تحریک دوبارہ شروع کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انہوں نے اس بات پر بھی آمادگی ظاہر کی کہ وہ کانگریس کو ہدایت کریں گے کہ اگر ہندوستان کی آزادی کا فوراً اعلان کر کے ایک قومی حکومت تشکیل دی جائے تو اسے جنگی کارروائیوں میں بھرپور

تعاون کرنا چاہیے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اگر وہ وائسرائے سے ملاقات کر سکے تو انہیں بتائیں گے کہ ان کا مقصد عسکری کارروائیوں میں اتحادیوں کی مدد کرنا ہے نہ کہ رکاوٹیں ڈالنا جہاں تک اس پریس انٹرویو کے مقصد کا تعلق ہے۔ "یہ ان (گاندھی جی) کی انفرادی کوشش تھی تاکہ موجودہ جمود کو ختم کیا جا سکے۔ ان میں عوام سے زیادہ طاقتوں کو مخاطب کیا گیا تھا (ملاحظہ فرمایئے مہاتما اور ازم ازل نمبودری پد، صفحہ ۱۰۱) انہوں نے وائسرائے کو مندرجہ ذیل خط بھی لکھا:

"میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کو ہدایت کرنے کے لئے تیار ہوں کہ بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر اگست ۱۹۴۲ء کی قرارداد کے تحت منظور کردہ سول نافرمانی کی تحریک اب نہیں چلائی جا سکتی اور کانگریس حکومت کو عسکری کارروائیوں میں پورا تعاون کرنا چاہیے بشرطیکہ ہندوستان کی آزادی کا فوری اعلان کیا جائے اور ایک قومی حکومت قائم کی جائے جو مرکزی اسمبلی کے سامنے جوابدہ ہو۔ مزید شرط یہ رکھی جائے کہ جنگ کی طوالت کے دوران، فوجی کارروائیاں حالیہ طور پر جاری رہیں لیکن ان سے ہندوستان پر کوئی مالی بوجھ نہ پڑے۔ اگر حکومت برطانیہ کسی معاہدے کی خواہش مند ہے تو دوستانہ مذاکرات مکتوب نویسی کی جگہ لے سکتے ہیں لیکن میں آپ کے ہاتھوں میں ہوں۔"

(تندولکر، جلد ۶، صفحہ ۲۴۳)

لارڈ ویول نے اس خط کا جواب ۱۵ اگست ۱۹۴۴ء کو دیا جب اتحادیوں کی کامیابی نہ صرف یقینی تھی بلکہ نظر آ رہی تھی۔ ان حالات میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وائسرائے نے کیا جواب دیا ہو گا۔ گاندھی جی کی جانب سے کانگریس کی جنگ میں شمولیت کو شکریے کے ساتھ مسترد کر دیا گیا اور مذاکرات کے لئے ان کی درخواست بھی رد کر دی گئی۔ اس جواب کا نچوڑ یہ تھا کہ انگریزوں کو جنگ میں کانگریس کی مدد کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ ہی کانگریس اس پوزیشن میں ہے کہ سول نافرمانی کی تحریک کا احیاء کر سکے۔

مولانا آزاد نے گاندھی جی کی جانب سے وائسرائے کا دل موم کرنے کی کوشش پر اس طرح تبصرہ کیا ہے:

"حکومت سے مراسم بڑھانے کے لئے گاندھی جی کا اقدام نہایت بے وقت تھا۔ یاد رکھا جائے کہ جب رنجشوں کا آغاز ہوا تھا تو میں نے کانگریس کو قائل کرنے کی شدید کوشش کی تھی کہ جنگ کے تئیں حقیقت پسندانہ اور مثبت رویہ اختیار کیا جائے۔ گاندھی جی نے اس وقت یہ موقف اختیار کیا تھا کہ ہندوستان کی آزادی بلاشبہ اہم ہے لیکن عدم تشدد سے وابستگی اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ ان کی دو ٹوک پالیسی یہ تھی کہ اگر ہندوستان کی آزادی کا واحد راستہ جنگ میں شمولیت ہے تو وہ اسے اختیار نہیں کریں گے۔ اب وہ کہہ رہے تھے کہ کانگریس برطانیہ سے تعاون کرے گی اگر ہندوستان کو آزاد قرار دے دیا جائے' یہ ان کے ابتدائی نظریات سے یکسر الٹ تھا۔"

(ہندوستان کا حصول آزادی' صفحہ ۹۴)

عدم تشدد کی اس منافقت کے متعلق مولانا آزاد کے ریمارکس نہایت دلچسپ ہیں۔

"اب ۱۹۵۷ء میں لکھتے ہوئے جب میں واقعات کو ماضی کے تناظر میں دیکھتا ہوں تو میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تشدد اور عدم تشدد کے سوال پر ان (گاندھی جی) کے قریب ترین ساتھیوں کے رویے میں حیران کن تبدیلی آئی۔ جب کانگریس نے یہ قرارداد منظور کی کہ اگر برطانیہ ہندوستان کو آزاد قرار دے دے تو وہ عسکری کارروائیوں کی حمایت کرے گی تو سردار پٹیل' ڈاکٹر راجندر پرشاد' اچاریہ کرپلانی اور ڈاکٹر پرفلا گھوش ورکنگ کمیٹی سے مستعفی ہونا چاہتے تھے۔ انہوں نے مجھے لکھا کہ ان کے لئے عدم تشدد ایک فلسفہ حیات ہے اور ہندوستان کی آزادی سے زیادہ اہم ہے لیکن جب ۱۹۴۷ء میں ہندوستان واقعتاً آزاد ہو گیا تو ان میں سے کسی نے بھی نہیں کہا کہ ہندوستانی فوج کو تحلیل یا

معطل کر دینا چاہئے۔ اس کے برعکس انہوں نے اصرار کیا کہ ہندوستانی فوج کا بٹوارہ کرکے اسے حکومت ہند کے فوری کنٹرول میں دے دینا چاہئے۔ یہ خیال اس دور کے کمانڈر انچیف کی تجویز سے متضاد تھا۔ کمانڈر انچیف نے مشورہ دیا تھا کہ ۳ برس تک ایک متحدہ فوج اور متحدہ کمان ہی کو قائم رکھنا چاہئے لیکن یہ نہیں مانے۔۔۔۔۔ جس بات سے مجھے سب سے زیادہ حیرت ہوئی وہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کی مخالفت تھی۔ وہ امن پرست تھے اور عدم تشدد سے شدید ترین وابستگی رکھتے تھے۔ اب وہ فوج کی تقسیم کے اصرار میں پیش پیش تھے۔۔۔۔۔"

(ہندوستان کا حصول آزادی' صفحات ۱۹۹۴' ۲۰۲۔۲۰۱)

"مجھے یقین ہے کہ اگر فوج کو متحد رکھا گیا ہوتا تو خون کے ان دریاؤں کو بہنے سے روکا جا سکتا تھا جن کا سلسلہ آزادی کے فوراً بعد شروع ہو گیا تھا۔ فوج کو فرقہ وارانہ بنیادوں پر تقسیم کیا گیا۔۔۔۔۔ اب تک فوج میں کسی قسم کے فرقہ وارانہ جذبات نہیں تھے۔۔۔۔۔"

(ایضاً)

دوم : راج گوپال اچاریہ اور گاندھی جی کی جانب سے جناح کو پاکستان کی پیشکش (۱۹۴۴ء)

راج گوپال اچاریہ ہمیشہ آزادانہ سوچ کے مالک رہے تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ انہوں نے گاندھی جی کی "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک پر اپنی تنہا جنگ کس طرح لڑی۔ کرپس مشن کی ناکامی کے بعد راج گوپال اچاریہ اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ وقت آگیا ہے کہ مسلمانوں کو پاکستان دے دیا جائے۔ وہ محض اپنے خیالات کے عمومی اظہار پر قانع نہیں رہے بلکہ انہوں نے مدراس کانگریس لیجسلیچر پارٹی میں ایک قرارداد بھی پیش کی جس میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو تجویز پیش کی گئی تھی کہ وہ مسلم لیگ کا علیحدگی کا مطالبہ تسلیم کرلے۔ جن دلائل پر راج گوپال اچاریہ نے اپنے اس نتیجے کی بنیاد استوار کی تھی وہ اس قراردار میں بہت عمدگی سے پیش کئے گئے تھے۔ قرارداد کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

"جہاں تک مسلم لیگ کا یہ اصرار ہے کہ وہ اس سنگین قومی خطرے کے لمحے میں صرف اس شرط پر کسی متحدہ قومی کارروائی پر رضا مند ہو گی اگر متحدہ ہندوستان کے کچھ علاقوں کے علیحدگی کے حق کو وہاں کے عوام کی خواہشات کے مطابق تسلیم کیا جائے۔ اس پارٹی کی یہ رائے ہے اور یہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو مشورہ دیتی ہے کہ وہ اس سنگین بحران کے موقع پر ایک قومی حکومت کے قیام کے امکانات کو قربان کر دے کیونکہ ہندوستان کی وحدت پر مشتبہ فائدے کا تنازع کھڑا کرنا نہایت غیر دانشمندانہ پالیسی ہے اور اب کم برائی کو منتخب کرنا اور مسلم لیگ کے علیحدگی کے مطالبے کو تسلیم کرنا بہت ضروری ہو چکا ہے۔"

(ہندوستان کا حصول آزادی، صفحات ۶۸ ـ ۶۷)

کانگریسی ارکان نے اس پر شدید احتجاج کیا کہ ورکنگ کمیٹی کا ایک رکن خود کو ایسی

قرارداد سے وابستہ کر رہا ہے جو کانگریس کی اعلان کردہ پالیسی کے اس قدر خلاف ہے اگرچہ یہ ان (راج گوپال) کی طرف سے ڈسپلن کی سنگین خلاف ورزی تھی لیکن ان کے خلاف اس ضمن میں ضابطے کی کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ انہوں نے بہرطور ورکنگ کمیٹی اور صدر کی مشاورت کے بغیر اپنے اس اقدام پر گہرے افسوس کا اظہار کیا اور ورکنگ کمیٹی سے مستعفی ہو گئے۔

راج گوپال اچاریہ کسی خیال کی گرفت میں آنے پر خاموش رہنے والے انسان نہ تھے۔ اب انہوں نے گاندھی جی کی دلچسپی اپنے منصوبے پر مرتکز کرنے کی کوشش کی اور اس میں بے حد کامیاب رہے۔ پیارے لال نے اپنی کتاب "مہاتما گاندھی۔۔۔ آخری دور" کی جلد اول کے صفحات ۶۹ ۔ ۶۸ پر ان کوششوں کا تذکرہ مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے۔

"اگست ۱۹۴۲ء میں کانگریس کے لیڈروں کی گرفتاری کے بعد سے راجہ جی مسلسل کانگریس اور مسلم لیگ میں مفاہمت پیدا کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے تاکہ سیاسی جمود کا کوئی حل نکالا جا سکے (راجہ جی کو "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کی اعلانیہ مخالفت کی وجہ سے گرفتار نہیں کیا گیا تھا) دور خرد کے ایک دانشور بچے ہونے کے ناطے انہیں اپنی قائل کرنے کی اہلیت پر بے پناہ بھروسہ تھا۔ راجہ جی نے محسوس کیا کہ اگر کانگریس اور مسلم لیگ کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر لے آیا جائے تو ہندوستان کی آزادی فوراً حاصل کی جا سکتی ہے۔ انہوں نے خود کو مزید قائل کیا کہ اگر کانگریس، مسلم لیگ کا یہ مطالبہ تسلیم کر لے کہ مسلم اکثریت کے علاقوں میں مسلمانوں کو حق خودارادی دیا جائے تو مسلم لیگ آزادئ ہند کے مطالبے میں کانگریس کی ہمنوا بن جائے گی اور انگریز طاقت کے لئے اس مشترکہ مطالبے کو مسترد کرنا ممکن نہیں ہو گا۔

"مصالحتی کیمپ میں گاندھی جی کے روزے کی وجہ سے جیل کے دروازے مجبوراً

عارضی طور پر کھولنے پڑے اور راجہ جی نے ان کے سامنے اپنا یہ فارمولا پیش کرنے کا موقع حاصل کر لیا کہ جو انہوں نے مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان معاہدے کے لئے وضع کیا تھا۔ بعدازاں راجہ جی فارمولے کے نام سے مشہور ہونے والے اس خاکے کے نمایاں خطوط یہ تھے۔

۱۔ مسلم لیگ کو آزادی کے ہندوستانی مطالبے کی حمایت کرنی چاہئے اور عبوری دور کے لئے عارضی عبوری (نگران) حکومت کے قیام میں کانگریس سے تعاون کرنا چاہئے۔

۲۔ جنگ کے خاتمے کے بعد کانگریس ایک ایسا کمیشن مقرر کرنے پر رضامند ہو گی جو ہندوستان کے ان شمال مغربی اور شمال مشرقی متصل اضلاع کی حدبندی کرے گا جہاں مسلمان مکمل اکثریت میں ہیں۔

۳۔ ان علاقوں کے باشندوں میں بالغ رائے دہی یا کسی مساوی ذریعے سے استصواب رائے کروایا جائے گا جو ہندوستان سے علیحدگی کے مسئلے کا فیصلہ کرے گا۔ اگر اکثریت ہندوستان سے علیحدہ خودمختار ریاست کے قیام کے حق میں فیصلہ دے گی تو اس فیصلے پر عمل درآمد کیا جائے گا۔

۴۔ علیحدگی کی صورت میں دفاع' تجارت' مواصلات اور دیگر اہم امور کو تحفظ دینے کے لئے باہمی معاہدہ کیا جائے گا۔

۵۔ یہ شرائط صرف اس صورت میں قابل عمل ہوں گی اگر برطانیہ' ہندوستان کی حکومت کے لئے مکمل اختیارات اور ذمہ داریوں کا انتقال کرے۔

"گاندھی جی نے لمحہ بھر سوچے بغیر ان تجاویز کی منظوری دے دی۔ ان کی رضامندی سے لیس ہو کر راجہ جی مسلم لیگ کے صدر جناح کے پاس پہنچے۔"

۶ مئی ۱۹۴۴ء کو قید سے رہائی کے بعد اس سلسلے میں پہلا قدم گاندھی جی نے خود اٹھایا اور جناح کو خط لکھا کہ وہ راجہ جی فارمولے پر بات چیت کے لئے ان سے ملاقات

کرنا چاہتے ہیں۔ یاد رہے کہ ۳۸ ۔ ۱۹۳۷ء کے دوران جناح نے گاندھی جی کو خط پر خط لکھے تھے کہ وہ ہندو مسلم مسائل پر ان سے ذاتی گفت و شنید کرنا چاہتے ہیں لیکن گاندھی جی نے اس وقت جناح کی درخواست پر سرمو غور نہیں کیا بلکہ انہیں پہلے مولانا آزاد سے رابطہ قائم کرنے کے لئے کہا۔ اب پہیہ پوری طرح گھوم چکا تھا اور یہ گاندھی جی تھے جو جناح سے مذاکرات کے متمنی تھے۔ پیارے لال نے جو گاندھی جی کے سوانح نویس تھے ان کے متعلق کتاب ''آخری دور'' کی جلد اول کے صفحہ ۹۹ پر ان وجوہ کا تذکرہ کیا ہے جن کی بناء پر گاندھی جی نے جناح کے ساتھ راجہ جی کی پاکستان کی پیشکش از سرنو دھرانے میں پیش رفت کی۔

''گاندھی جی نے راجہ جی کے فارمولے کی منظوری کیونکر دی اور انہیں مطالبہ پاکستان تسلیم کرنے کی ہمت کیسے ہوئی؟ کیا انہوں نے تقسیم کی تجویز اور ہندوستان کے بٹوارے کو گناہ قرار نہیں دیا تھا؟ کچھ نقادوں نے پوچھا گاندھی جی نے وضاحت کی کہ انہوں نے جس چیز سے اتفاق کیا تھا وہ اس اصول خود اختیاری کے سوا اور کچھ نہ تھی جسے خود کانگریس ورکنگ کمیٹی مان چکی تھی۔ اس کا مفہوم ان علاقوں کو علیحدہ ہونے کا حق دینا تھا جو یہ چاہتے وہ بھی ان علاقوں کے باشندوں کی خواہشات کی ایک موزوں طور پر منعقدہ استصواب کے ذریعے یقین دہانی کے بعد ملکی تحفظ' سالمیت اور اقتصادی ترقی بطور وحدت قائم رہتی۔۔۔۔۔۔

''راجہ جی فارمولے نے مسلم لیگ کے مطالبے کا نچوڑ اس حد تک تسلیم کر لیا تھا جس حد تک وہ معقول تھا۔ گاندھی جی نے کہا کہ اگر اس (علیحدہ وحدت) کا نام پاکستان رکھا جائے تو انہیں اس پر قطعاً اعتراض نہیں ہے۔۔۔۔

''اگر اس کا مقصد ایک ایسی اکائی کو تشکیل دینا ہے جہاں مسلم مذہب اور ثقافت کو ترقی کا بھرپور موقع حاصل ہو اور جہاں مسلم فرقے کے رہنماؤں کی صلاحیتوں اور شخصیات کو اظہار کا موقع اس خوف کے بغیر مل سکے کہ غیر منقسم ہندوستان میں وہ اپنے سے زیادہ

باصلاحیت افراد سے دب جائیں گے' تو ان (راجہ جی) کا فارمولا ان تمام مقاصد اور مطالبات کو پورا کرتا ہے۔۔۔۔۔"

"انہوں نے جناح کی استقامت' ان کی عظیم قابلیت اور اس دیانتداری کا بھرپور احترام کیا جسے کوئی خرید نہیں سکتا تھا۔ یقیناً جناح جیسا محبت وطن ایسی آزادی کو پسند نہیں کرے گا جو بھائی کو بھائی سے جنگ میں الجھا دے۔۔۔۔۔ اسی لئے انہوں نے (راجہ جی نے) ان (جناح) کے در پر دستک دی ہے' اپنے پتے جانچ کے لئے ان کے حوالے کئے ہیں اور انہیں کسی ذہنی ہچکچاہٹ یا احتیاط کے بغیر اپنے پتے دکھانے کی التجا کی ہے۔۔۔۔"

۱۷ جولائی کو گاندھی جی نے گجراتی زبان میں مندرجہ ذیل خط جناح کو لکھا:

"برادر جناح! ایک وقت تھا جب میں آپ کو مادری زبان بولنے پر راغب کرنے کے قابل تھا۔ آج میں آپ کو مادری زبان میں خط لکھنے کی زحمت کر رہا ہوں۔ میں جیل سے اپنے دعوت نامے میں پہلے ہی اپنی اور آپ کی ملاقات کی تجویز پیش کر چکا ہوں لیکن رہا ہونے کے بعد میں نے آپ کو کوئی خط نہیں لکھا تھا۔ آج میں محسوس کر رہا ہوں کہ مجھے جلدی یہ کرنا چاہئے۔ آیئے جہاں آپ چاہتے ہیں وہاں ملاقات کریں۔ مجھے اسلام یا ہندوستان کے مسلمانوں کا دشمن تصور نہ کریں۔ میں ہمیشہ آپ کا اور انسانیت کا دوست اور خادم رہا ہوں۔ مجھے مایوس نہ کریں۔

آپ کا بھائی

"گاندھی" (تندولکر' جلد ٦' صفحہ ٢٦٨)

اس خط کا جواب سری نگر کشمیر سے جناح نے فوراً انگریزی زبان میں دیا' جہاں وہ بحالی صحت کے لئے مقیم تھے۔ خط کا متن کچھ اس طرح سے تھا:

"میں واپسی پر بمبئی میں اپنے گھر میں آپ سے ملاقات کر کے بے حد مسرور ہوں گا۔ میری واپسی غالباً وسط اگست تک ہو گی۔ مجھے امید ہے کہ اس وقت تک آپ کی صحت پوری طرح بحال ہو چکی ہو گی اور آپ بھی بمبئی واپس آ جائیں گے۔ ملاقات سے

پہلے میں کچھ کہنا پسند نہیں کروں گا۔ میں اخبار میں یہ پڑھ کر بے حد خوش ہوں کہ آپ تیزی سے بہتر ہو رہے ہیں، مجھے امید ہے کہ آپ جلد بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔"

(ایضاً)

راجہ جی کی ابتدائی بات چیت، ان کے فارمولے اور گاندھی جی کی منظوری سے جناح کے ذہن میں امید پیدا ہوئی کہ گاندھی جی پاکستان کے متعلق بات کو حتمی شکل دینے پر مائل ہو رہے ہیں۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۴ء کو ایک اخباری بیان میں جناح نے گاندھی جی کے لئے "مہاتما" کا لفظ استعمال کیا اور درخواست کی کہ کانگریس اور لیگ کے درمیان معاملات نزاع پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کیا جائے۔ انہوں نے کہا۔۔۔۔۔ "یہ ایک ملک گیر خواہش رہی ہے کہ ہمیں ملنا چاہئے۔ اب جب کہ ہم ملنے والے ہیں ہماری مدد کریں۔ ہم معاملے کو سلجھانے کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ ماضی کو دفن کر دیں" لیکن جناح کی بیماری کی وجہ سے دونوں رہنماؤں کی ملاقات کچھ موخر ہو گئی۔ بالآخر ۹ ستمبر کو یہ ملاقات مالا بار ہل میں جناح کی رہائش گاہ پر ہوئی۔ جناح بے حد پرامید تھے ان کا مزاج گرمجوشی اور خوشگواری سے مملو تھا۔ وہ گاندھی جی کو لینے کے لئے پورچ میں آئے اور واپسی پر انہیں کار تک چھوڑ کر آئے۔ دونوں نے اکٹھے تصویر بنوائی جس میں جناح بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ ان کے درمیان مذاکرات ۱۸ دن تک جاری رہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ خوشگوار تاثر زائل ہونے لگا۔ دونوں محتاط ہونے لگے اور اس بات کا انتظام کیا گیا کہ ہر ملاقات کے بعد ان کی بات چیت کی خطوط کے تبادلے کے ذریعے تصدیق کی جائے کئی روز ہر قسم کی غیر متعلقہ اور علمی گفتگو جاری رکھنے کے بعد انہوں نے حقیقی مسئلے کو عملی انداز میں چھیڑا اور تقسیم کے اصل موقعے پر صوبوں کی (جغرافیائی) حد بندی اور جوڑ توڑ پر بات چیت کی۔ ۲۴ ستمبر کو گاندھی جی کی جانب سے لکھے جانے والے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کانگریس اور پورے ملک کو ہدایت جاری کرنے پر تیار تھے کہ ہندوستان کو دو الگ خود مختار ریاستوں میں تقسیم کرنے کا مطالبہ تسلیم کر لیا جائے۔ گاندھی جی کے مذکورہ خط کے اقتباسات درج

ذیل ہیں۔

۱۔ میں اس مفروضے سے آغاز کرتا ہوں کہ ہندوستان کو دو یا زیادہ اقوام نہ سمجھا جائے بلکہ متعدد ارکان پر مشتمل ایک خاندان تصور کیا جائے جس میں سے شمال مغربی زونوں کے رہنے والے مسلمان باقی ہندوستان سے علیحدہ رہنے کے خواہشمند ہیں۔ ان حصوں میں بلوچستان' سندھ' شمال مغربی سرحدی صوبہ اور پنجاب' آسام اور بنگال کے وہ ٹکڑے شامل ہیں جہاں مسلمان تمام دیگر عناصر کے مقابلے میں مطلق اکثریت میں ہیں۔

۲۔ ان علاقوں کی حد بندی ایک ایسے کمیشن کے ذریعے ہونی چاہئے جسے کانگریس اور لیگ دونوں کی منظوری حاصل ہو ان علاقوں کے باشندوں کی خواہشات کی یقین دہانی حاصل کرنے کے لئے بالغ رائے دہی یا کوئی دوسرا مساوی طریقہ اپنایا جائے۔

۳۔ اگر رائے دہی علیحدگی کے حق میں ہو تو ان علاقوں کو ہندوستان کے غیر ملکی تسلط سے آزاد ہوتے ہی جلد از جلد علیحدہ ریاست کی شکل دے دی جائے تاکہ بعد میں دو آزاد اور خودمختار ریاستیں تشکیل دی جا سکیں۔

۴۔ ایک ایسا معاہدہ علیحدگی بھی ہونا چاہئے جو امور خارجہ' دفاع' داخلی مواصلات' کسٹم' تجارت اور دیگر شعبوں میں معیاری اور اطمینان بخش انتظام فراہم کرے۔ اس معاہدے کی رو سے فریقین کے مابین مشترکہ مفادات کے امور میں تعاون جاری رہنا چاہئے۔

(جناح از ہیکٹر بولیتھو' صفحات ۱۴۹ - ۱۴۸)

لیکن جناح اور گاندھی کے مذاکرات مندرجہ بالا تیسرے نکتے پر شکست و ریخت کا شکار ہو گئے۔ گاندھی جی کا موقف تھا کہ پہلے مرحلے میں دونوں فریقوں کو متحدہ جدوجہد کے ذریعے تیسری قوت کو نکال باہر کرنا چاہئے۔ اس طرح جب ہندوستان غیر ملکی تسلط سے

آزاد ہو جائے گا پھر باہمی سمجھوتے اور معاہدے کے تحت دو علیحدہ ریاستیں قائم کی جا سکیں گی جو ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کی قرارداد لاہور میں ظاہر کی گئی خواہش کے مطابق ہوں گی لیکن جناح گاندھی جی کے الفاظ اور کانگریس پر بھروسہ کرنے کے لئے تیار نہ تھے کہ وہ انگریزوں کے ہندوستان سے رخصت ہو جانے کے بعد انہیں پاکستان دے دیں گے۔ وہ اپنا پاکستان فوراً اسی وقت حاصل کرنا چاہتے تھے اس سے قبل کہ غیر ملکی حکمران ہندوستان چھوڑ کر جائیں۔ انہوں نے کہا کہ علیحدگی ہر حال میں پہلے ہونی چاہئے اور بعد میں مشترکہ مفادات کے امور ایک معاہدے کے ذریعے کئے جائیں۔ اس موقعے پر گاندھی جی نے جناح کو مطمئن کرنے کی جو کوششیں کیں ان کے متعلق ھائرن مکرجی اپنی کتاب "گاندھی جی" کے صفحہ ۱۶۰ پر لکھتے ہیں۔

"اگر اسی طرح کی کوششیں اس سے قبل مسلمانوں کی اکثریت کو علیحدگی پسندانہ رجحانات سے روکنے کے لئے کی جاتیں اور ان میں استقامت اور مستقل مزاجی کا مظاہرہ کیا جاتا تو غالباً ہندوستان کی تقسیم کو روکا جا سکتا تھا لیکن اب مسلم لیگ کے اس طوفان پر بند باندھنے میں بہت دیر ہو چکی تھی جو امپریلزم کی بھرپور حمایت سے بے قابو ہو چکا تھا۔ گاندھی نے لیگ کی قرارداد لاہور ۱۹۴۰ء کے متعلق جو اچھے الفاظ اب کہے تھے اگر یہی ۳ برس پہلے کہے ہوتے تو مسلمانوں کے ذہنوں پر جذباتی فتح حاصل کی جا سکتی تھی اور جناح کا سحر جو بے طرح بڑھ چکا تھا توڑا جا سکتا تھا۔۔۔۔

"معاملات اس حد تک آگے بڑھ چکے تھے اور مزاجوں میں اس قدر تلخی اور اشتعال پیدا ہو چکا تھا کہ یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی جو اگر ۴۲۔۱۹۴۱ء میں کی جاتی تو بے حد موثر ثابت ہوتی۔۔۔۔

مولانا آزاد ان جناح۔ گاندھی مذاکرات کے بے حد خلاف تھے۔ ان کی رائے یہ تھی

"میرے خیال میں اس موقعے پر گاندھی جی کی جناح کی جانب یہ پیش رفت ایک

فاش سیاسی غلطی تھی۔ اس سے مسٹر جناح کو نئی اور مزید اہمیت حاصل ہو گئی جس سے بعد ازاں انھوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔۔۔۔۔ مسٹر جناح اپنی بیشتر سیاسی وقعت ۲۰ء کی دہائی میں کانگریس کو چھوڑنے کے بعد کھو چکے تھے۔ زیادہ تر گاندھی جی ہی کی کردہ اور ناکردہ حرکات کی وجہ سے ہندوستان کی سیاسی زندگی میں مسٹر جناح نے اپنی اہمیت دوبارہ حاصل کی"

(ہندوستان کا حصول آزادی، صفحہ ۹۳)

۱۸ دن جاری رہنے والی طویل گاندھی جناح بات چیت ۲۷ ستمبر کو کانگریس کے لئے کسی سود مند نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہو گئی۔ جب کہ دوسری جانب جناح کے لئے یہ ایک واضح فتح تھی کیونکہ انھوں نے پاکستان کی جنگ آدھی سے زیادہ جیت لی تھی۔ اس سے جناح کی پوزیشن اور وقار میں اضافہ ہو گیا اور مسلم لیگ کی کاز بے حد مضبوط ہو گئی۔ پنجاب کی تقسیم کے امکان سے وہاں کے ہندو اور سکھ بے طرح پریشان ہو گئے۔ اسی طرح بنگال کی ایک اور تقسیم سے وہاں کے ہندو سخت خوفزدہ ہو گئے۔ پنجاب اور بنگال کے سکھوں اور ہندوؤں نے محسوس کیا کہ راجہ جی۔ گاندھی سکیم انہیں تباہی کی طرف دھکیل رہی ہے۔ سا ور کر چلا اٹھے کہ ہندوستان کے صوبے راجہ جی اور گاندھی جی کی ذاتی جاگیر نہیں ہیں جنہیں وہ تحفے کے طور پر جسے چاہیں دے دیں۔

باب نمبر 27

شملہ کانفرنس۔۔۔۔ جناح کی ضد (ہٹ دھرمی) ۱۹۴۵ء

جناح گاندھی مذاکرات کی ناکامی کے بعد لیگ اور کانگریس کے درمیان متفقہ آئینی معاہدے کے لئے ایک اور کوشش کی گئی۔ ۱۹۴۴ء سے کانگریس کے ارکان نے ایک مرتبہ پھر بھولا بھائی ڈیسائی کی قیادت میں مرکزی مجلس قانون ساز میں شرکت شروع کر دی۔ اس وقت اسی مجلس میں مسلم لیگ کے ڈی فیکٹو قائد لیاقت علی خاں تھے۔ دونوں فرقہ وارانہ مسئلے کا حل چاہتے تھے تاکہ دونوں پارٹیاں مرکز میں عبوری حکومت کے قیام میں شرکت کر سکیں۔ لارڈ ویول نے دونوں کے درمیان مذاکرات جاری رکھنے کی حوصلہ افزائی کی۔ انہیں امید تھی کہ مرکز میں مخلوط عبوری حکومت کے قیام سے دونوں پارٹیوں کے درمیان طویل المدت اور بہتر ہم آہنگی کے لئے فضا سازگار ہو گی۔ دونوں رہنما کچھ عارضی نتائج پر متفق ہوئے جنہیں ڈیسائی لیاقت علی معاہدہ کہا جاتا ہے۔ اس کے نمایاں خطوط کے مطابق کانگریس اور لیگ دونوں مرکز میں ایک حکومت قائم کریں گی جو دونوں جماعتوں کے یکساں نامزد کردہ افراد پر مشتمل ہو گی۔ اقلیتوں مثلاً سکھوں اور شیڈولڈ کاسٹوں کے نمائندوں کو بھی حکومت میں شامل کیا جائے گا۔ اس طرح بننے والی عبوری حکومت موجودہ آئینی ڈھانچے کے تحت ہی کام کرے گی اور گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف کے علاوہ انتظامی کونسل کے جملہ ارکان ہندوستانی باشندے ہوں گے۔ جنوری ۱۹۴۵ء کے پہلے ہفتے میں ڈیسائی سیوا گرام گئے اور پوری تصویر گاندھی جی کے سامنے پیش کی۔ گاندھی جی نے کہا کہ اگرچہ وہ اس پر یقین نہیں رکھتے کہ آزادی پارلیمانی کارروائیوں کے ذریعے حاصل کی جا سکتی ہے لیکن پھر بھی وہ بھولا بھائی کی پیش رفت کو سراہتے ہیں اور اپنا کام جاری رکھنے کے لئے ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان یہ طے پایا کہ کسی مناسب موقعے پر گاندھی جی ورکنگ کمیٹی کو آگاہ کر دیں گے کہ بھولا بھائی نے

سب کچھ ان کی رضامندی سے کیا (ملاحظہ فرمایئے' مہاتما گاندھی۔۔۔۔۔ آخری دور از پیارے لال صفحات ۱۲۴۔ ۱۲۳)

ڈیسائی۔ لیاقت علی مذاکرات جو بے حد امید افزاء انداز میں شروع ہوئے تھے انتہائی ناگواری میں ختم ہوئے۔ جناح نے ایک عوامی بیان میں کہا کہ وہ بھولا بھائی اور لیاقت علی کے مذاکرات کے متعلق کچھ نہیں جانتے اور لیاقت علی نے اپنی تجاویز لیگ کی جانب سے کسی اختیار کے بغیر پیش کی ہیں۔ لیاقت نے بھی انکار کر دیا کہ ان کے اور بھولا بھائی ڈیسائی کے درمیان کوئی "معاہدہ" ہوا ہے۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۴۵ء کو ایک اخباری بیان میں لیاقت علی نے کہا۔

"مسٹر ڈیسائی اچھی طرح جانتے ہیں کہ کوئی "معاہدہ" نہیں ہوا بلکہ محض کچھ تجاویز صرف بات چیت کی بنیاد پر پیش کی گئیں۔" لیاقت علی کی جان بخشی تو محض اپنے لیڈر کے ایک انتباہ ہی سے ہو گئی لیکن بھولا بھائی کے لیے یہ واقعہ ان کے سیاسی کیریئر کے خاتمے کا سبب بن گیا اور وہ ایک شکستہ دل لے کر دنیا سے چل بسے۔ کانگریس کی ہائی کمان خصوصاً سردار پٹیل نے قید سے رہائی سے بعد بھولا بھائی کی اس کارروائی کا شدید نوٹس لیا۔ بھولا بھائی نے بتایا کہ انہوں نے لیاقت علی کے ساتھ مذاکرات گاندھی جی کے علم اور ان کی تحریری اجازت سے کیے تھے۔ فی الحقیقت بھولا بھائی کے دلائل صفائی کے خلاف کوئی جواب نہیں تھا جنہوں نے ہر کام پورے خلوص اور حسن نیت سے کیا اور ہمیشہ مذاکرات کی مکمل تصویر گاندھی جی کے سامنے پیش کی۔ انہوں نے کچھ بھی ناجائز طریقے سے نہیں کیا لیکن اس کے باوجود ان پر لیگ کے ساتھ سازش میں شریک ہونے کا الزام لگایا گیا اور انہیں اگلے عام انتخابات کے لئے ٹکٹ دینے سے انکار کر دیا گیا۔ کانگریس ہائی کمان کی جانب سے ایک وفادار کارکن کو یہ صلہ دیا گیا جس نے لیڈروں کی حراست کے دوران آزادانہ سوچ رکھنے کی ہمت کی تھی۔ بھولا بھائی عوامی سطح پر یہ بدنامی برداشت نہ کر سکے اور بہت جلد حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کر گئے۔

بھولا بھائی ڈیسائی کو لیاقت ڈیسائی پیکٹ میں کردار ادا کرنے پر اس بری طرح سزا کیوں دی گئی؟ اس کی وجہ ان کا وہ کردار تھا جو انہوں نے آئی این اے کے مقدمے میں ادا کیا تھا جہاں ڈیفنس کونسل میں انہوں نے یادگار تقریر کی تھی اور قوم کی توجہ آئی این اے کے اس عظیم کردار کی جانب مبذول کروائی تھی جو اس نے سبھاش چندر بوس کی قیادت میں ادا کیا۔ بھولا بھائی کی جانب سے سبھاش چندر بوس کی اس قدر بھرپور تعریف اور ان کی پر اثر قیادت کو خراج تحسین غالباً گاندھی جی اور سردار پٹیل دونوں کو نہیں بھایا۔

راج گوپال اچاریہ نے بھی جناح کو پاکستان کی پیشکش کانگریس سے مشاورت کے بغیر کی تھی۔ لیکن ان کے ساتھ کچھ خاص نہیں ہوا۔ انہیں محض ورکنگ کمیٹی کی نشست سے مستعفی ہونا پڑا۔ ۱۹۲۰ء میں خود گاندھی جی نے اپنی تحریک عدم تعاون کانگریس سے مشورہ کئے بغیر شروع کی تھی۔ جب پنڈت مدن موہن مالویہ نے گاندھی جی کے اس طرز عمل کے خلاف احتجاج کیا تو انہوں نے جواب دیا۔

"میری حقیر رائے کے مطابق یہ کسی کانگریسی رکن کا فرض نہیں کہ وہ کوئی ایسا اقدام کرنے سے پہلے کانگریس سے مشورہ لے جس کے متعلق اسے کوئی شک و شبہ نہ ہو۔ بصورت دیگر اس کا مطلب انحطاط کا شکار ہونا ہے۔"

"کانگریس کے ہر رکن اور ہر عوامی ادارے کا یہ حق ہے بلکہ بعض اوقات تو یہ ان کا فرض ہے کہ وہ اپنی رائے کا اظہار کریں، حتیٰ کہ اس پر عمل کریں اور کانگریس کے فیصلے کا بھی انتظار نہ کریں۔ بلاشبہ یہ قوم کی خدمت کا بہترین انداز ہے۔"......

(تندولکر، جلد ۲، صفحات ۲،۳)

اس واقعے پر مولانا آزاد لکھتے ہیں۔

"اس سے بھولا بھائی کو شدید دھچکا لگا اور ان کی صحت متاثر ہوئی ----- وہ محسوس کرتے تھے کہ انہوں نے پوری وفاداری سے کانگریس کی خدمت کی ہے اور اس کی خاطر تکلیفیں برداشت کی ہیں جس کا واحد انعام انہیں مسترد کیے جانے اور بے عزتی کی صورت

میں ملا ہے ----- اس مرتبہ میں بمبئی گیا ----- انہیں شدید ترین صدمہ اس بات پر تھا کہ گاندھی جی نے تمام حقائق جاننے کے باوجود نقادوں کے سامنے ان کی صفائی پیش نہیں کی ----- میں نے ان کی تالیف قلب کی کوشش کی لیکن یہ بے سود تھی۔ اس کے بعد جلد ہی بھولا بھائی حرکت قلب بند ہو جانے سے چل بسے۔ میں جب بھی اس واقعے کو یاد کرتا ہوں گہرا دکھ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کیونکہ بھولا بھائی نے بہت عمدگی سے کانگریس کے لئے خدمات انجام دی تھیں اور انہیں بلا جواز سزا دی گئی"

(ہندوستان کا حصول آزادی' صفحہ ۱۴۷)

لارڈ ویول پہلی عالمی جنگ کے عظیم عسکری لیڈر فیلڈ مارشل لارڈ ایلن بائی کے مداح' سوانح نویس اور پیروکار تھے۔ اس جنگ کے بعد یہ لارڈ ایلن بائی ہی تھے جو مصر میں برطانیہ کے ہائی کمشنر مقرر ہوئے اور انہوں نے لائیڈ جارج اور دیگر سیاسی رہنماؤں کو مصر کو آزادی دینے کے لئے قائل کیا۔ لارڈ ویول بھی اپنے پرانے گرو کے نقش قدم پر چلنا چاہتے تھے اور ہندوستان کو آزادی دینے کے لئے انہی کے اصولوں پر عمل کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ہی بھولا بھائی ڈیسائی اور لیاقت علی کی مذاکرات میں حوصلہ افزائی کی تھی۔ جب ڈیسائی لیاقت بات چیت ناکامی پر منتج ہوئی تو انہوں نے خود میدان سنبھال لیا۔ ان کا پہلا قدم' ونسٹن چرچل سے براہ راست رابطہ تھا جو اس وقت وزیراعظم تھے۔ ویول نے انہیں ایک ذاتی خط لکھا۔ اس خط کے متعلق وی پی مینن لکھتے ہیں۔

"مجھے اس عظیم دستاویز کو دیکھنے کا موقع حاصل ہوا۔ اس میں انہوں نے بہت جراتمندی اور صاف گوئی سے اس وقت کی سیاسی صورتحال پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور حالات میں تبدیلی پر سختی سے زور دیا۔ ایک ایسی تبدیلی جو اوسط تعلیم یافتہ ہندوستانی شہری کو قائل کر دے کہ حکومت برطانیہ اپنے ارادوں میں مخلص ہے اور ہندوستان کے لئے دوستانہ جذبات رکھتی ہے۔"

(انتقال اقتدار صفحہ ۱۷۱)

لارڈ ویول کا نقطہ نظر اور ہندوستانی سیاسی صورتحال کا تجزیہ فوجی زاویے سے تھا۔ اگر ہندوستان کے ہندو اور مسلمان رہنماؤں دونوں نے ملک کا فوجی دفاع مد نظر رکھا ہوتا تو وہ ملک کی تقسیم کے لئے اپنی مجنونانہ کاروائیاں روک دیتے۔ ہندوستان کے دفاع کے نقطہ نظر سے اس کی تقسیم ہولناک ترین واقعہ ہوتی۔ سیاسی نقطہ نگاہ سے بھی کسی ملک کا دفاع دیگر تمام چیزوں پر مقدم ہوتا ہے۔ ایک سپاہی کی حیثیت سے لارڈ ویول نے محسوس کر لیا کہ ہندوستان کے دفاع کا تقاضا یہی ہے کہ اسے لازماً ایک سیاسی اور انتظامی وحدت رہنا چاہئے۔ مرکزی مجلس قانون ساز کے سامنے تقریر کرتے ہوئے لارڈ ویول نے کہا۔

"آپ جغرافیے کو نہیں بدل سکتے۔ دفاعی نقطہ نظر سے' خارجی تعلقات اور متعدد داخلی وخارجی اقتصادی مسائل کے حوالے سے ہندوستان ایک فطری اکائی یا وحدت ہے۔ دو مذاہب حتیٰ کہ دو قومیں بھی اپنے ثقافتی اور مذہبی اختلافات کے باوجود اکٹھی رہ سکتی ہیں۔ اس ضمن میں تاریخ متعدد مثالیں فراہم کرتی ہے۔"

"لارڈ ویول کو امید تھی کہ اگر وہ ایک عبوری حکومت میں مختلف پارٹی لیڈروں کو اکٹھے کام کرنے پر رضامند کرنے کے قابل ہو سکے تو وہ تحمل اور سمجھداری سے انہیں کسی ایسے معاہدے کے لئے قائل کر لیں گے جس سے ہندوستان کی وحدت برقرار رہے۔ انہیں امید تھی کہ بعض مسائل جیسے جاپان کے خلاف جنگ کا کامیابی سے خاتمہ' بعد از جنگ ہندوستان کی زرعی اور صنعتی ترقی کے لئے منصوبہ سازی وغیرہ ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں کی سوچ میں حقیقت پسندی کا شعور پیدا کریں گے اور وہ مسائل کے اس انبوہ سے آگاہ ہوں گے جس کا ہندوستان کو سامنا ہے۔ اس طرح روز روز کی ذاتی چپقلشوں کی بجائے نئے انتظامی مسائل اور ان کے حل کے لئے اکٹھے کام کرنے کے نتیجے میں ان کے اندر ایک تعمیری اور رواداری پر مبنی نقطہ نظر پیدا ہو گا"

(پاکستان از خالد بن سعید' صفحات ۷-۱۳۶)

اس طرح اپنی حتی الامکان درست اور نیک تمناؤں کے ساتھ لارڈ ویول نے شملہ میں ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں کی ایک کانفرنس طلب کی جس کے لئے وہ پہلے ونسٹن چرچل سے اجازت لے چکے تھے۔ خوشگوار سیاسی فضاء قائم کرنے کے لئے لارڈ ویول نے ۱۵ جون ۱۹۴۵ء کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ان تمام ارکان کو رہا کر دیا جنہیں "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کے ایام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ شملہ کانفرنس نے اپنی کارروائی کا آغاز ۲۵ جون ۱۹۴۵ء کو کیا۔

انتہائی دلچسپ امر یہ ہے کہ کانفرنس کے مدعوئین کی پہلی فہرست میں کانگریس کے صدر مولانا آزاد کا نام شامل نہیں تھا لیکن اس غلطی کی تصحیح گاندھی جی نے خود کروائی۔ اپنی افتتاحی تقریر میں وائسرائے نے تجویز پیش کی کہ جنگ کے اختتام تک ایک عبوری انتظام کے طور پر وائسرائے کی کونسل کے تمام ارکان ہندوستانی باشندوں پر مشتمل ہوں گے صرف کمانڈر انچیف اور وائسرائے خود غیر ہندوستانی ہوں گے اور جنگ کے خاتمے کے بعد ہندوستان اپنا دستور خود تشکیل دینے کے لئے آزاد ہو گا۔ اس کانفرنس میں جناح کا رویہ سخت پر غرور تھا اور وہ مولانا آزاد سے سخت ناشائستگی سے پیش آئے۔ اور بات چیت کے لئے ان کے ساتھ ایک میز پر بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ بعد ازاں انہوں نے مذاکرات میں فرقہ واریت کا زہر گھولا اور فرقہ وارانہ مسئلے پر بے حد انتہاپسندانہ انداز اختیار کیا۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہو گا کہ جناح چاہتے تو شملہ کانفرنس میں فرقہ وارانہ مسئلے کا خوشگوار حل نکل سکتا تھا۔ جناح نے یہ بے لچک رویہ اپنایا کہ کانگریس کو وائسرائے کی کونسل میں کسی مسلمان کو نامزد کرنے کا کوئی حق نہیں ہونا چاہئے اور یہ اختیار صرف مسلم لیگ کو یا بالفاظ دیگر صرف جناح کو ہونا چاہئے۔ وائسرائے نے کہا کہ یہ جناح کی جانب سے ایک غیر معقول مطالبہ ہے جس پر جناح نے کہا کہ اگر ان کے مطالبے کو غیر عقلی کہا گیا تو مسلم لیگ کانفرنس سے تعاون نہیں کرے گی۔

اجلاس میں موجود کانگریسی نمائندوں نے مفاہمت کی خواہش میں آخری حد تک

رعایتیں دینے پر آمادگی ظاہر کی۔ وہ وائسرائے کی انتظامی کونسل میں شیڈولڈ کاسٹ ہندوؤں اور مسلمانوں کو برابر نمائندگی دینے پر رضامند ہو گئے۔ اس کے باوجود جناح مطمئن نہیں ہوئے اور اپنے موقف سے ایک انچ نہیں ہٹے، نتیجتاً کانفرنس کو ترک کرنا پڑا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کانفرنس کو سبوتاژ کرنے میں چرچل کا ہاتھ تھا یا نہیں، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے۔ حقائق جو بھی رہے ہوں، لارڈ ویول نے کانفرنس کی ناکامی کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لے لی۔ کانفرنس کو منسوخ کر کے انہوں نے اپنے مقصد کی کمزوری ظاہر کی۔ اگر انہیں یقین تھا جس کا انہوں نے کھل کر اظہار بھی کیا کہ جناح کا مطالبہ غیر معقول ہے تو انہوں نے اپنے ہی مقصد کی پیروی کیوں نہیں کی اور اس کے مطابق عمل کیوں نہیں کیا؟ اگر انہوں نے ایسا کیا ہوتا تو یقیناً انہیں تمام غیر لیگی بلکہ خاطر خواہ تعداد میں لیگی مسلمانوں کی بھی حمایت بھی حاصل ہوتی جن میں دوسروں کے علاوہ لیاقت علی اور حسین امام شامل تھے جو خفیہ طور پر ہندو، مسلم معاہدے کے لئے کوشاں تھے۔ اس بات کا کوئی جواز نہیں تھا کہ لارڈ ویول نے جناح کے جذبات کا غیر ضروری احترام کیوں کیا؟ جب کہ اس وقت جناح کی قیادت کوئی ایسی بلند بام بھی نہ تھی۔ پنجاب میں خضر حیات خان کی یونینسٹ پارٹی حکمران تھی نہ کہ مسلم لیگ، بنگال میں لیگی وزیراعظم خواجہ ناظم الدین کو اسمبلی میں شکست ہو گئی تھی۔ شمال مغربی سرحدی صوبے میں ڈاکٹر خان صاحب کی قیادت میں کانگریسی وزارت حکمران تھی۔ سندھ اور آسام میں بھی لیگ کے حالات ناخوشگوار تھے۔ ان حالات میں لارڈ ویول کے پاس جناح کے غیر معقول مطالبے کو بے جا اہمیت دے کر کانفرنس کو برباد کرنے کا کیا جواز تھا؟ صرف فرقہ پرست مسلمانوں نے جناح کے تصور پاکستان کو مضبوط نہیں کیا بلکہ انگریز بھی اس میں شریک تھے۔ انہوں نے جناح کی فرقہ وارانہ ہٹ کی بے حد حوصلہ افزائی کی جسے وہ اپنے مقاصد کے لئے بے حد مفید پاتے تھے۔ وہ اسے اپنے مقصد کے لئے زندہ رکھنا چاہتے تھے تاکہ گاندھی کی کانگریس کو شکست دے سکیں۔

جب ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو جنگ عظیم کا اعلان کیا گیا تو وائسرائے نے فوری طور پر گاندھی جی اور جناح سے تعاون طلب کیا اور دونوں کو مذاکرات کے لئے مدعو کیا۔ اس واقعے کے حوالے سے جناح نے بعد ازاں کہا۔

"جنگ کے بعد مجھ سے مسٹر گاندھی کا سا سلوک کیا گیا۔ میں حیران رہ گیا کہ کیوں اچانک میرے مرتبے میں اس قدر اضافہ ہوا اور مجھے مسٹر گاندھی کے برابر جگہ دی گئی"

(انتقال اقتدار از مینن، صفحہ ۵۹)

اعلان جنگ کے بعد کانگریس اور گاندھی کی ہٹ دھرمی سے جناح انگریزوں کی سرکاری اور غیر سرکاری ضرورت بن گئے اور انگریزوں نے انہیں سیاسی طور پر اجاگر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بدقسمتی سے جناح سے متاثر ہونے کے باعث کانگریس کے غیر دانشمندانہ ہتھکنڈوں نے بھی جناح کو اپنی طاقت بڑھانے میں بے حد مدد دی۔

شملہ کانفرنس کی ناکامی جناح کی عظیم فتح تھی جس سے ان کے وقار میں بے حد اضافہ ہوا۔ وائسرائے کی جانب سے جناح کے غیر معقول مطالبات کو اعتدال پسند مسلمان سیاستدانوں کے مقابلے میں غیر ضروری اہمیت دینا مسلمانوں کو واضح اشارہ تھا کہ یہ جناح اور صرف جناح ہیں جو ان کے ایماء پر فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فرقہ پرست مسلمانوں کے مرتبے میں بے حد اضافہ ہو گیا اور غیر لیگی مسلمانوں کی پوزیشن بے حد کمزور ہو گئی۔ اس کا اثر پنجاب کی مسلم سیاست پر اتنا برا پڑا کہ اس سے خضر حیات خان کی قیادت گہنا گئی اور لیگ کی طاقت میں بے حد اضافہ ہوا۔ اب جناح پہلی مرتبہ پنجاب کی سیاست میں بھی بلند ترین مقام پر پہنچ گئے۔ شملہ کانفرنس میں ان کی ضد نے انہیں شاندار معاوضہ عطا کیا۔ غیر منقسم ہندوستان کے لئے اپنی تمام تر نیک تمناؤں کے باوجود لارڈ ویول کی ناپختگی مقصد نے ان لوگوں کو طاقت فراہم کی جو ہندوستان کو تقسیم کرنا چاہتے تھے۔

باب نمبر28

کابینہ مشن (۱۹۴۶ء)

۸ مئی ۱۹۴۵ء کو یورپ میں جنگ سرکاری طور پر ختم ہو گئی۔ اس دن جرمنی کی فوجی کمان کے نمائندوں نے ہتھیار ڈالنے کی دستاویز پر دستخط کر دیے۔ فوری طور پر انگلستان میں لیبر پارٹی نے ونسٹن چرچل کی قیادت میں مخلوط حکومت کے خاتمے کا مطالبہ کر دیا۔ جولائی میں عام انتخابات ہوئے اور لیبر پارٹی بر سر اقتدار آ گئی اور اٹیلی وزیر اعظم بن گئے۔ ۵ اگست کو ایٹم بموں کے ذریعے ہیروشیما اور ناگاساکی کی تباہی کے بعد جاپان نے اتحادیوں کے سامنے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیے۔

جونہی لیبر حکومت بر سر اقتدار آئی اس نے ہندوستان کے مسائل حل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے اقتدار سنبھالنے کے بعد ایک ماہ سے بھی پہلے وائسرائے کو لندن طلب کر لیا گیا تاکہ ہندوستان کے پورے مسئلے کا از سر نو جائزہ لیا جا سکے۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد ۱۹ ستمبر کو لارڈ ویول نے حکومت برطانیہ کے ایماء پر ایک پالیسی بیان جاری کیا جس کا متن مندرجہ ذیل ہے۔

"ملک معظم (تاجدار برطانیہ) کی حکومت نے عزم کر رکھا ہے کہ وہ ہندوستانی رہنماؤں کی رائے کے اشتراک سے ہندوستان میں مکمل خود مختار حکومت کے جلد قیام کے لئے اپنی بھرپور کوشش کرے گی۔-----

"شاہ معظم کی حکومت کا ارادہ ہے وہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے ایک آئین ساز ادارے کو طلب کریں -----

"شاہ معظم کی حکومت ایک ایسے معاہدے کے متن کی تیاری پر غور کر رہی ہے جو برطانیہ عظمیٰ اور ہندوستان کے درمیان فیصلے کے لئے ضروری ہو گا۔

مندرجہ بالا اعلانات کرتے ہوئے لارڈ ویول نے اس بات پر زور دیا کہ خود انگلستان میں جنگ کے بعد لا تعداد فوری مسائل کے باوجود حکومت برطانیہ نے ہندوستان میں مکمل خود مختار حکومت کے جلد قیام کو اولین ترجیح دی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہندوستانی عوام کی امنگیں پوری کرنے کے لئے کس قدر مخلص ہے۔

وزیر خارجہ برائے امور ہند لارڈ پیتھوک لارنس نے سال نو کے موقعے پر ریڈیو سے ہندوستانی عوام کے نام اپنے پیغام میں کہا کہ اب دنیا میں ہندوستان کی جائز حیثیت کو تسلیم کروانے کے لئے لعن طعن یا منظم دباؤ کی ضرورت نہیں۔ وہ ہندوستانی عوام پر واضح کرنا چاہتے ہیں کہ برطانوی عوام کی شدید خواہش ہے کہ ہندوستان برطانوی دولت مشترکہ میں ان کے برابر پارٹنر کی حیثیت حاصل کرے۔ انہوں نے مزید کہا۔ "یہ مسئلہ اب عملی نوعیت کا ہے۔ اب مسئلہ ایک عقلی اور قابل عمل لائحہ عمل تشکیل دینا ہے۔ یہ ایک ایسا منصوبہ ہونا چاہئے جس کے تحت اقتدار ایسے نظام حکومت کی شکل میں ہندوستان کے حوالے کیا جائے۔ جو ہندوستانی عوام کی اکثریت کے لئے بخوشی قابل قبول ہو۔ ----- تاکہ نیا ہندوستان اندرونی کشمکش اور انتشار سے تقسیم در تقسیم اور مناقشت کا شکار نہ ہو۔"

مارچ ۱۹۴۶ء کے وسط میں وزیراعظم ایٹلی نے دارالعوام میں مندرجہ ذیل اہم تقریر کی۔

"ہندوستان کو لازماً منتخب کرنا ہے کہ اس کا آئندہ آئین کیا ہو گا' دنیا میں اس کی حیثیت کیا ہو گی۔ مجھے امید ہے کہ ہندوستانی عوام برطانوی دولت مشترکہ میں شامل رہنے کا انتخاب ہی کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ایسا کرنے سے انہیں بے حد فائدہ ہو گا۔ ان دنوں ایک مکمل اور باقی دنیا سے الگ تھلگ قومیت کا تصور بے حد فرسودہ ہو چکا ہے۔ وحدت' اقوام متحدہ یا دولت مشترکہ کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے لیکن کوئی عظیم قوم دنیا میں ہونے والے واقعات میں حصہ لئے بغیر اکیلی نہیں رہ سکتی۔ لیکن اگر ہندوستان اسے منتخب کرے تو یہ بھی

اس کی اپنی مرضی سے ہونا چاہئے۔ برطانوی دولت مشترکہ اور ایمپائر کو خارجی جبر کی زنجیروں نے نہیں باندھ رکھا۔ اگر بصورت دیگر وہ آزادی کا انتخاب کرے تو ہمارے خیال میں اسے ایسا کرنے کا بھی حق ہے۔ اس تبدیلی کو جس حد تک ممکن ہو سکے آسان اور سبک بنانے میں مدد کرنا ہمارا فرض ہو گا"

ایٹلی خصوصاً اس معاملے کو تیزی سے نمٹانا چاہتے تھے اور اسی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہوں نے کابینہ مشن بھیجا جو سر سٹیفورڈ کرپس لارڈ پیتھوک لارنس اور اے وی الیگزینڈر پر مشتمل تھا۔ آیئے ان حالات کا جائزہ لیں جن سے آگے چل کر کابینہ مشن دو چار ہوا۔ مشن کی آمد سے کچھ عرصہ قبل مرکزی قانون ساز اسمبلی اور مختلف صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات منعقد ہوئے تھے۔ مسلم لیگ کی کامیابی ہر شعبے میں حیران کن تھی۔ انتخابی نتائج سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہندوستان کے تمام مسلمان رائے دہندگان کانگریس کے خلاف فیصلہ دے چکے ہیں۔ جناح نے ۱۹۳۷ء میں جو دھمکی نہرو کو دی تھی وہ ۱۹۴۶ء میں ایک واضح، اہم اور خاطر خواہ حقیقت بن چکی تھی۔ ہم یاد کر سکتے ہیں کہ ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں کانگریس کی شاندار کامیابی کے بعد وفور غرور سے پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا تھا کہ ملک کے سیاسی ارتقاء میں قابل ذکر جماعتیں صرف دو ہیں ----- انگریز اور کانگریس۔ جس پر جناح نے جراتمندی سے جواب دیا تھا ایک تیسرا فریق بھی ہے ----- مسلمان ----- جسے کانگریس صرف اپنے رسک اور تباہی کی قیمت پر نظر انداز کر سکتی ہے' قاری کے ذہن میں یہاں ایک سوال ابھرتا ہے کہ مسلم لیگ کی ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں کامیابی کس حد تک کانگریس ہائی کمان کی اپنی کوتاہ نظری کی رہین منت تھی۔ ۱۹۳۷ء میں کانگریس نے صوبائی وزارتیں تشکیل دیتے وقت مسلم لیگ کے بڑھتے ہوئے دست تعاون کو مسترد کر دیا تھا اور پھر وہ مصائب و آلام جو مسلمانوں کے الزام کے مطابق انہیں کانگریس راج ۳۹-۱۹۳۷ء کے دوران برداشت کرنے پڑے تھے۔ بلاشبہ ان سب باتوں نے مسلم عوام کے ذہنوں پر بہت زیادہ گہرے اثرات مسلم لیگ کے مستقل پراپیگنڈے کی وجہ سے بھی مرتب کیے۔

لیکن یہ سوال کا پورا جواب نہیں ہے۔ درست اور حقیقی وضاحت یہ ہے کہ اسی اثناء میں ایک بہت بڑی طاقت وجود میں آچکی تھی۔ جس نے علیحدگی کی جانب مسلم لیگ کے سفر کو بہت تیز رفتار کر دیا۔ یہ ایک نئے تصور کی تخلیق تھی ----- تصور "پاکستان" اس نئے خیال نے بالائی طبقے کے مسلمانوں اور مسلم عوام کو ایک قابل فخر مواد فراہم کیا ----- ایک علیحدہ مسلم ریاست کی تخلیق جس میں مسلمان بالادست ہوں گے اور قرآن و شریعت کے قوانین پر مبنی اسلامی نظام حکومت قائم ہو گا۔ اس طرح مسلم عوام بھی مسلم لیگ کے پیرو کار بن گئے جس سے مسلم لیگ نے اتنی طاقت حاصل کر لی کہ کانگریس کے لئے اسے نظر انداز کرنا ممکن نہ رہا۔

بعد از جنگ انتخابات میں مسلم لیگ کی شاندار اور زبردست فتح نے جناح کو ہندوستانی سیاست کی ایک عظیم الشان طاقت اور تقریباً ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کن کردار بنا دیا۔ جس شام کابینہ مشن ہندوستان پہنچا' انہوں نے مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز کے ان تمام منتخب ارکان کا اجلاس طلب کیا جنہوں نے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا تھا۔ اس کنونشن میں ایک خود مختار پاکستان کا دو ٹوک مطالبہ کیا گیا۔ اس نے کابینہ مشن کو انتباہ کیا جو ابھی ہندوستان پہنچا ہی تھا کہ اگر مسلمانوں کے مطالبے کے خلاف مشن کی جانب سے ان پر کوئی دستور ٹھونسنے کی کوشش کی گئی تو لیگ، اپنے زیر اثر تمام طاقتوں سے اس کے خلاف مزاحمت کرے گی۔ یہ تھی وہ صورتحال جس کا ہندوستان پہنچتے ہی کابینہ مشن کو سامنا کرنا پڑا چنانچہ اس کے لئے اسے نظر انداز کرنا ناممکن تھا۔

اگرچہ کابینہ مشن نے لیگ کی پوزیشن کی مضبوطی کا اندازہ کر لیا تھا لیکن وہ فوری طور پر آزاد پاکستان کی تخلیق کے لئے پوری اور حتمی طور پر تیار نہ تھا۔ مشن کے ارکان ایک ایسا راستہ نکالنا چاہتے تھے جس کے ذریعے پہلے ہندوستان کی بنیادی وحدت برقرار رکھی جاتی بعد ازاں مسلم اکثریت کے صوبوں کو مکمل خود مختاری بھی دی جا سکتی تھی۔ بالفاظ دیگر لیگ کو پاکستان کا ماحصل وفاقی ہندوستان کے اندر مل سکتا تھا۔ مشن کے ارکان

نے پہلے پہل محسوس کیا کہ کسی متفقہ حل پر پہنچنا مشکل نہیں ہو گا کیونکہ راج گوپال اچاریہ اور گاندھی جی کا منصوبہ پہلے ہی موجود تھا۔ لیکن جلد ہی یہ واضح ہو گیا کہ ایک متفقہ حل ناممکن ہے۔ ان حالات میں ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کو مشن نے اپنی سکیم پیش کی جو بعض ترامیم کے ساتھ راج گوپال اچاریہ گاندھی سکیم ہی تھی۔ اس سکیم کے دو حصے تھے ----- ایک طویل المیعاد منصوبہ جس کا تعلق دستور سازی سے تھا اور ایک مختصر المعیاد منصوبہ جس کا تعلق ملکی انتظام چلانے کے لئے عبوری حکومت کی تشکیل سے تھا۔ طویل المدت منصوبے کی بنیادی صورت مندرجہ ذیل سہ نکاتی سکیم پر مشتمل تھی۔

ا= (سب سے پہلے یا) چوٹی پر ایک یونین آف انڈیا (وفاق ہند) ہونی چاہئے جس میں برٹش انڈیا اور ریاستیں شامل ہوں۔ یہ خارجہ امور' دفاع اور مواصلات جیسے معاملات کی نگرانی کرے۔

ب= (اس کے بعد یا) تہہ میں صوبے اور ریاستیں ہوں گی۔ یونین کے زیر اثر نہ آنے والے تمام (علاقے) ہوں گے باقی ماندہ تمام اختیارات ان کے پاس ہوں گے۔

ج= لیگ کو پاکستان کا ماحصل صوبوں کی تین سیکشنوں میں گروہ بندی' کے ذریعے دیا جائے گا۔ یہ تینوں سیکشن کچھ اس طرح ہوں گے۔

سیکشن مدراس' بمبئی' صوبہ جات متحدہ' بہار' صوبہ جات متوسط اور اڑیسہ۔

سیکشن ب پنجاب' شمال مغربی سرحدی صوبہ' سندھ اور بلوچستان۔

سیکشن ج بنگال اور آسام۔

کابینہ مشن کے منصوبے کو ہندوستان بھر میں اخبارات نے بے حد پذیرائی بخشی۔ کابینہ مشن کے خلوص نیت پر کسی نے انگشت نہیں دھری اور ہندوستان کی وحدت کو برقرار رکھنے کے لئے اس کی بھرپور کوششوں کو بھی ہر طرف سے سراہا گیا۔ کانگریسی ذہن رکھنے والوں کو اس نے مشترکہ وفاقی (یونین) مرکز فراہم کیا جب کہ مسلم لیگ کو اس نے

ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق کی مسلمان زونوں میں مکمل صوبائی خود مختاری کی پیشکش کی۔ لیکن منصوبے کا وہ حصہ جس کا تعلق صوبوں کی ابتدائی گروہ بندی سے تھا وجہ نزاع بن گیا۔ ایک طرف ہندوستان کی تقسیم کو روکنے اور دوسری جانب مسلم لیگ کے خود مختار ریاست کے بے لچک مطالبے کی وجہ سے مشن نے یہ سکیم اختراع کی۔ کچھ دیر ٹھہر کر ہم دیکھیں گے کہ کابینہ مشن کا پورا منصوبہ اسی بدنصیب حصے کے باعث ناکامی سے دوچار ہوا۔

جناح کی تنقید ۲۲ مئی کو منظر عام پر آئی۔ یہ ایک محتاط بیان تھا جس میں کچھ بے اطمینانی کا اظہار کیا گیا تھا لیکن اسے یکسر مسترد کر دینے کی کوئی تجویز نہیں تھی۔ نئی دہلی میں مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ۶ جون کو ہوا۔ جناح کی ہدایت کے تحت کونسل نے کابینہ مشن کے اس منصوبے کو اس حد تک قبول کر لیا جس حد تک اس میں پاکستان کی بنیاد مسلم اکثریت کے صوبوں کی لازمی گروہ بندی کی اساس پر مضمر تھی۔ اس مشن کے منصوبے میں صوبوں اور صوبوں کے گروہوں کو یونین سے علیحدگی کے حق اور موقع کے پیش نظر کونسل نے آئین ساز اسمبلی میں شمولیت پر رضامندی بھی ظاہر کر دی۔ اس نے حتمی طور پر اعلان کر دیا کہ اگرچہ ایک آزاد اور علیحدہ پاکستان ابھی تک اس کا مقصود ہے لیکن ہندوستان کے دستوری مسئلے کے پر امن اور فوری حل کی شدید خواہش کے تحت یہ منصوبے کو قبول کرتی ہے۔

کانگریسی ورکنگ کمیٹی کے ارکان کا ابتدائی اجلاس ۲۴ مئی کو ہوا لیکن انہوں نے اس بیان پر کوئی حتمی رائے دینے سے احتراز کیا۔ انہوں نے صوبوں کی گروہ بندیوں کے مسئلے پر منصوبے میں کچھ تضادات کی نشاندہی کی۔ ان کے مطابق صوبوں کی "ابتدائی گروہ بندی" کی شق اس آزادی کے ساتھ متصادم تھی جس کا صوبوں کے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا کہ وہ جس گروپ میں چاہیں اپنی مرضی سے شمولیت اختیار کر سکتے ہیں۔ کابینہ مشن نے اس کا فوری جواب دیا جو کچھ اس طرح تھا-----

"کانگریس کی قرارداد کے مطابق سکیم کے پیراگراف نمبر ۱۵ کی تشریح جو اس معاملے سے متعلق ہے کہ ابتدا" صوبے اپنی مرضی سے کسی سیکشن میں شامل ہو سکتے ہیں یا نہیں' وفد کے مقاصد کے مطابق نہیں ہے۔ صوبوں کی گروہ بندی کی وجوہات سب کو اچھی طرح معلوم ہیں اور سکیم کا یہ حصہ صرف فریقین کے درمیان رضامندی کے ذریعے ہی ترمیم کے مرحلے سے گزر سکتا ہے۔ کسی گروپ سے نکلنے کا حق بھی (اس صوبے کے) عوام کو حاصل ہو گا وہ بھی جب آئین سازی مکمل ہو جائے کیونکہ نئے صوبائی دستور کے بعد ہونے والے پہلے انتخابات میں گروپوں سے علیحدگی کا سوال ایک بڑا مسئلہ ہو گا اور وہ تمام افراد جو نئے حق رائے دہی کے تحت ووٹ دینے کے مجاز ہوں گے وہ ایک حقیقی جمہوری فیصلے میں حصہ لینے کے اہل ہوں گے-----"

کانگریس ورکنگ کمیٹی کا حتمی اجلاس ۲۵ جون ۱۹۴۶ء کو ہوا تاکہ کابینہ مشن منصوبے پر غور و فکر کیا جا سکے۔ گاندھی جی نے اس اجلاس میں اپنے رویے میں ایک غیر متوقع تبدیلی کا اظہار کیا۔ اور منصوبے کو اس کے طویل اور مختصرالمیعاد حصوں کے ساتھ یکسر رد کر دینے کی ہدایت کی۔ جب کہ دوسری جانب مولانا آزاد' پنڈت نہرو اور سردار پٹیل سمجھوتے کے خواہاں تھے۔ مولانا آزاد اپنی خود نوشت سوانح حیات کے صفحہ ۱۵۰ پر لکھتے ہیں

----- "ورکنگ کمیٹی میں بحث و تمحیص کے دوران میں نے نشاندہی کی کہ کابینہ مشن منصوبہ بنیادی طور پر وہی سکیم ہے جسے کانگریس منظور کر چکی ہے۔ ورکنگ کمیٹی کو منصوبے کے بنیادی سیاسی حل کو تسلیم کرنے میں کوئی مشکل درپیش نہ تھی' آخر میں کمیٹی نے گاندھی جی سے صرف جزوی اتفاق رائے کیا۔ اس نے مرکز میں عبوری حکومت قائم کرنے کی تجویز کو مسترد کر دیا لیکن آئین سازی کی تجویز کو متنازع شقوں کی ذاتی تشریح کی بنیاد پر تسلیم کر لیا۔

کابینہ مشن منصوبے سے متعلق لائحہ عمل اختیار کرنے سے متعلق گاندھی جی اور

ان کے رفقائے کار کے درمیان کس قدر بنیادی اختلاف تھا اس کا اظہار شری پیارے لال کے اس نقشے سے ہوتا ہے جو انہوں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اس اجلاس کا کھینچا ہے جو ۲۵ جون کی صبح حتمی فیصلہ دینے کے لئے ہوا۔

"صبح ۸ بجے باپو ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے لئے گئے۔ انہوں نے مجھے دو نوٹس پڑھنے کے لئے کہا جو انہوں نے گزشتہ شب کرپس کو لکھے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے انہیں نہایت اختصار سے مخاطب کیا۔ "میں شکست تسلیم کرتا ہوں۔ آپ کو میرے بے بنیاد شکوک کے مطابق عمل کرنے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں۔ آپ کو میرے وجدان کی پیروی اس صورت میں کرنی چاہئے اگر یہ آپ کی عقل کو مناسب لگے۔ بصورت دیگر آپ آزادانہ طرز عمل اپنا سکتے ہیں۔ اب میں آپ کی اجازت سے رخصت ہو جاؤں گا۔ آپ کو اپنے شعور کے احکامات ماننے چاہئیں"

"پوری مجلس کو سانپ سونگھ گیا۔ کچھ دیر کے لئے کوئی کچھ نہ بولا۔ مولانا صاحب نے بے مثال چابکدستی سے فوری طور پر صورتحال کو سنبھال لیا۔ "آپ کیا چاہتے ہیں؟ کیا باپو کو مزید روکے رکھنے کی کوئی ضرورت ہے؟ انہوں نے پوچھا۔ سب خاموش تھے۔ ہر کوئی بات کو سمجھ چکا تھا۔ فیصلے کی اس گھڑی میں انہیں باپو کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ انہوں نے کپتان کو سبکدوش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ باپو اپنے گھر لوٹ گئے۔

"دوپہر کو ورکنگ کمیٹی کا اجلاس دوبارہ ہوا جس میں کابینہ مشن کے نام ایک خط لکھا گیا خط میں مرکز میں عبوری حکومت کے قیام کی تجویز کو مسترد کر دیا گیا جب کہ آئین سازی کے طویل المعیاد منصوبے کو متنازع شقوں کی خود ساختہ تشریح کے ساتھ قبول کر لیا گیا ----- دوپہر ہی کو کابینہ مشن نے ورکنگ کمیٹی کے ارکان کو ملاقات کے لئے بلایا۔ باپو چونکہ اس کے رکن نہ تھے اس لئے انہیں مدعو نہیں کیا گیا۔ واپسی پر کسی نے ملاقات کی کارروائی کے ایک حرف سے بھی باپو کو آگاہ نہیں کیا"

(مہاتما گاندھی ----- آخری دور، جلد اول، صفحہ ۲۳۹)

ورکنگ کمیٹی کے ۲۵ جون کے فیصلے سے کابینہ مشن کو اسی روز آگاہ کر دیا گیا۔ مشن نے کانگریس کے فیصلے کو اپنے ۱۶ مئی کے منصوبے کی قبولیت قرار دیا۔ اپنی محنت کی بظاہر کامیابی سے مکمل طور پر مطمئن ہو کر مشن لندن روانہ ہو گیا۔

کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ۲۵ جون کے فیصلے کی رسمی منظوری کے لئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس بمبئی میں ہوا۔ اس اجلاس میں گاندھی جی نے نئے ہتھکنڈے اختیار کئے۔ وہ شکست کو حتمی طور پر قبول کرنے والے انسان نہ تھے۔ دوسری طرف وہ شکست میں سے بھی فتح نچوڑ لینے والے شخص تھے۔ اب انہوں نے ورکنگ کمیٹی کے فیصلے سے اتفاق ظاہر کیا جو ۲۵ جون کو ان کی خصوصی ہدایت کے خلاف کیا گیا تھا۔

جب گاندھی جی کے انتہا پسند مقلدین نے ان کے رویے میں تبدیلی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے خدشے کا اظہار کیا کہ دستور ساز اسمبلی کہیں کوئی چال یا جال ثابت نہ ہو تو گاندھی نے فوری جواب دیا ----- "ایک ستیہ گرھی کسی شکست کو نہیں جانتا" ----- میں یہ تسلیم کرنے پر تیار ہوں کہ مجوزہ آئین ساز اسمبلی ----- میں بہت سی خامیاں ہیں۔ لیکن ----- اگر اس مجوزہ اسمبلی میں خامیاں ہیں تو انہیں دور کرنا آپ کا کام ہے ----- میں آئین ساز اسمبلی کو ستیہ گرہ کا متبادل سمجھتا ہوں۔ یہ تعمیری ستیہ گرہ ہے۔"

(ایضاً، صفحہ ۲۴۵)

کوئی بھی گاندھی جی کے مذکورہ بالا پراسرار الفاظ کا اندرونی مفہوم نہ سمجھ سکا کیونکہ وہ اپنے ذہن کو صرف خود جانتے تھے۔ اور انہوں نے ہمیشہ کی طرح کانگریس کی ظاہری منظوری کے باوجود کابینہ مشن منصوبے کو سبوتاژ کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

"کابینہ مشن کے ساتھ بات چیت کے آخری مرحلے نے گاندھی جی اور ان کے بعض قریب ترین رفقائے کار کے درمیان ایسی خلیج کا آغاز کیا جس نے انتقال اقتدار کے آخری دور میں انہیں مختلف راستوں پر گامزن کر دیا -----" سب سے زیادہ قابل ذکر واقعہ ان

کے وفادار ترین پیرو کار اور قابل اعتماد سپاہی سردار پٹیل کا ان کے ساتھ کھلا اور واضح اختلاف تھا' ورکنگ کمیٹی کے ۲۵ جون کے فیصلے کے بعد گاندھی جی نے یکم جولائی کو سردار پٹیل کو خط لکھا جس میں انہوں نے کہا "میں محسوس کر رہا ہوں کہ ہم مخالف سمتوں میں سفر کر رہے ہیں"

(ایضاً' صفحات ۴۰-۲۳۹)

باب نمبر29

پنڈت نہرو بطور صدر کانگریس ○ مسلم لیگ پر ان کا شدید حملہ ○ لیگ کا فوری جواب بذریعہ راست اقدام (۱۹۴۶ء)

٦ جولائی ١٩٤٦ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس بمبئی میں پنڈت جواہر لال نہرو کو کانگریس کا صدر مقرر کیا گیا۔ مولانا آزاد ١٩٣٩ء سے بطور صدر کام کر رہے تھے اور اب ١٩٤٦ء آچکا تھا چنانچہ معمول کی تبدیلی میں پہلے ہی تاخیر ہو چکی تھی۔ تاہم اس واقعے کے فوراً بعد ایک ہفتے کے اندر اندر جو کچھ رونما ہوا اس کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایسی بیچ منجدھار میں کپتان کی تبدیلی بہت تباہ کن تھی کیونکہ کابینہ مشن منصوبے کا حتمی فیصلہ ہونا ابھی باقی تھا۔ یہاں مولانا آزاد کو خراج تحسین پیش کرنا ضروری ہے۔ انہوں نے سر سٹیفورڈ کرپس اور کابینہ مشن سے مذاکرات کے دوران دل و دماغ کی شاندار صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ وہ ہمیشہ گاندھی جی اور ورکنگ کمیٹی کو اعتدال پسندی پر قائل کرتے رہے۔ یہ انہی کی مستقل کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ورکنگ کمیٹی نے گاندھی جی کی واضح ہدایت کے خلاف کابینہ مشن کی طویل المدت تجاویز کو تسلیم کر لیا۔ وہ کبھی گاندھی جی کے سامنے محض ربڑ کی مہر نہیں بنے اور متعدد نازک مواقع پر انہوں نے گاندھی جی کے خیالات کی مخالفت کی۔ وہ عبوری حکومت کے قیام کے لئے وائسرائے کی کوششوں کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے انتھک مساعی کرتے رہے۔ کانگریس اور لیگ کے درمیان ہم آہنگی کی خاطر وہ عبوری حکومت سے باہر رہنے کے لئے بھی تیار تھے۔ کانگریس اور فرقہ وارانہ یکجہتی کے لئے انہوں نے جناح کے ہاتھوں متعدد مرتبہ اہانت کو برداشت کیا۔

مولانا آزاد گہرے اطمینان اور سکون سے کانگریس کی صدارت سے بکدوش ہوئے (ان کی بکدوشی کے بعد ہونے والے واقعات سے نہایت بلا جواز ثابت ہوئی) جس کا اظہار انہوں نے مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے۔

"کانگریس اور لیگ دونوں کی طرف سے کابینہ مشن منصوبے پر رضامندی ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ کا ایک شاندار واقعہ تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ہندوستان کی آزادی کا مشکل مسئلہ تشدد اور تصادم کی بجائے مذاکرات اور باہمی اتفاق رائے سے حل ہو گیا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ بالاخر فرقہ وارانہ مشکلات کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ پورے ملک میں مسرت و شادمانی محسوس کی جا رہی تھی اور تمام لوگ آزادی کے مطالبے پر متحد ہو گئے تھے ----"

(ہندوستان کا حصول آزادی' صفحہ ۱۵۱)

۱۹۴۶ء میں پنڈت نہرو کی کانگریس کے صدر کے طور پر تقرری گاندھی جی کی ذاتی مداخلت کی وجہ سے ہوئی جو کہ تقریباً تمام صوبائی کانگریس کمیٹیوں کی متفقہ رائے کے خلاف تھی جنہوں نے اس اعزاز کے لئے سردار پٹیل کے نام کی سفارش کی تھی۔ مولانا آزاد ۱۹۳۹ء سے بطور صدر خدمات انجام دے رہے تھے۔ لیکن اب تبدیلی کے لئے گاندھی جی کے پاس اپنی جذباتی اور شاطرانہ وجوہ موجود تھیں۔ اس وقت یہ ہر کسی پر واضح تھا کہ انگریز جا رہے ہیں اور آزاد ہندوستان وجود میں آرہا ہے چنانچہ معمول کے مطابق کانگریس کا صدر ہی ہندوستان کا وزیراعظم ہو گا۔ گاندھی جی کی شدید خواہش تھی کہ یہ بلند رتبہ پنڈت نہرو ہی کو ملنا چاہئے۔ جنوری ۱۹۴۲ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس واردھا میں تقریر کرتے ہوئے گاندھی جی نے کہا تھا۔

"میں کئی برس سے کہہ رہا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں کہ راجہ جی نہیں بلکہ جواہر لال میرے جانشین ہوں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ میری زبان نہیں سمجھتے اور وہ خود ایک ایسی زبان بولتے ہیں جو میرے لئے اجنبی ہے۔ لیکن زبان

دلوں کے ملاپ کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں ہے اور میں یہ جانتا ہوں کہ جب میں چلا جاؤں گا تو وہ میری ہی زبان بولیں گے۔"

(ملاحظہ فرمایئے نہرو از مائیکل بریشر، صفحہ ۲۷۵)

۱۹۴۶ء میں جس دن پنڈت جواہر لال نہرو نے کانگریس کی صدارت اختیار کی وہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک بدنصیب دن تھا جس نے اس کی قسمت پر بے حد نحس اثرات مرتب کیے۔ جونہی انہوں نے اپنا عہدہ سنبھالا انہوں نے ایک نہایت غیر دانشمندانہ اور اشتعال انگیز تقریر کی جو ملک کے لئے لاتعداد مصائب کا باعث بنی اور جس نے ہندوستان کی تاریخ کا دھارا موڑ دیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی اس تقریر کو بخوبی تقدیر کی وہ دیا سلائی کہا جا سکتا ہے جس نے پورے ہندوستان کو آگ لگا دی۔ مولانا آزاد اور سردار پٹیل پنڈت نہرو کی اس بے عقلی پر ششدر رہ گئے اور انہوں نے اس تقریر کے اثرات زائل کرنے کی کوشش کی لیکن ان کی مساعی بے سود ثابت ہوئیں۔

اس تقریر میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی کاروائی کو سمیٹتے ہوئے کانگریس کے نئے صدر پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے معمول کے عجلت پسندانہ اور بلا سوچے سمجھے انداز میں ایک شر انگیز بیان جاری کیا۔

"ہم کسی ایک بات کے بھی پابند نہیں ہیں سوائے اس کے کہ ہم نے وقتی طور پر آئین ساز اسمبلی میں جانے کا فیصلہ کیا ہے" بعد ازاں انہوں نے ۱۰ جولائی کو بمبئی کی ایک پریس کانفرنس میں ایک سوچا سمجھا بیان دیا۔ انہوں نے کہا کہ آئین ساز اسمبلی برطانوی حکومت کی طرف سے جاری کردہ کسی بھی پالیسی بیان کے باوجود ایک خود مختار ادارہ ہو گی۔ یہ اپنی پسند کے مطابق کچھ بھی کرنے کے لئے قطعی طور پر آزاد ہو گی۔ یہ کسی بھی شرط کی پابند نہیں ہو گی اور غالب امکان یہ ہے کہ یونین آف انڈیا (وفاق ہند) کی تشکیل کے بعد صوبوں کی کوئی "گروہ بندی" نہیں ہو گی۔ ان کے ہو بہو الفاظ درج ذیل ہیں۔

"خواہ کسی بھی زاویے سے اس مسئلے کو دیکھا جائے غالب امکان یہی ہے کہ کوئی

گروہ بندی نہیں ہو گی۔ لازماً سیکشن الف گروہ بندی کے خلاف فیصلہ دے گا۔ اگر سٹے کی زبان استعمال کی جائے تو اس کا امکان ایک کے مقابلے میں چار ہے کہ شمال مغربی سرحدی صوبہ گروہ بندی کے خلاف فیصلہ دے گا۔ اس کے بعد گروپ ب ختم ہو جائے گا۔ یہ بھی بہت زیادہ ممکن ہے کہ بنگال اور آسام گروہ بندی کے خلاف فیصلہ دیں گے۔ اگرچہ میں یہ کہنا پسند نہیں کروں گا کہ ابتدائی فیصلہ کیا ہو سکتا ہے کیونکہ یہاں توازن برابر ہے لیکن یہ بات میں نہایت وثوق اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ حتمی طور پر کوئی گروہ بندی نہیں ہو گی کیونکہ آسام اسے کسی حالت میں بھی برداشت نہیں کرے گا سو آپ دیکھ رہے ہیں کہ کسی بھی نقطہ نظر سے یہ گروہ بندی کا معاملہ ہمارے لئے قابل قبول نہیں ہے"۔

(انتقال اقتدار از وی پی مینن، صفحہ ۲۸۱)

پنڈت نہرو کی تقریر کو گاندھی جی کے ان الفاظ کے ساتھ ملا کر پڑھا جانا چاہئے جو انہوں نے خود اس اجلاس میں کہے تھے۔ گاندھی جی کے استعمال کردہ الفاظ یہ تھے -----

"میں دستور ساز اسمبلی کو ستیہ گرہ کا متبادل سمجھتا ہوں۔ یہ ایک تعمیری ستیہ گرہ ہے۔"

لیکن اس میں معمولی سا شبہ بھی نہیں کہ پنڈت نہرو نے اسی کا اظہار لاشعوری طور پر کیا تھا جو فی الحقیقت گاندھی جی کے شعور میں تھا۔ ان دونوں کا مطلب یہ تھا کہ وہ دستور ساز اسمبلی میں گروہ بندی کے خلاف جنگ لڑنے کے لئے داخل ہو رہے ہیں اور اس فتح کے لئے وہ اسمبلی میں یدھ (مقابلہ / جنگ) کریں گے جو وہ کابینہ مشن سے حاصل نہیں کر پائے تھے۔

پنڈت نہرو کے مذکورہ بالا بیان سے مسلم لیگ کے کیمپ میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ اس پر خوف طاری ہو گیا کہ کابینہ مشن منصوبے نے مسلمانوں سے جن حقوق و مراعات کا وعدہ کیا تھا وہ شدید خطرے میں ہیں۔ جناح کے غصے کی کوئی انتہا نہ رہی۔ انہوں نے کہا کہ بد اعتمادی کے اس مظاہرے کے بعد کانگریس قطعی طور پر قابل بھروسہ نہیں رہی۔ انہوں نے کابینہ مشن پر کانگریس کے ہاتھوں میں کھیلنے کا الزام عائد کیا جس نے جھوٹ کی آڑ میں

آئین ساز اسمبلی قائم کروائی ہے۔

انہیں یقین ہو گیا کہ آئین ساز اسمبلی میں بھی کانگریس اپنی بے پناہ اکثریت کو بروئے کار لا کر ان تمام مفادات کو ختم کر دے گی جو مسلم لیگ نے کابینہ مشن کے ذریعے حاصل کئے ہیں۔ پنڈت نہرو کا یہ بیان غالباً آج تک کسی بھی سیاستدان کی طرف سے جاری کردہ ناسمجھی کے بیانوں میں سے بدترین تھا۔ یہ تاریخ کا وہ لمحہ تھا جب دانشمندی کو سب سے زیادہ اہم ہونا چاہئے تھا۔ خاموشی کے ذریعے بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا تھا۔ ہندوستان کا مقدر متوازن تھا اور معمولی سی غلط جنبش اسے بگاڑ سکتی تھی۔ لیکن نہرو نے اس لمحے کو اپنے سوانح نویس مائیکل بریشر کے مطابق اپنی عوامی زندگی کے ۴۰ برسوں میں سب سے زیادہ شعلہ خیز اور اشتعال انگیز بیان دینے کے لئے منتخب کیا ---- کیا نہرو کو احساس ہوا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ دنیا کو بتا رہے تھے کہ اگر ایک مرتبہ کانگریس اقتدار میں آگئی تو وہ مرکز میں اپنی قوت کو کابینہ مشن میں ایسی تبدیلیاں کرنے کے لئے استعمال کرے گی جنہیں وہ درست اور مناسب سمجھتی ہے۔ مسلم لیگ (اور خود کانگریس) نے کابینہ مشن منصوبے کو حتمی اور ناقابل ترمیم سمجھ کر قبول کیا تھا ---- یہ سمجھوتے کا منصوبہ تھا جسے بعد ازاں کسی ایک یا دوسرے فریق کی حمایت میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا تھا۔

(برطانوی راج کے آخری ایام از موزلے، صفحہ ۲۸)

مولانا آزاد اپنی سوانح عمری میں لکھتے ہیں۔

”میں اس نئی صورتحال سے بری طرح پریشان ہوا۔ میں نے دیکھا کہ وہ سکیم جس کے لئے میں نے اس قدر سخت محنت کی خود ہمارے ہاتھوں برباد ہو رہی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ صورتحال کا از سر نو جائزہ لینے کے لئے ورکنگ کمیٹی کا اجلاس فوراً ہونا چاہئے۔ ورکنگ کمیٹی کی نشست معمول کے مطابق ۸ اگست کو ہوئی۔ میں نے نشاندہی کی کہ اگر ہم معاملے کو بچانا چاہتے ہیں تو ہمیں لازماً وضاحت کرنی چاہئے کہ کانگریس اپنے کسی بھی خیال کا اظہار آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی قرارداد کے ذریعے کرتی ہے اور کوئی بھی

شخص حتیٰ کہ کانگریس کا صدر بھی اسے نہیں بدل سکتا۔

"ورکنگ کمیٹی نے محسوس کیا کہ اسے دہرے مسئلے کا سامنا ہے۔ ایک طرف کانگریس کے صدر کا وقار داؤ پر لگتا ہے تو دوسری طرف وہ بیان خطرے میں پڑ جاتا ہے جسے اس قدر محنت سے تیار کیا گیا تھا۔ صدر کے بیان کو مسترد کرنے سے تنظیم کمزور پڑ جائے گی۔ لیکن کابینہ مشن منصوبہ ترک کرنے سے ملک تباہ ہو جائے گا۔

"میں یہ بات ریکارڈ پر ضرور لاؤں گا کہ جواہر لال کا بیان غلط تھا۔ یہ کہنا درست نہ تھا کہ کانگریس منصوبے کو اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کرنے میں آزاد ہے-----"

(ہندوستان کا حصول آزادی، صفحہ ۱۵۶)

اب کانگریس مسلمانوں کے احتجاج کی شدت سے دم بخود رہ گئی۔ ان حالات میں لیگ کو مطمئن کرنے کے لئے ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ۸ اگست کو ہوا جس میں منظور کردہ قرارداد میں اس بات پر دلی رنج ظاہر کیا گیا کہ لیگ نے آئین ساز اسمبلی میں شامل نہ ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس قرارداد میں جو درحقیقت لیگ سے مخاطب تھی کہا گیا کہ ورکنگ کمیٹی نے کبھی بھی گروہ بندی کے اصول پر اعتراض نہیں کیا۔ ان کا اعتراض تو محض ایک مختصر سے نکتے پر ہے کہ کیا کسی صوبے کو اس کی مرضی کے خلاف کسی گروپ میں شمولیت پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ لیکن کانگریس ورکنگ کمیٹی کی قرارداد جناح کے اعتماد کو بحال نہ کر سکی۔ وہ اپنے اس خیال پر قائم رہے کہ پنڈت نہرو کا بیان اگر آپ چاہیں تو اسے غیر ذمہ دارانہ کہہ سکتے ہیں، گاندھی جی اور کانگریس کے پوشیدہ ارادے کا اظہار ہے۔ وہ کانگریس پر بھروسہ نہیں کر سکتے تھے اور انہیں یقین تھا کہ جونہی انگریز ہندوستان سے رخصت ہوں گے، ہندو اکثریت پر مشتمل آئین ساز اسمبلی پاکستان کے نیم تشکیل شدہ منصوبے کو تہس نہس کر دے گی۔ جسے کابینہ

مشن نے صوبائی گروہ بندی کے ذریعے قائم کیا تھا۔

جناح نے تاجدار برطانیہ کی حکومت کے سامنے شدومد سے احتجاج کیا۔ ۱۸ جولائی کو وزیر خارجہ برائے امور ہند لارڈ پیتھوک لارنس نے دارالامراء میں مندرجہ ذیل بیان دیا۔

"اس سے قبل کہ میں آئین ساز اسمبلی کے معاملے کے تذکرے سے آگے بڑھوں مجھے غالباً چند الفاظ ہندوستان سے آنے والی کچھ تازہ ترین اطلاعات کے متعلق ضرور کہنے چاہئیں جو کہ آئین ساز اسمبلی میں حصہ لینے والی پارٹیوں کے ارادوں سے متعلق ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ ہمارے ہندوستان سے واپس آنے سے کچھ پہلے دونوں پارٹیوں نے واضح طور پر کہا تھا کہ وہ آئین ساز اسمبلی کو چلانے کی نیت سے اس میں شامل ہونا چاہتی ہیں۔ لیکن ۱۶ مئی کی دستاویز سے متفق ہونے کے بعد اور اس دستاویز کے مطابق آئین ساز اسمبلی منتخب ہونے کے بعد وہ متفقہ شرائط سے باہر نہیں جا سکتیں۔ ایسا کرنا ان پارٹیوں کے ساتھ ناانصافی کے مترادف ہو گا جو اس متفقہ کاروائی کی بنیاد پر اس میں شامل ہوئیں کہ شاہ معظم کی حکومت آئین ساز اسمبلی کے فیصلوں کو تسلیم کرے گی۔"

(انتقال اقتدار از وی پی مینن، صفحہ ۲۸۲)

جناح برطانوی پارلیمنٹ میں ہونے والی تقریروں سے مطمئن نہیں ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ مدد اور تعاون کے لئے کسی اور ذریعے کی طرف دیکھنے کا کوئی فائدہ نہیں انہوں نے محسوس کیا کہ خود مسلمان قوم کے علاوہ ایسی کوئی عدالت نہیں جس سے مسلمان کوئی انصاف طلب کر سکیں اور اب وہ اسی عدالت سے رجوع کریں گے۔ اس کے بعد انہوں نے ۲۸ جولائی کو کونسل آف مسلم لیگ کا اجلاس بمبئی میں طلب کیا۔ اس اجلاس میں انہوں نے کہا کہ کانگریس کے ساتھ پر امن معاہدے کی اپنی خواہش کے تحت انہوں نے لیگ کو کابینہ مشن منصوبہ قبول کر لینے کی ہدایت کی تھی حالانکہ وہ ان کے مکمل مطالبہ پاکستان سے کہیں کمتر تھا۔ انہوں نے ایسا اس لئے کیا کیونکہ وہ پورے خلوص نیت سے صورتحال کو خونریزی اور خانہ جنگی میں بدلنے سے روکنے کے متمنی تھے۔ اب وہ محسوس

کرتے ہیں کہ ڈھونگ کے ذریعے منتخب آئین ساز اسمبلی حاصل کرنے کے بعد کانگریس لیگ کو دھوکہ دینے کی کوشش کرے گی تاکہ مسلمانوں کو ان حقوق سے محروم کیا جاسکے جو کابینہ مشن منصوبے کے تحت مسلم اکثریت کے صوبوں کی گروہ بندی کے ذریعے دیے گئے ہیں۔

جناح نے نتیجہ اخذ کیا کہ نہرو کی تقریر سے ظاہر ہونے والی کانگریس کی حقیقی نیت کے پیش نظر اب اس سے تعاون کرنا کسی طرح بھی ممکن نہیں رہا اور مسلم لیگ کے پاس اس کے سوا کوئی متبادل نہیں ہے۔ وہ دوبارہ پاکستان کے قومی مقصد ہی سے وفادار رہے۔ جذبات سے لبریز آواز میں انہوں نے مارچ کی کال دے دی "ہم نے ایک تلخ سبق سیکھا ہے جو میرے خیال میں اب تک کا تلخ ترین سبق ہے۔ اب سمجھوتے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ آیئے آزاد و خود مختار پاکستان کے اپنے محبوب مقصد کی جانب مارچ کریں"

(جناح از ہیکٹر بولیتھو، صفحہ ۱۶۵)

اس اجلاس میں جو قراردادیں منظور کی گئیں ان میں کابینہ منصوبے کو ترک کرنے اور مقصد پاکستان کو مضبوط بنانے کے لئے "راست اقدام" کی اجازت دینے کے فیصلے کئے گئے۔ راست اقدام شروع کرنے کے لئے ۱۶ اگست کی تاریخ مقرر کی گئی۔ جب داد و تحسین اور جوش و خروش کے عالم میں یہ قراردادیں منظور ہوئیں تو جناح نے کہا۔

"آج جو ہم نے کیا ہے وہ ہماری تاریخ کا اہم ترین واقعہ ہے لیگ کی پوری تاریخ میں ہم نے آئینی ذرائع اختیار کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کیا۔ لیکن اب ہمیں اس پوزیشن کی طرف دھکیل دیا گیا ہے اور مجبور کر دیا گیا ہے آج ہم آئینی طریقوں کو خدا حافظ کہتے ہیں۔ آج ہم نے پستول اٹھا لیا ہے اور اسے استعمال کرنے کی پوزیشن میں ہیں -----"

(انتقال اقتدار از وی پی مینن، صفحہ ۲۸۴)

کیا جناح کو احساس تھا کہ وہ اس دن کیا کر رہے تھے؟ ان کے ماضی کے وہ تمام اچھے

اعمال جن کے لئے غالباً ہم نے انہیں ان کے حق سے زیادہ خراج تحسین پیش کیا ہے، عوامی تشدد کی کھلم کھلا حوصلہ افزائی کرنے جیسے مجرمانہ فعل سے خاک میں مل گئے۔ اگر وہ مستقبل کو دیکھ سکتے تو وہ "راست اقدام" کے نتیجے میں بہنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں کے خون کے دریاؤں کو دیکھ سکتے تھے۔ جس دن "راست اقدام" کا آغاز ہوا، قانون اور امن عامہ ہندوستان سے رخصت ہو گئے۔

مسلم لیگ کے اہم رہنما بھی پر تشدد زبان استعمال کرنے میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔

(پیارے لال، جلد اول، صفحہ ۲۵۲)

نوابزادہ لیاقت علی خان نے امریکہ کے ایسوسی ایٹڈ پریس سے کہا ----- "راست اقدام کا مطلب ہے قانون کے خلاف اقدام" غیر آئینی ذرائع کی جانب رجوع، سردار عبدالرب نشتر نے کہا کہ مسلمان عدم تشدد میں یقین نہیں رکھتے۔ خواجہ ناظم الدین نے کہا "ہم عدم تشدد تک محدود نہیں ہیں۔ بنگال کی مسلمان آبادی اچھی طرح جانتی ہے کہ "راست اقدام" کا مطلب کیا ہو گا ہمیں اس سلسلے میں ان کی رہنمائی کے لئے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

اب "راست اقدام" کی پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تیاری شروع ہوئی۔ جو تیاریاں کلکتے میں شروع ہوئیں ان کے متعلق پیارے لال کہتے ہیں۔

"کلکتے میں پیش از وقت ہی راست اقدام کی لمبی چوڑی تیاریاں کی جانے لگیں۔ قانون کے وزیر (منسٹر انچارج) سہروردی نے منظم طور پر ہندو پولیس افسروں کو کلیدی عہدوں سے تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ ۱۶ اگست کو شہر کے ۲۴ پولیس سٹیشنوں میں سے ۲۲ مسلمان افسروں کے کنٹرول میں تھے جب کہ باقی دو میں اینگلو انڈین افسر متعین تھے۔ صوبائی اسمبلی میں اپوزیشن کے انتباہ اور احتجاجوں کے باوجود حکومت بنگال نے ۱۶ اگست کو پورے صوبے میں عوامی تعطیل کا اعلان کر دیا۔ لاٹھیاں، برچھیاں، ہتھوڑے، خنجر اور دیگر مہلک ہتھیار بشمول آتشیں اسلحہ بڑی تعداد میں قبل از وقت تقسیم کئے گئے۔ مسلم لیگ کے

رضاکاروں اور مسلمان غنڈوں کے لئے ٹرانسپورٹ فراہم کی گئی۔ راست اقدام کے موقعے پر راشننگ کی مشکلات دور کرنے کے لئے وزیروں کو خود وزیر اعلیٰ کی طرف سے سینکڑوں گیلن پٹرول کے اضافی کوپن فراہم کئے گئے۔"

"راست اقدام پروگرام ۱۶، ۱۷ اور ۱۸ اگست کو کلکتے میں بھیانک قتل عام کی صورت میں اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گیا۔ ۱۵ اگست کی وسط شب مسلمانوں کے منظم مسلح دستے رات کے سناٹے میں سڑکوں پر انتہاء پسندانہ نعرے لگاتے ہوئے دیکھے گئے۔ ۱۶ اگست کی صبح ابر آلود آسمان کے ساتھ طلوع ہوئی لیکن بارش شام تک نہیں ہوئی۔ مسلمان غنڈے ۱۶ اگست کو علی الصبح ہی اپنے کام میں مصروف ہو گئے -----

"شام تک آتشزنی عام ہوتی گئی اور پھر یہ ہنگامہ آرائی اور ہلڑ بازی اس وقت پورے شہر میں پھیل گئی جب سہروردی کی قیادت میں نکلنے والے جلوس کے میدان سے پلٹنے کے بعد بے لگام ہجوم نے ان لوگوں کو ستانا شروع کیا جنہوں نے ہڑتال میں حصہ نہیں لیا تھا۔ ان کی دکانیں لوٹ لی گئیں اور سامان سڑکوں پر پھینک دیا گیا' نجی کاریں اور ٹرامیں نذر آتش کر دی گئیں۔ راہگیروں پر حملے کئے گئے اور انہیں خنجر گھونپے گئے۔"

کلکتے کے جنرل آفیسر کمانڈنگ جنرل سر فرانس ٹکر اپنی کتاب While Memory Serves میں کلکتے کے اس بھیانک قتل عام کے متعلق لکھتے ہیں۔

"کلکتے کا بھیانک قتل عام ۱۶ اگست کو یوم راست اقدام پر شروع ہوا۔ یہ مون سون کا معمول کا گرم اور پر حبس دن تھا۔ جب مسلمان بڑی تعداد میں اپنے رہنماؤں کی توضیحات سننے کے لئے جمع ہوئے۔ ہندو اور مسلمان جلد ہی اپنے قاتل چھرے پکڑ کر ایک دوسرے کی جانب متوجہ ہو گئے۔ کلکتے کے مجرموں نے شہر کا انتظام سنبھال رکھا تھا ----- منڈی مردہ جسموں سے پٹی پڑی تھی ----- ایک کمرے میں ۱۵ لاشیں پڑی تھیں اور دوسرے میں ۱۲

----- ہم نے دو بچوں کو بچایا' دونوں زخمی تھے اور دوسرا تقریباً مفلوج ہو چکا تھا۔ جیسا کہ توقع کی جا سکتی تھی وہ حواس باختہ اور بوکھلائے ہوئے تھے ----- منڈی میں ہلاک ہونے والے بیشتر افراد کو ہلکا سا علم بھی نہ تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں -----"

پیارے لال "آخری دور" کی جلد اول کے صفحہ ۲۵۵ پر لکھتے ہیں۔

"کچھ بستیوں میں لوٹ مار اور قتل و غارت ۴۰ گھنٹے جاری رہی۔ سڑکیں مردہ جسموں سے اٹ گئیں۔ سڑی اور گلتی ہوئی لاشوں کی بدبو سے فضا بھر گئی جو کئی روز تک وہاں جوں کی توں پڑی رہیں۔ لاشوں کو مین ہولوں میں دھکیل دیا گیا جس سے گٹر بند ہو گئے۔ گلیوں میں لاشوں کے انبار پڑے تھے جنہوں نے آوارہ کتوں، گیدڑوں اور گِدھوں کو ہولناک ضیافت فراہم کی۔ لاشیں دریاؤں میں تیرتی ہوئی نظر آئیں۔ ایسی کہانیاں بھی سننے میں آئیں کہ بچوں کو اٹھا اٹھا کر گھروں کی چھتوں سے پھینکا گیا یا زندہ جلا دیا گیا۔ عورتوں کی عصمت دری اور آبرو ریزی کی گئی اور انہیں قتل کیا گیا۔

۲۰ اگست ۱۹۴۶ء کو "دی سٹیسمین" میں چھپنے والے ایک آرٹیکل میں بتایا گیا۔

ایک بڑے صوبے کے دارالحکومت میں ہونے والے ہولناک قتل عام اور نقصان کی وجہ مسلم لیگ کی جانب سے ایک سیاسی مظاہرہ تھا ----- ہمارے خیال میں یہ ہندوستان کی تاریخ کا بدترین فرقہ وارانہ فساد تھا ----- ملک کا سب سے بڑا شہر جس طرح خون آلود ملبے کے ڈھیر میں بدل دیا گیا وہ ایک نہایت شرمناک واقعہ تھا جس نے بنگال کی حکومت کی واضح طور پر مسلم لیگ کی حکومت ہونے کے باعث' مسلم لیگ کی ہندوستان گیر ساکھ کو بری طرح داغدار کر دیا ہے۔"

"سٹیسمین" کے ایک اور آرٹیکل میں کہا گیا۔

"گزشتہ ہفتے ہندوستان کے سب سے بڑے شہر میں ہونے والا واقعہ محض اس مفہوم میں فرقہ وارانہ فساد نہیں تھا جس مفہوم میں ہم اس خون آشام اصطلاح سے واقف ہیں۔ ۳ دن تک شہر ایک بے قابو خانہ جنگی کا منظر پیش

کرتا رہا۔ جن پر اس کا بنیادی قصور عائد ہوتا ہے وہ صاف ظاہر ہیں۔ اولین الزام اسی پر عائد ہوتا ہے جس کا ہم نے بلا اشتباہ تذکرہ کیا ہے۔ ----- یعنی صوبائی مسلم لیگی کابینہ جس کی ذمہ داری بنگال میں قانون اور امن و امان کو بحال رکھنا ہے"

کلکتے میں مسلم لیگ کے راست اقدام نے مطلوبہ نتیجہ حاصل نہیں کیا کیونکہ خود مسلمانوں کا اپنا بھی بے پناہ جانی نقصان ہوا۔ کلکتہ کی بندرگاہ میں مرنے والے مزدور زیادہ تر مشرقی بنگال کے مسلمان تھے جو نواکھلی اور گردونواح کے اضلاع سے آئے تھے۔ نواکھلی میں لیگی ارکان نے نعرہ بلند کیا کہ "کلکتے کا انتقام ضرور لیا جانا چاہیے" نواکھلی میں ہندو نہایت قلیل تعداد میں تھے۔ ان کا جان و مال لاقانون مسلمانوں کے رحم و کرم پر تھا۔ یہاں ہر طرف قتل و غارت اور آتشزنی کا راج رہا۔ ۲۶ اکتوبر کے "سٹیٹسمین" کلکتہ نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ----- "ہر طرف آتشزنی' لوٹ مار' قتل و غارت' عورتوں کا اغواء' مذہب کی جبری تبدیلی اور جبری شادیاں نظر آرہی ہیں۔" جس نے رائے عامہ کو مزید متنفر اور مشتعل کیا وہ محض قتل عام اور مار دھاڑ کے علاوہ عورتوں کے خلاف جرائم تھے۔ اس پر اشتعال بنگال کی حدود سے باہر بھی دور دور تک پھیل گیا۔

نواکھلی کے واقعات نے ہندوستان کے متعدد علاقوں میں ہندوؤں میں رد عمل اور انتقام پیدا کیا۔ بہار کے واقعات اس سے بھی زیادہ بھیانک اور ہولناک تھے۔ یہاں کئی ہزار مسلمان قتل کئے گئے۔ وائسرائے اور نہرو فوراً پٹنہ پہنچے اور تمام سول اور فوجی دستوں کو صورتحال پر قابو پانے کے لئے تعینات کیا۔ اس طرح ایک ہفتے کے اندر یہاں حالات معمول پر آئے۔

باب نمبر30

گروہ بندی کی شقوں کی تشریح پر شدید اختلاف ○ کابینہ مشن منصوبے کو سبوتاژ کرنے میں گاندھی جی کی کامیابی (۱۹۴۶ء)

ہم یاد کر سکتے ہیں کہ ۱۶ مئی کو پیش کیے جانے والے کابینہ مشن منصوبے میں مسلمانوں کو پاکستان کا ماحصل ہندوستان کے وفاقی ڈھانچے کے اندر فراہم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا گیا تھا۔ پاکستان کا ماحصل صوبوں کی ۳ سیکشنوں میں گروہ بندی کے ذریعے دیا جانا تھا ----- مشرق اور مغرب میں مسلم اکثریت کی دو سیکشن اور ہندو اکثریت کا ایک وسطی سیکشن، کس مخصوص صوبے کی شمولیت کس سیکشن میں ہو گی اس کا تعین بھی مشن کی دستاویز میں کر دیا گیا تھا۔

کابینہ مشن منصوبے میں گروہ بندی کی شقوں کی تشریح پر بعد ازاں جو مشکلات پیدا ہوئیں ان کے پیش نظر یہاں ان شقوں کا تذکرہ کرنا ضروری ہے۔

پیرہ ۱۹ (۵) ----- یہ سیکشن اپنے اندر شامل صوبوں کے لئے آئین سازی کریں گے اور اس امر کا فیصلہ بھی کریں گے کہ آیا ان صوبوں کے لئے کوئی اجتماعی آئین تشکیل دیا جائے گا یا نہیں اور اگر ایسا ممکن ہو تو گروپ کن صوبائی امور سے معاملہ رکھے گا۔ مندرجہ ذیل ضمنی شق (۸) کے مطابق صوبوں کے پاس اپنے گروہوں سے نکلنے یا علیحدہ ہونے کا اختیار بھی ہونا چاہیے۔

پیرا ۱۹ (۸) ----- جونہی نئے آئینی معاہدے نافذ العمل ہوں گے ہر صوبے کو اختیار حاصل ہو گا کہ وہ اس گروہ سے علیحدہ ہو سکے جس میں اسے شامل کیا گیا تھا۔ یہ فیصلہ نئی آئین ساز اسمبلی کے تحت منعقدہ پہلے عام انتخابات کے نتیجے میں قائم ہونے والی صوبائی مقننہ کی جانب سے کیا جائے گا۔

اسی دستاویز کے ایک اہم پیرا گراف نمبر ۱۵ کی شق نمبر ۵ میں یہ بھی کہا گیا کہ

"صوبوں کو انتظامیہ اور مجالس قانون ساز کے ساتھ گروہ بندی کرنے میں آزاد ہونا چاہئے"

اگلے ہی روز یعنی ۱۷ مئی کو کابینہ مشن نے ایک پریس کانفرنس بلائی جس میں ایک اخباری نمائندے نے پیرا نمبر ۱۵ کی پانچویں شق سے متعلق ایک خصوصی سوال پوچھا کہ کیا ابتدائی مرحلے میں بھی کوئی صوبہ کسی گروپ سے باہر رہنے میں آزاد ہو گا۔ مشن نے اس کا دو ٹوک جواب اس انداز میں دیا۔

"صوبے خود بخود اے' بی اور سی سیکشنوں میں شامل ہوں گے جو کہ ان کے لئے اس دستاویز میں طے کئے گئے ہیں اور ابتدا" وہ انہی مخصوص گروہوں میں شامل ہوں گے۔ جو ان کے لئے دستاویز نے منتخب کیے ہیں۔ اور ایک مخصوص سیکشن فیصلہ کرے گا کہ آیا کوئی گروہ بنایا جانا چاہئے اور سیکشن اور گروہ میں شامل صوبوں کے لئے آئین کیا ہونا چاہئے۔ سیکشن کے ذریعے قائم کردہ گروہ سے نکلنے کا حق اس وقت عمل میں آئے گا جب آئین سازی کے بعد اس آئین کے تحت مجلس قانون ساز کے قیام کے لئے پہلے انتخابات ہو جائیں۔ یہ مسئلہ اس سے پہلے نہیں اٹھایا جا سکتا"

گروہ بندی کے معاملے پر گاندھی جی کے رد عمل کا اظہار ۱۸ مئی کی شام کو ان کی دعائیہ تقریر میں ہوا جس میں انہوں نے کہا کہ عوام کو لازما" سمجھنا چاہئے کہ یہ سکیم محض سفارشات پر مبنی ہے یہ کوئی ایوارڈ (قانون یا حتمی فیصلہ) نہیں ہے۔ چنانچہ آئین ساز اسمبلی ان سفارشات کو بدلنے' مسترد کرنے یا بہتر بنانے میں آزاد ہے۔ انہوں نے ۲۶ مئی کے ہریجن' میں اس موضوع پر اپنے خیالات کا مزید صراحت سے اظہار کیا۔

"حکومت برطانیہ کی ایماء پر وائسرائے اور کابینہ مشن کی جانب سے جاری کردہ سرکاری اعلان نامے کی ۴ روزہ چھان بین کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ ایک بہترین دستاویز ہے جو حکومت برطانیہ ان حالات میں تیار کر سکتی تھی۔ اب تک تو یہ مکمل ہے لیکن اکائیوں کا کیا ہو گا؟ کیا سکھ جن کے لئے پورے

ہندوستان میں صرف پنجاب اپنا صوبہ ہے' اپنی مرضی کے خلاف خود کو ایسے سیکشن کا حصہ تسلیم کر سکتے ہیں جس میں سندھ' بلوچستان اور سرحدی صوبہ شامل ہوں۔ میری رائے میں دستاویز کا رضاکارانہ کردار اس امر کا متقاضی ہے کہ کسی انفرادی صوبے کی آزادی میں خلل نہ پڑے۔ کسی بھی رکن اور سیکشن کو اس میں شمولیت کی آزادی ہونی چاہئے۔ الگ ہونے کی آزادی ایک انگ تحفظ ہے۔ یہ اس آزادی کا متبادل قطعاً" نہیں ہو سکتی جو کہ پیراگراف نمبر ۱۵ کی شق نمبر ۵ میں پنہاں ہے۔"

بہت جلد گروہ بندی کے معاملے پر تنازع اٹھ کھڑا ہوا۔ کانگریس کے آسام سے تعلق رکھنے والے رہنماؤں نے گروپ سی میں شمولیت پر اعتراض کیا جس میں ان کا ساتھی صوبہ بنگال ہوتا ----- جو ایک مسلم اکثریت کا صوبہ تھا۔ مولانا آزاد کی خود نوشت سوانح عمری کے مطابق ابتدا" پنڈت نہرو اور سردار پٹیل آسام کے اعتراضات کو زیادہ توجہ دینے کی جانب مائل نہ تھے لیکن معترضین کو جلد ہی گاندھی جی کی شکل میں ایک بہت بڑا حامی مل گیا جنھوں نے آسام کے کانگریسی رہنماؤں کے موقف کی حمایت میں بیان پر بیان جاری کیا۔ اب کابینہ مشن کی ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کی دستاویز میں' "گروہ بندی" کے نکتے کی تشریح کا سوال بنیادی اہمیت کا حامل بن گیا۔ کانگریس نے کہا کہ اس کی تشریح عدالت سے کروائی جائے۔

لیکن کابینہ مشن اور مسلم لیگ

دونوں نے کہا کہ یہ دستاویز ایک سرکاری اعلان نامہ ہے جس کی عدالتی تشریح کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان حالات میں وزیراعظم اٹیلی نے مفاہمت کے نقطہ نظر سے دونوں فریقوں کو لندن میں کانفرنس میں مدعو کیا۔ دعوت کے نتیجے میں جناح' لیاقت علی' نہرو اور سردار بلدیو سنگھ لارڈ ویول کی ہمراہی میں لندن پہنچے۔ لیکن کوئی نتیجہ نہ نکل سکا۔ ۶ دسمبر کو برطانوی کابینہ نے ایک بیان جاری کیا جس میں ۱۶ مئی کی کابینہ مشن کی دستاویز میں متنازع

فیہ شقوں کے متعلق کانگریس کی تشریح کو مسترد کر دیا گیا۔" یہ بھی بتایا گیا کہ تشریح کرنے میں برطانوی کابینہ نے اپنے قانونی اہلکاروں کی رائے بھی حاصل کی ہے۔

حکومت برطانیہ کی جانب سے کابینہ مشن منصوبے کی تشریح پر گاندھی جی کے رد عمل کے متعلق شری پیارے لال اپنی کتاب "مہاتما گاندھی ----- آخری دور" کی جلد اول کے صفحہ ۴۷۷' پر لکھتے ہیں۔

"حکومت برطانیہ کے ۶ دسمبر کے فیصلے نے آسام اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے عوام کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔ اگر گروہ بندی کی شقوں سے متعلق مشن کی تشریح قبول کر لی جائے تو آسام جہاں ہندو اور کانگریسی اکثریت میں ہیں' بنگال کی مسلم لیگی حکومت کے زیر اثر آجائے گا جس کا ناطہ پاکستان سے جڑا ہوا ہے ----- کیا آسام کو باقی ہندوستان کو ترقی سے نہ روکنے کے لئے اپنی بھینٹ یا قربانی دے دینی چاہئے؟-----

"لیکن آسام کو حوصلہ نہیں ہارنا چاہئے۔ اسے (اس) سیکشن میں شامل نہیں ہونا چاہئے۔ "کوئی بھی آسام کو ایسا کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا جو وہ نہیں کرنا چاہتا" اسے احتجاج کرنا چاہئے' آئین ساز اسمبلی سے الگ ہو جانا چاہئے اور خود مختار اکائی کے طور پر اپنا دستور تشکیل دے لینا چاہئے۔ "محض ایک صوبہ ہی نہیں ایک فرد تک کانگریس کے خلاف بغاوت کر سکتا ہے اور اگر وہ صوبہ یا فرد درست ہے تو بغاوت کے ذریعے وہ کانگریس کا بھلا ہی کرے گا۔ میں خود بھی ایسا کر چکا ہوں۔ یہ ایک طرح سے کانگریس کی بہتری کے لئے اسی کے خلاف ستیہ گرہ ہو گا-----"

یہ تھی وہ پس پردہ نفسیات جو اس وقت گاندھی جی کے ذہن میں کام کر رہی تھی جب انہوں نے آسام کے اس نام نہاد انکار کی حمایت میں اس قدر شدید رویہ اختیار کیا کہ وہ بنگال کے ساتھ ایک ہی گروپ میں شامل نہیں ہونا چاہتا۔ یہ قطعاً" فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ آسام ایک کثیر نسلی اور کثیر لسانی صوبہ ہے جہاں آسامی ہندو' اعلیٰ تعلیم یافتہ پہاڑی افراد' قدیم قبائلی اور بنگالی بولنے والے ہندو اور مسلمان آباد ہیں۔ یہ بنگالی بولنے

والے ہندو اور مسلمان جو کل آسامی آبادی کا ایک تہائی تھے یقیناً بنگال کے ساتھ ایک ہی گروپ میں شامل ہونے کو ترجیح دیتے' آسامی بولنے والے مسلمانوں کی ترجیح بھی یہی ہوتی جب کہ پہاڑی افراد اور قبائلی اس معاملے سے لاتعلق تھے۔ صرف آسامی بولنے والے ہندو جن کی قیادت گوپی ناتھ بردولوئی اور ان کے کانگریسی رفیق کر رہے تھے' بنگال کے ساتھ ایک ہی گروپ میں شامل ہونے پر رضامند نہ تھے جب کہ ان کی تعداد کل آبادی کے ۲۵ فی صد سے زیادہ نہ تھی۔ مندرجہ بالا حقائق کے تناظر میں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ آسام کی بنگال کے ساتھ گروہ بندی کے مسئلے پر گاندھی جی کا رویہ' نرم ترین الفاظ میں نہایت افسوسناک تھا اور بے حد شدید خطرے کا پیش خیمہ تھا۔ اپنے ردعمل کے اظہار کے لئے گاندھی جی نے جو زبان استعمال کی وہ بھی بہت ناگوار تھی۔ اس کا بدترین پہلو یہ تھا کہ انہوں نے کھلے عام کانگریسی آسامیوں کو کانگریس کے خلاف بغاوت پر اکسایا اور ستیہ گرہ کی جانب مائل کیا۔ وہ کابینہ مشن کے "گروہ بندی" کے منصوبے کو سبوتاژ کرنے کے لئے آخری حد تک جانے کے لئے بھی تیار تھے۔

گاندھی جی کے اس رویے کے پیش نظر غالباً ان کی اس نفسیات پر قیاس آرائی بے جا نہ ہو گی جس نے انہیں یہ رویہ اپنانے پر اکسایا۔ کابینہ مشن کے نتیجے میں پاکستان کا مکمل قیام یا اس کی نیم تکمیل شدگی کا مطلب گاندھی جی کے اس خواب کا خاتمہ تھا جو انہوں نے ہندوستان پر اپنا تسلط قائم کرنے کی صورت میں دیکھا تھا۔ چنانچہ انہوں نے خود کو آخری جنگ کے لئے تیار کر لیا۔ گروہ بندی کی شقوں کی تشریح بشمول مسئلہ آسام نے انہیں جنگ کا ایک عمدہ جواز فراہم کیا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ آئین ساز اسمبلی کے ذریعے وہ اس مقصد کے حصول کے قابل ہوں گے چنانچہ وہ گروہ بندی کی شقوں سے متعلق اپنی ذاتی تشریح سے ایک انچ سرکنے پر تیار نہ تھے۔ اس ضمن میں ان کے بے لچک رویے کا اظہار ان مذاکرات سے بھی ہوتا ہے جو انہوں نے نہرو کے ہمراہ ۲۷ اگست ۱۹۴۶ء کو لارڈ ویول سے اس وقت کیے جب لارڈ ویول کلکتے سے واپس لوٹے۔ جب ۱۶

اگست کو مسلم لیگ کے "یوم راست اقدام" پر کلکتے میں بھیانک قتل عام کا سلسلہ شروع ہوا تو ۳ روز میں مرنے والوں کی تعداد ۶۰۰۰ اور زخمی ہونے والوں کی تعداد ۲۰،۰۰۰ سے بڑھ گئی۔ گاندھی، نہرو اور جناح اس بدترین تباہی سے یکسر لاتعلق رہے اور اخباری بیانات جاری کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا۔ یہ صرف لارڈ ویول تھے جو جائے حادثہ پر پہنچے۔

لارڈ ویول نے جو کچھ کلکتے میں دیکھا اس نے انہیں وحشت زدہ کر دیا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ مزید خونریزی کو روکنے کے لئے دو راستے ہیں۔ ایک یہ کہ کانگریس اور لیگ کو قائل کیا جائے کہ وہ اکٹھی ہو جائیں اور مرکز میں ایک مخلوط حکومت بنالیں اور دوسرا یہ کہ برطانوی فوجی دستوں کو متعین کر کے فسادات کو بے رحمی سے دبا دیا جائے۔ لیکن وہ دوسرے طریقے کو بروئے کار لانے کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے پہلے کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کے پیش نظر انہوں نے مسلم لیگ کے ایک بارسوخ رہنما خواجہ ناظم الدین سے رابطہ قائم کیا، جن کی شنوائی جناح کے سامنے ہو سکتی تھی۔ ناظم الدین نے بے حد معقول رویہ اپنایا اور کہا کہ وہ جناح کو مخلوط وزارت پر منانے پر قائل کریں گے بشرطیکہ کانگریس ایک واضح اور دو ٹوک بیان جاری کرے کہ وہ کابینہ مشن منصوبے کو مع تشریحات تسلیم کرتی ہے۔ خواجہ ناظم الدین نے کہا کہ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ کابینہ مشن منصوبے کو کانگریسی رہنماؤں کے رحم و کرم پر نہ چھوڑا جائے بلکہ مشن کے واضح اداروں کے مطابق اسے چلنے یا بروئے کار آنے کا منصفانہ موقع دیا جائے۔ کلکتے سے واپسی پر لارڈ ویول نے گاندھی جی اور پنڈت نہرو کو ۲۷ اگست کو مذاکرات کے لئے بلایا اور ان کے سامنے ناظم الدین کی تجویز پیش کی۔ دونوں رہنماؤں نے ایسا کوئی بیان دینے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ وہ منصوبے کی اپنی ہی تشریح پر قائم رہیں گے۔ اس موقعے پر گاندھی جی کا "میں نہ مانوں" رویہ ان کے ان خیالات سے قطعاً برعکس تھا جو انہوں نے خود اپنے "ہر برطانوی کے نام خط" میں ظاہر کئے تھے۔ یہ خط جنگ کے تاریک ایام میں لکھا گیا تھا جس میں انہوں نے برطانوی عوام سے کہا تھا کہ وہ مزید خونریزی کو

روکنے کے لئے اپنے خوبصورت گھر اور اپنے تمام اثاثے جرمن نازیوں اور اطالوی فسطائیوں کے حوالے کر دیں۔

لیونارڈ موزلے نے اپنی کتاب "برطانوی راج کے آخری ایام" میں دونوں رہنماؤں کی لارڈ ویول سے بات چیت کی دلچسپ نقشہ کشی کی تھی۔ مندرجہ ذیل مکالمات اسی کتاب سے لئے گئے ہیں۔

ویول مجھے سادہ سی ضمانت دیجئے کہ آپ کابینہ مشن منصوبے کو قبول کرتے ہیں۔

گاندھی جی ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ ہم اسے تسلیم کرتے ہیں لیکن ہم کوئی ایسی ضمانت دینے پر تیار نہیں کہ ہم اسے اس انداز میں قبول کرلیں گے جس طرح کابینہ مشن نے اسے پیش کیا ہے۔ ان کی تجاویز کے متعلق ہماری اپنی تشریحات ہیں۔

ویول اس صورت میں بھی اگر آپ کی تشریحات کابینہ مشن کے مقاصد سے مختلف ہوں"

گاندھی جی بے شک، کسی بھی صورت میں کابینہ مشن منصوبے کا حقیقی مفہوم وہ نہیں جو کابینہ مشن نے خود سوچا ہے بلکہ اس کا درست مفہوم وہ ہے جو عبوری حکومت (پنڈت نہرو کی حکومت) درست خیال کرتی ہے۔

ویول کیا آپ نہیں دیکھتے کہ اس لمحے وقت کا تقاضا مسلم لیگ کو مطمئن کرنا ہے اور کیا آپ ان کی ٹانگ کھینچنے کی کوشش نہیں کر رہے؟ غالباً یہ ہمارے پاس آخری لمحہ ہے کہ ہم لیگ اور کانگریس کو اکٹھا کر سکیں۔ اور جس کا میں مطالبہ کر رہا ہوں وہ صرف ضمانت ہے۔ کیا کانگریس ایسا اعلان کرنے کا وعدہ کرتی ہے جو مسلم لیگ کو مطمئن کر دے اور ایک مستحکم اور واحدانی حکومت کے تسلسل کی ضمانت دے سکے؟

پھر ویول نے اپنی دراز کھولی اور ایک کاغذ نکالا۔ "یہ ہے وہ جو میرے ذہن میں ہے"

اعلان نامہ یہ ہے "کانگریس فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے مفادات میں ۱۶ مئی کی دستاویز (کابینہ مشن کی دستاویز) کے مقاصد کو تسلیم کرنے پر رضامند ہے کہ صوبے کسی سیکشن یا گروپ کی تشکیل کی صورت میں اپنی رکنیت کے متعلق کوئی رائے دینے کے مجاز نہیں ہوں گے جب تک کہ ۱۶ مئی کی دستاویز کے پیراگراف نمبر ۱۹ کی ساتویں شق کے مطابق دستوری انتظامات کے بعد نئی مقننہ وجود میں آکر کام شروع نہیں کرتی اور پہلے عام انتخابات منعقد نہیں ہوتے" (اس کے بعد صوبوں کو کسی گروپ سے علیحدہ ہونے کی اجازت ہوگی)۔

گاندھی جی نے یہ کاغذ نہرو کو پکڑا دیا جنہوں نے اسے پڑھ کر کہا "اسے تسلیم کرنے کا مفہوم یہ کہنے کے مترادف ہے کہ کانگریس سے خود کو زنجیروں میں جکڑ لینے کی فرمائش کی جائے۔"

ویول جہاں تک کابینہ مشن کا تعلق ہے؟ میں یہی محسوس کرتا ہوں کہ مجھے ایسا کرنا چاہئے جب کانگریس نے پہلے مرحلے میں کابینہ مشن منصوبے کو منظور کیا تھا' میں نہیں مان سکتا کہ آپ اس وقت اس کے مضمرات سے آگاہ نہیں تھے۔ اگر ایسی بات تھی تو آپ نے آخر اسے منظور کیا ہی کیوں تھا؟ ملک کو گروپوں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ تو واضح طور پر اس میں شامل تھا۔ اب آپ اس سے پھر نہیں سکتے اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ اس کے مقاصد سے آگاہ نہیں تھے۔

گاندھی جی جو کابینہ مشن کے مقاصد تھے اور جس طرح ہم اس کی تشریح کرتے ہیں کہ اس کے مقاصد کیا تھے' ان دونوں کا یکساں ہونا لازمی نہیں۔

ویول یہ ایک وکیل کی گفتگو ہے۔ مجھ سے سادہ انگریزی میں بات کریں۔ میں ایک سیدھا سادہ سپاہی ہوں اور آپ مجھے وکیلانہ دلائل میں الجھا رہے ہیں۔

نہرو ہم وکیل ہونے کے ناطے اس سے گریز نہیں کر سکتے۔

ویول نہیں' آپ مجھ سے ایسے دیانتدار انسانوں کی طرح بات کر سکتے ہیں۔ جو ہندوستان کے مستقبل اور فلاح میں دلچسپی رکھتے ہوں۔ کابینہ مشن نے اپنے

مقاصد دن کی روشنی کی طرح واضح کیے ہیں۔ یقیناً ہمیں ان کے متعلق قانون سے رجوع کرنے یا قانونی موشگافیوں میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایک عام انسان کی حیثیت سے بھی مجھے صورتحال نہایت سادہ دکھائی دیتی ہے۔ اگر کانگریس مجھے یہ ضمانت دے دے جس کے لیے میں کہہ رہا ہوں تو میرے خیال میں میں مسٹر جناح اور مسلم لیگ کو قائل کر سکتا ہوں کہ وہ عبوری حکومت میں شامل نہ ہونے کے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں۔ ہمیں حکومت میں ان کی ضرورت ہے' ہندوستان کو ان کی ضرورت ہے اور اگر آپ خانہ جنگی کے خطرات کے متعلق سنجیدگی سے متفکر ہیں ---- تو آپ کو اور مجھے جان لینا چاہئے کہ خطرہ بہت شدید ہے۔ اس پر بھی' آپ کو ان کی ضرورت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان حالات میں یہ نہایت غیر دانشمندانہ بلکہ تباہ کن ہو گا اگر میں کانگریس کو ذاتی عبوری حکومت بنانے کی اجازت دے دوں۔

گاندھی جی لیکن آپ پہلے اعلان کر چکے ہیں کہ حکومت وجود میں آئے گی۔ اب آپ اپنے الفاظ سے منحرف نہیں ہو سکتے۔

ویول صورتحال بدل چکی ہے۔ کلکتے میں قتل عام کے نتیجے میں ہندوستان خانہ جنگی کے دہانے پر کھڑا ہے۔ اسے روکنا میرا فرض ہے۔ لیکن اگر میں صرف کانگریسیوں کو مسلمانوں کے بغیر عبوری حکومت بنانے کی اجازت دے دوں تو میں اس خانہ جنگی کو نہیں روک رہا کیونکہ اس صورت میں مسلمان فیصلہ کریں گے کہ راست اقدام ہی واحد راستہ ہے پھر ہم بنگال کا قتل عام پورے ہندوستان میں دیکھیں گے۔

نہرو بالفاظ دیگر آپ مسلم لیگ کی بلیک میلنگ کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر رضا مند ہیں۔

ویول (سخت مشتعل ہو کر) خدا کے لئے' محترم' آپ بلیک میلنگ کی بات کرنے

والے کون ہیں"

۲۷ اگست کو ویول' گاندھی اور نہرو کی ملاقات کے بعد واقعات نے ایک نیا رخ اختیار کرلیا۔ اسی رات گاندھی جی نے وزیراعظم اٹیلی کو انگلستان تار بھیجی جس میں انہوں نے کہا کہ کلکتے کے قتل عام نے وائسرائے کے اعصاب شل کر دیے ہیں اور انہیں معاونت کے لئے ایک قابل اور قانونی ذہن کی ضرورت ہے۔ اس تار نے اٹیلی کے ذہن پر کچھ اثرات مرتب کئے اور اس کے بعد وہ ایک مناسب انسان کی تلاش میں رہنے لگے جسے لارڈ ویول کی جگہ وائسرائے مقرر کیا جا سکے۔

باب نمبر31(ا)

(ا) عبوری حکومت کا قیام اور جانشینی کے لئے جنگ کا آغاز ○ لارڈ ویول کی برطرفی (۷-۱۹۴۶ء)

۲۷ اگست کو ویول- گاندھی- نہرو مذاکرات کے بعد ویول کو یقین ہو گیا کہ اس وقت تک کوئی عبوری حکومت قائم نہیں ہونی چاہئے جب تک کانگریس اور لیگ ایک مخلوط حکومت بنانے پر متفق نہ ہوں ایٹلی نے بہرطور، ویول سے اتفاق نہیں کیا کیونکہ وہ عبوری حکومت کا فوری قیام چاہتے تھے۔ چنانچہ لارڈ ویول نے مرکز میں عبوری مخلوط حکومت کے قیام کے لئے پیش رفت کا آغاز کر دیا۔ جناح نے اپنا پرانا کھیل پھر سے کھیلنا شروع کیا اور مسلم لیگ کے ایماء پر مطالبہ کیا کہ کابینہ میں تمام مسلمان ارکان کو نامزد کرنے کا حق صرف مسلم لیگ کو ہونا چاہئے۔ کانگریس نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ ان حالات میں لارڈ ویول نے ہچکچاتے ہوئے ایک عبوری حکومت لیگ کی شمولیت کے بغیر قائم کر دی۔ اس حکومت میں پنڈت نہرو نائب صدر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ بعد ازاں مسلم لیگ نے اپنا ذہن بدل لیا اور حکومت میں شامل ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو اپنے خط میں جناح نے واضح کیا کہ لیگ نے حکومت میں شامل ہونے کا ارادہ کر لیا ہے کیونکہ وہ محسوس کرتی ہے کہ پورا انتظامی میدان کانگریس کے ہاتھوں میں دے دینا مسلمانوں کے مفادات کے لئے زہر قاتل ثابت ہو گا۔ حکومت میں شمولیت کے بعد بہرکیف لیگ نے نہایت بے حسی کا رویہ اختیار کیا۔ پنڈت نہرو اگرچہ کونسل کے نائب صدر تھے لیکن ان کی عملی حیثیت وزیراعظم کی سی تھی۔ لیگ کے ارکان ان کی اس حیثیت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ لیاقت علی نے کہا کہ عبوری حکومت دو مختلف رہنماؤں کی قیادت میں دو مختلف دھڑوں پر مشتمل ہے۔ لیگی ارکان کے مطابق آئین نے نائب صدر کو اس سے

زیادہ بڑھ کر کوئی پر شکوہ رتبہ عطا نہیں کیا کہ وہ صرف وائسرائے کی غیر حاضری میں اجلاسوں کی صدارت کرے۔ انہوں نے مشترکہ کابینہ کی حکومت کے تصور کا مضحکہ اڑایا۔ جناح نے ایک تلخ بیان میں کہا۔ اگر نہرو صرف زمین پر اتر سکیں اور ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچ سکیں تو انہیں لازماً سمجھ آجائے کہ نہ تو وہ وزیراعظم ہیں اور نہ ہی یہ ایک نہرو حکومت ہے۔ وہ صرف محکمہ خارجہ امور اور دولت مشترکہ کے ایک رکن ہیں۔" جب نہرو نے حکومت کو وائسرائے کی انتظامی کونسل کی بجائے کابینہ کہنے پر اصرار کیا تو جناح نے حقارت سے کہا۔ "چھوٹی چیزیں چھوٹے دماغوں کو خوش کرتی ہیں اور آپ ایک گدھے کو ہاتھی کہہ کر اسے ہاتھی میں نہیں بدل سکتے" ان حالات میں مخلوط حکومت ابتدا ہی سے نامرادی کا شکار ہو گئی۔ کونسل پیمبر اب جانشینی کی جنگ کا میدان بن گیا۔ عبوری حکومت میں شامل ہونے کے محض ایک ہفتے کے بعد ہی غضنفر علی خاں نے لاہور کے طلباء سے ایک شعلہ خیز خطاب کیا جس میں انہوں نے کہا۔

"ہم عبوری حکومت میں اس لئے شامل ہوئے ہیں کہ اپنے محبوب مقصد پاکستان کی جنگ لڑنے کے لئے قدم جما سکیں۔ عبوری حکومت" "راست اقدام تحریک ہی کا ایک محاذ ہے"

(آخری دور از پیارے لال' صفحہ ۲۸۳)

اصفہانی نے جنہوں نے امریکہ میں خود کو جناح کا ذاتی ایلچی کہا' وہاں ریڈیو پر ایک نشریئے میں کہا۔

"لیگ حکومت میں (اس لئے) شامل ہوئی ہے ----- بنیادی طور پر سرکاری مشینری کو کم از کم جزوی طور پر اپنے سیاسی مخالفین کے اجارادارانہ کنٹرول سے آزاد کروانے کے لئے۔ نئی حکومت میں لیگ کی شمولیت ----- کا صرف یہ مطلب ہے کہ پاکستان کی جدوجہد اب حکومت کے اندر اور باہر حکومت کے بغیر بھی کی جائے گی"

(ایضاً صفحہ ۲۸۹)

کانگریس کی طرف سے بھی ایک شکایت تھی کہ حکومت کے اندر "راست اقدام" کے طور پر ان تمام محکموں میں مسلمانوں کو کلیدی عہدوں پر فائز کیا گیا تھا جو مسلم لیگ کے ارکان کے کنٹرول میں تھے۔ دریں اثناء ایک اور بحران اٹھ کھڑا ہوا۔ وزیر خزانہ لیاقت علی نے ان تمام افراد پر بھاری ٹیکس عائد کر دیا جن کی کاروباری آمدنی ایک لاکھ روپے سے زیادہ تھی۔ انہوں نے ایک انکم ٹیکس تفتیشی کمیشن قائم کرنے کی تجویز بھی پیش کی تاکہ کاروباری افراد اور صنعتکاروں پر لگائے گئے ان الزامات کی تحقیقات کروائی جا سکے کہ انہوں نے جنگی ٹھیکوں کے ذریعے بھاری منافع کما کر اس پر ٹیکس چوری کیا ہے۔ لیاقت علی نے وضاحت کی کہ ان کا بجٹ اور دیگر تجاویز ان اصولوں پر مبنی ہیں جن کا اعلان کانگریس کے ذمہ دار ارکان خصوصاً کانگریس کے سربراہ پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا تھا۔ بدقسمتی سے یہ تمام ٹیکس چور کانگریس کے بنیادی سرپرست اور مالی معاونین تھے۔ کانگریس کے دائیں بازو نے ان بجٹ تجاویز کی شد و مد سے مخالفت کی جس کی قیادت سردار پٹیل اور راج گوپال اچاریہ کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ تجاویز فرقہ وارانہ مفادات کی اساس پر پیش کی گئی ہیں اور ان کا مقصد ہندو سرمایہ داروں کو نقصان پہنچانا ہے۔ انہوں نے یہ دلیل بالکل قبول نہیں کی یہ تجاویز کانگریس کے اعلانیہ اصولوں سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں۔

اس طرح خود کابینہ میں بحران پیدا ہوتے رہے۔ اسی اثناء میں ۲۹ جنوری ۱۹۴۷ء کو کونسل آف لیگ نے اپنے اجلاس کراچی میں ایک انتہا پسندانہ قرارداد منظور کی۔ اس قرارداد میں حکومت برطانیہ سے کہا گیا کہ وہ اعلان کر دے کہ ۱۶ مئی کا منصوبہ ناکام ہو چکا ہے اور یہ مطالبہ بھی کیا کہ آئین ساز اسمبلی کو بھی تحلیل کر دیا جائے۔ چنانچہ بشمول اقلیتی ارکان، عبوری حکومت کے ۹ ارکان نے لارڈ ویول کو نشاندہی کی کہ مسلم لیگ کی قرارداد محض آئین ساز اسمبلی کی تحلیل کے لئے نہیں بلکہ کابینہ مشن منصوبے کے مکمل

استرداد کے لئے ہے۔ مزید برآں اس میں ۱۹۴۶ء کی "راست اقدام" قرارداد کو واپس لینے سے انکار بھی شامل ہے۔ ان کے مطابق ان حالات میں مسلم لیگ کے ارکان کے آئین ساز اسمبلی میں موجود رہنے سے کوئی مفید مقصد حاصل نہیں ہو رہا تھا۔ نہرو اور سردار پٹیل نے اعلان کر دیا کہ اگر لیگ کے ارکان کو کابینہ میں موجود رہنے کی اجازت دی گئی تو کانگریس مستعفی ہو جائے گی۔ اگر لیگ اپنی قرارداد کراچی واپس نہیں لیتی تو اسے لازماً حکومت سے علیحدہ ہو جانا چاہئے۔ اس طرح لارڈ ویول ایک نہایت تکلیف دہ صورتحال سے دوچار ہو گئے۔ مرکزی حکومت کے اپنے ہی خلاف منقسم ایوان کے باعث فرقہ وارانہ فضا اور امن و امان کی صورتحال بھی ۔بے حد تشویشناک ہو گئی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہندوستان خانہ جنگی کے دہانے پر کھڑا ہے۔ اب منظر وہائٹ ہال لندن میں تبدیل ہوتا ہے۔

ب۔ لارڈ ویول کی برطرفی

برطانوی وزیراعظم ایٹلی ہندوستان کی مسلسل بگڑتی ہوئی صورتحال پر شدید متفکر تھے اور انہوں نے اس کیفیت کو ختم کرنے کے لئے انتہائی اقدام کرنے کا تہیہ کر لیا۔ ۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو انہوں نے دارالعوام میں ایک عہد ساز بیان دیا اور حکومت برطانیہ کے ارادوں کا دو ٹوک اظہار کیا۔ اس بیان کے تحت برطانیہ کی حکومت نے اپنے اس ''حتمی ارادے'' کا اعلان کیا کہ وہ خود مختار ہندوستانی حکومت کو اقتدار منتقل کرنے کے لئے اہم اقدامات کرنے میں جون ۱۹۴۸ء سے زیادہ تاخیر نہیں کرے گی۔ اس بیان کا پیراگراف نمبر ۱۰ نہایت اہم تھا جس کی عبارت کچھ اس طرح تھی۔

''کابینہ مشن کی جانب سے کئی ماہ کی محنت شاقہ کے بعد وسیع اتفاق رائے حاصل ہوا کہ آئین سازی کے لئے کیا طریقۂ کار وضع کیا جائے۔ یہ ان کے گزشتہ برس مئی کے بیانات سے ظاہر تھا۔ شاہ معظم کی حکومت نے پارلیمنٹ کو ایک ایسے آئین کی سفارش پر اتفاق کیا تھا جو ایک مکمل طور پر نمائندہ دستور ساز اسمبلی کی تجاویز کے عین مطابق تیار کیا گیا ہو۔ لیکن اگر ایسا ظاہر ہو کہ ایک مکمل طور پر نمائندہ اسمبلی ایسا آئین مقرر کردہ وقت سے پہلے تیار نہیں کر پائے گی ---- (تو) شاہ معظم کی حکومت کو خود فیصلہ کرنا ہو گا کہ برٹش انڈیا میں بروقت مرکزی حکومت کے اختیارات کسے منتقل کئے جائیں۔ آیا یہ اختیارات کلی طور پر برٹش انڈیا کی مرکزی حکومت کو کسی شکل میں منتقل کئے جائیں یا کچھ علاقوں میں موجود صوبائی حکومتوں کے حوالے کئے جائیں یا کوئی ایسا دوسرا طریقہ کار اپنایا جائے جو سب سے زیادہ معقول اور ہندوستانی عوام کے بہترین مفاد میں ہو۔''

دارالعوام میں مذکورہ بالا پالیسی بیان دینے کے بعد وزیراعظم نے ایوان میں اعلان کیا

کہ لارڈ ویول کی "دوران جنگ کی گئی تعیناتی" ختم کر دی جائے گی اور انتقال اقتدار کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایڈمرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ان کی جگہ ہندوستان کا وائسرائے مقرر کیا جائے گا۔

یہ غالباً وہ مناسب موقع ہے کہ بطور وائسرائے لارڈ ویول کی کارکردگی کا ایک عمومی جائزہ لیا جائے۔ مولانا آزاد کو کانگریس کے صدر کے حیثیت سے ان سے ذاتی رابطے کا موقع ملا۔ انہوں نے مندرجہ ذیل الفاظ میں لارڈ ویول کو خراج تحسین پیش کیا۔

"میں نے انہیں ایک کھردرا، صاف گو سپاہی پایا جو لفاظی کا قائل نہیں تھا۔ اور اپنی سوچ اور گفتگو دونوں میں واضح اور دوٹوک تھا۔ وہ سیاستدانوں کی طرح عیار نہ تھے بلکہ مطلب کی بات نہایت سادگی سے براہ راست کرتے تھے، جو ذہن میں ایسے گہرے خلوص کا تاثر پیدا کرتی تھی۔ جس نے میرے دل کو چھو لیا۔ کرپس مشن کی ناکامی کے بعد چرچل حکومت نے فیصلہ کیا کہ جنگ کے دوران ہندوستان کے مسئلے کو کھٹائی میں پڑے رہنا دیا جائے ----- اس بند دروازے کو کھولنے کا سہرا لازماً لارڈ ویول ہی کے سر ہے ----- جس کا نتیجہ شملہ کانفرنس تھی"

لارڈ ویول نے اپنا اعلیٰ عہدہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو سنبھالا جس وقت بنگال میں نہایت بھیانک قحط پھیلا ہوا تھا۔ یہ قحط کسی قدرتی آفت کا نتیجہ نہ تھا اور نہ ہی ملک میں کوئی غذائی قلت تھی۔ بنگال جیسی زرخیز سرزمین میں اس قدر شدید قحط بالکل بعید از قیاس تھا وہ بھی اس طرح کہ پورے صوبے میں ریل کی پٹڑیوں کا جال بچھا تھا اور ہر طرف سٹیمر رواں تھے!! لیکن اس کے باوجود وہاں قحط پڑا تھا ---- یہ انسانوں کا پھیلایا ہوا قحط تھا جسے چاول کے حریص تاجروں نے اس کی ذخیرہ اندوزی کر کے اور منڈی میں چاول کی ترسیل روک کر پھیلایا تھا۔ بنگال کی مسلم لیگی حکومت کی نااہلی اور چاول کے تاجروں کی حرص کی بدولت ۳۰ لاکھ سے زائد افراد بھوک سے مر گئے۔ اس تباہی و بربادی میں مسلم لیگی

حکومت کی فرقہ وارانہ سیاست نے بھی اپنا مناسب کردار ادا کیا۔ کلکتے کے "سٹیٹسمین" نے شہر کی سڑکوں پر مردہ اور مرتے ہوئے انسانوں کی تصویریں شائع کر کے عوام کی عظیم خدمت کی۔ جونہی لارڈ ویول کو اس ہولناک صورتحال کا علم ہوا وہ ۲۴ اکتوبر کو فوراً کلکتے پہنچے اور فوری حکم دیا کہ فوج کے تمام غذائی ذخائر قحط زدہ افراد کو فراہم کئے جائیں اور ریلوے کو غذائی ذخائر بنگال پہنچانے کو تمام دیگر امور پر فوقیت دینی چاہیے۔ بنگال اپنی اس شدید تکلیف میں لارڈ ویول کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

ملک کی تقسیم کو روکنے کے لئے ان کی انتھک کوششوں کے لئے انہیں عظیم خراج عقیدت پیش کیا جانا چاہیے۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں وہ کہا کرتے تھے ----- "آپ جغرافیے کو تبدیل نہیں کر سکتے ----- ہندوستان ایک فطری وحدت ہے" ایک عسکری طالب علم ہونے کے ناطے انہیں یقین تھا کہ تقسیم' ہندوستان کے دفاع کو خطرناک حد تک کمزور کر دے گی اور شمال کی جانب سے روس کو اور مشرق کی جانب سے چین کو ہندوستان پر حملے کے مواقع فراہم کرے گی۔ سپاہی کی حیثیت سے انہوں نے جان لیا تھا کہ تقسیم کا مطلب جنگ اور دفاع کے اس عظیم الشان نظام یعنی ہندوستانی فوج کی شکست و ریخت ہو گا۔

(برطانوی راج کے آخری ایام از ایل موزلے' صفحہ ۱۸)

لارڈ ویول کو وثوق ہو چکا تھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ کا جھگڑا بالآخر ہندوستان کی تقسیم پر منتج ہو گا۔ سپاہی ویول مستقبل کے ہندوستان کے متعلق تقسیم کی اصطلاحات میں کبھی سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ چنانچہ وہ کسی قسم کی حکومت میں دو متضاد فریقوں کو اکٹھا کرنے کے خواہشمند تھے تاکہ وہ اپنے اختلافات کو بحث وتمحیص کے ذریعے ایوان میں طے کر سکیں اور اس مقصد کے لئے غلط راستوں اور پچھلی گلیوں کا استعمال نہ کریں۔

ویول نے اشارہ کیا تھا کہ اگر موجودہ صورتحال برقرار رہی تو مزید قتل عام ہو گا جسے صرف برطانوی فوج کے ذریعے روکنا ممکن ہو گا ---- وہ اقدام جس سے وہ ہر ممکن حد

تک گریز کرنا چاہتے تھے۔ اس کا گاندھی جی نے یہ جواب دیا ----- اگر وائسرائے سچ مچ امن و امان برقرار رکھنے کے لئے برطانوی دفاعی دستوں کے استعمال کے متعلق فکر مند ہیں ----- تو حل نہایت آسان ہے ----- انہیں ہٹا دیں ----- امن بحال رکھنے کا معاملہ کانگریس پر چھوڑ دیں" ویول شدید مشتعل ہوئے۔ "ایسے موقعے پر انگریزوں کو رائے دینا کہ وہ اپنی فوجیں ہٹالیں جب کہ ہندو مسلم تعلقات کی خلیج اتنی بڑھ چکی ہو جتنی پہلے کبھی نہ تھی' ایک ایسا مشورہ تھا جسے کوئی وائسرائے قبول نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ستم ظریفی قابل غور ہے کہ جب کانگریس نے ویول کو مسلمان نواز قرار دیا تو جناح نے نہایت نفرت سے انہیں "جغرافیائی وحدت کا سب سے نیا علمبردار" کہا۔ لارڈ ویول نے ایک مرتبہ صدمہ ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ یہ ہمیشہ سے ان کی قسمت رہی ہے کہ ان کے حصے میں ہمیشہ معاملے کا منفی پہلو آتا ہے۔

اہل موزلے لکھتے ہیں۔

"ویول ایک معاملے پر پہلے سے کہیں زیادہ ڈٹ گئے' وہ یہ کہ اگرچہ ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے مسائل' اب قابو سے باہر نظر آرہے ہیں' لیکن وہ خود کبھی بھی اس سرزمین' اس کے عوام اور اس کی فوج کی دو حصوں میں تقسیم کے ذمہ دار نہیں بنیں گے"

(برطانوی راج کے آخری ایام' صفحہ ۵۰)

۱۹۴۶ء میں کلکتے کے بھیانک قتل عام کو ذہن میں رکھتے ہوئے' سال کے آخر میں انہوں نے اپنا ایک منصوبہ تیار کیا جس کے تحت انگریزوں کو صوبہ بہ صوبہ' رفتہ رفتہ ہندوستانی اقتدار سے الگ ہونا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ اقتدار سے یکمشت دستبرداری سے ملک میں انتشار اور بد نظمی پھیل جائے گی۔ جس سے بہت خونریزی ہو گی۔ وہ یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ ان کے منصوبے میں کم از کم یہ اہلیت ضرور ہے کہ یہ ہندوستان کو تقسیم سے بچا سکے۔ ایٹلی نے اس منصوبے کو پسند نہیں کیا اور اسے فوجی پسپائی کا

منصوبہ قرار دیا۔ ۲۷ اگست ۱۹۴۶ء کو گاندھی جی کے ساتھ مذاکرات کے دوران ان کا گاندھی جی سے اصرار کہ وہ "گروہ بندی" کی شقوں پر کابینہ مشن کی اپنی تشریحات تسلیم کرلیں درحقیقت ان کی اسی خواہش کے تحت تھا کہ تقسیم اور بڑے پیمانے پر قتل عام کے امکان کا تدارک کیا جاسکے۔

لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ اپنے اس عہدے کے لئے موزوں نہ تھے۔ اس وقت ہندوستان کی صورتحال بے حد مشکل اور نازک تھی اور اس سے عہدہ برآء ہونے کے لئے سپاہی کی بجائے ایک سیاستدان اور ڈپلومیٹ درکار تھا۔ ویول کی سب سے بڑی خامی یہی تھی کہ وہ ڈپلومیٹ کا کردار ادا کرنے کے لئے مناسب نہ تھے۔ اس نکتے کے پیش نظر، ایٹلی بلاشبہ انہیں تبدیل کرنے میں حق بجانب تھے۔ ہندوستان میں آخری وائسرائے کے کردار کے لئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہر لحاظ سے موزوں تھے کیونکہ وہ عسکری اہلیت رکھنے کے علاوہ صف اول کے سیاستدان اور ڈپلومیٹ بھی تھے۔

ہندوستان کے وائسرائے کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد لارڈ ویول زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہے۔ یہ اس شخص کی خوبی تھی کہ اس نے شملہ کانفرنس کی ناکامی کی تمام ذمہ داری اپنے کندھوں پر لے لی جب کہ یہ سب کو اچھی طرح معلوم تھا کہ کانفرنس کی ناکامی کی وجہ کوئی اور تھی۔ وہ سیاستدان نہیں بلکہ سیدھے سچے سپاہی تھے۔ طبعاً وہ خاموش اور کم گو انسان تھے۔ انہوں نے کبھی وضاحتیں پیش نہیں کیں اور اپنی صفائی میں بھی کچھ نہیں کہا۔ تاریخ اور انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ اس عظیم سپاہی کو کماحقہ، خراج عقیدت ضرور پیش کیا جائے جس نے آخری لمحے تک ہندوستان کی بنیادی وحدت کو برقرار رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

باب نمبر32

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی آمد ○ نہرو اور پٹیل کا ماؤنٹ بیٹن سے اتحاد ○ گاندھی جی کا سیاسی زوال ○ تقسیم ہند

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو خصوصی طور پر ہندوستان کا آخری وائسرائے مقرر کرنے کے لئے منتخب کیا گیا۔ اس انتخاب کے لئے اٹیلی اکیلے ذمہ دار تھے۔ اس ضمن میں شاہ معظم کی ڈائری کا ایک ورق نہایت دلچسپ تھے جو ۱۷ دسمبر ۱۹۴۸ء کو لکھا گیا۔

"اٹیلی نے مجھے بتایا کہ لارڈ ویول نے ہمارے ہندوستان چھوڑنے کے لئے جو منصوبہ تیار کیا ہے اس سے فوجی پسپائی کی بو آتی ہے اور اس حقیقت کا اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ ایک سیاسی مسئلہ ہے نا کہ فوجی۔ ویول نے اب تک نہایت اچھا کام کیا ہے لیکن اٹیلی کو شبہ ہے کہ آیا ان میں اگلے مرحلے کی بات چیت کے لئے درکار لطافت موجود ہے جہاں ہمیں دونوں ہندوستانی فریقوں کو تمام وقت اپنے تئیں لازماً دوستانہ رکھنا ہو گا"

بے چارے لارڈ ویول سیدھے سادھے سپاہی تھے لیکن سیاستدان نہ تھے۔ طبعاً وہ ایک خاموش انسان تھے۔ جب کبھی انہیں بولنے کا موقع ملتا وہ دو ٹوک بات کرتے اور دو ٹوک جوابات ہی کی توقع کرتے۔ وہ گاندھی جی اور ان کے قانونی تقاضوں کو ناپسند کرتے تھے۔ انہیں گاندھی جی سے یہی شکایت تھی کہ وہ کبھی انہیں حقائق اور ارادے کے واضح بیان کی طرف نہیں لا سکے تھے۔ گاندھی جی کے ساتھ ایک مکالمے کے اختتام پر انہوں نے کہا "وہ مجھ سے ڈیڑھ گھنٹہ بات چیت کرتے رہے — لیکن میں ابھی تک پوری طرح

سمجھ نہیں پایا کہ وہ مجھے کیا کہنا چاہتے تھے۔ ہر جملہ جو انہوں نے بولا اس کی کم از کم دو مختلف طریقوں سے تشریح ہو سکتی تھی۔"

"ایک مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ گاندھی جی کے ساتھ ایک اور مذاکرے کے تصور نے انہیں اس قدر ذہنی کرب سے دوچار کر دیا کہ وہ رات بھر سو نہ سکے"

(برطانوی راج کے آخری ایام' از ایل موزے' صفحہ ۱۹)

لارڈ ویول کے مزاج کی یہی خامی وہ وجہ تھی جس کی بنیاد پر ایٹلی انہیں فوری طور پر تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ ایٹلی کے مطابق وقت کا تقاضا یہ تھا کہ ہندوستانی رہنماؤں سے کس طرح قریبی ذاتی رابطہ استوار کیا جائے۔ "مسٹر ایٹلی نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو نئے وائسرائے کے طور پر اس لئے منتخب کیا تھا کیونکہ وہ بے حد خوش طبع اور شوخ شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی ایک غیر معمولی اہلیت یہ تھی کہ وہ ہر طرح کے لوگوں سے گھل مل جاتے تھے۔ اپنی اس خصوصیت کا مظاہرہ وہ جنوب مشرقی ایشیاء میں بھی کر چکے تھے جہاں وہ سربراہ رہے۔ ان کی خوش نصیبوں میں ایک غیر معمولی اہلیہ بھی شامل تھیں۔" لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو خصوصی ہدایات دی گئیں کہ وہ ہندوستانی رہنماؤں سے قریب ترین ذاتی تعلقات قائم کریں۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن ۲۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو دہلی پہنچے اور ۲۴ تاریخ کو انہیں وائسرائے مقرر کر دیا گیا۔ ان کے ساتھ نہایت طاقتور ذاتی عملہ تھا جس میں لارڈ ازمے اور سر ایرک میوائکلی جیسے افراد شامل تھے جنہیں ہندوستان کا خاطر خواہ تجربہ تھا۔ عملے کے دیگر ۴ افراد میں ایلن کیمپ بیل۔ جانسن قابل ذکر ہیں جو پریس اور امور تعلقات عامہ کے سربراہ تھے۔ ماؤنٹ بیٹن ہندوستانی راہنماؤں سے ذاتی روابط استوار کرنے میں اس قدر سریع تھے کہ اپنے عہدے کا حلف اٹھانے سے پیشتر ہی انہوں نے گاندھی جی' نہرو اور جناح کو خط لکھ کر ملاقات کی دعوت دے دی۔ لارڈ ازمے کو یہ مشکل فریضہ سونپا گیا کہ وہ مسلم لیگ کے رہنماؤں میں وائسرائے کے جذبات خیر سگالی کو عام کریں۔ ماؤنٹ بیٹن کی اہلیہ اور بیٹی

پامیلا کو بھی خصوصی فرائض تفویض کیے گئے کہ وہ ہر کسی سے دوستی اور خوشگوار مراسم بڑھائیں۔ لیڈی ماؤنٹ بیٹن اور پامیلا اپنے مشن میں کس قدر کامیاب رہیں' یہ اس دلی خراج تحسین سے ظاہر ہے جو پنڈت نہرو نے انہیں ہندوستان سے رخصتی کے موقعے پر پیش کیا۔ لیڈی ماؤنٹ بیٹن کے متعلق نہرو نے کہا---- "آپ جہاں کہیں بھی گئیں (اپنے ساتھ) آرام و سکون اور سکھ لے کر آئیں' آپ امید اور حوصلہ افزائی لے کر آئیں۔ چنانچہ اس میں حیرت کی کونسی بات ہے کہ ہندوستان کے عوام آپ سے محبت کرنے لگیں' آپ کو اپنا ہی حصہ سمجھنے لگیں اور آپ کے جانے پر افسردہ ہوں؟" نو عمر پامیلا ماؤنٹ بیٹن کے متعلق نہرو نے کہا---- "وہ ابھی سیدھی سکول سے آئی تھی اور اپنی تمام تر کشش کے ساتھ اس نے ہندوستان کے تکلیف دہ حالات میں ایک بالغ فرد کا سا کردار ادا کیا"

ماؤنٹ بیٹن کا سحر' پنڈت نہرو سے ان کی پہلی ہی ملاقات میں ظاہر ہو گیا۔ ملاقات کے اختتام پر ماؤنٹ بیٹن نے کہا۔ "مسٹر نہرو میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے برطانوی راج کو سمیٹنے والا آخری وائسرائے تصور نہ کریں بلکہ نئے ہندوستان کی راہ دکھانے والا پہلا وائسرائے سمجھیں۔ نہرو نے جو پہلے ہی ماؤنٹ بیٹن کے طلسم میں گرفتار ہو چکے تھے جواب دیا۔ "اب میں سمجھا کہ جب کہنے والے آپ کے سحر کو اتنا خطرناک قرار دیتے ہیں تو ان کا کیا مطلب ہوتا ہے" دوسری جانب سردار پٹیل کابینہ کے اندر مسلم لیگی ارکان کے ساتھ کام کرنے کے تجربے کے بعد نہایت تلخ ہو چکے تھے۔ وہ اب ماؤنٹ بیٹن کی جانب سے کسی بھی انتہائی اقدام کو قبول کرنے پر تیار تھے۔ چنانچہ ماؤنٹ بیٹن کو سردار پٹیل کے ساتھ معاملہ کرنے میں قطعی طور پر دشواری پیش نہیں آئی جو مسلم لیگ سے چھٹکارا پانے کی صورت میں تقسیم کو تسلیم کرنے پر بھی رضامند تھے۔ چنانچہ پنڈت نہرو اور سردار پٹیل تو فوراً ہی ماؤنٹ بیٹن کے آدمی بن گئے۔ اسی لمحے سے ہندوستانی سیاست میں گاندھی جی کے رسوخ کا زوال شروع ہو گیا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ہندوستان پہنچنے سے قبل ہی سردار پٹیل نے تقسیم کے حق میں اپنا ذہن بنانا شروع کر دیا تھا۔ ایک ہی کابینہ میں مسلم لیگ کے ارکان کے ساتھ چند ماہ کام کرنے کا تجربہ انہیں قائل کرنے کے لئے کافی تھا کہ ان لوگوں کے ساتھ کام کرنا ناممکن ہے۔ فروری ۱۹۴۷ء کے وسط میں ایک اخباری انٹرویو میں انہوں نے کہا کہ اگر مسلم لیگ کے نمائندوں کو عبوری حکومت میں موجود رہنے کی اجازت دی گئی تو کانگریس اس حکومت سے الگ ہو جائے گی۔ چنانچہ یہ قطعاً حیرت انگیز نہیں ہے کہ انہوں نے ماؤنٹ بیٹن سے پہلی ہی ملاقات میں واضح کر دیا کہ اگر ضروری ہوا تو وہ (ہندوستان کی) بے رحمانہ چیر پھاڑ پر تیار ہیں خصوصاً اس صورت میں کہ اس طرح مسلم لیگ سے نجات ممکن ہو سکے۔ وہ خطوط جن پر سردار پٹیل کا ذہن کام کر رہا تھا' ان کے اس خط سے ظاہر ہوتے ہیں جو انہوں نے ۴ مارچ ۱۹۴۷ء کو کانجی دوار کا داس کو لکھا۔

> "اگر لیگ پاکستان پر اصرار کرتی ہے تو اس کا واحد ذریعہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم ہے۔ انہیں پورا پنجاب یا بنگال نہیں مل سکتا ----- میرا خیال ہے کہ حکومت برطانیہ تقسیم سے اتفاق نہیں کرے گی۔ بالآخر وہ حکومت کی باگ ڈور طاقتور ترین پارٹی کو سونپنے کو ہی دانشمندی تصور کرے گی ----- اگر وہ ایسا نہیں بھی کرتی ----- تو بھی ایک طاقتور مرکز ----- جس میں مشرقی بنگال' پنجاب کے کچھ حصے ' سندھ اور بلوچستان کے علاوہ جو مرکز کے تحت پوری صوبائی خود مختاری سے بہرہ ور ہیں پورا ہندوستان شامل ہو گا' اتنا مضبوط ہو گا کہ باقی ماندہ حصے بھی آخر کار اس میں شامل ہو جائیں گے"

(آخری دور از پیارے لال' جلد دوم' صفحہ ۸۳)

بعد ازاں اپنی متعدد تقریروں میں سردار پٹیل نے واضح کیا کہ کس طرح وہ تقسیم کے تصور کی طرف راغب ہوئے۔ عبوری کابینہ میں انہیں وزیر ریاستی امور کا عہدہ حاصل تھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے افسر اس طریقے سے کام کر رہے ہیں جو

ہندوستان کے مفادات کے لئے شدید نقصان دہ ہے۔ وزارت ریاستی امور میں اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

یہ وہ وقت تھا جب مجھے پوری طرح احساس ہوا کہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے طریقہ کار سے کس حد تک ہر ذریعے سے ہمارے مفادات تعصبات کی نذر کئے جا رہے ہیں۔ اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جس قدر جلد ہم' اس سے چھٹکارہ پالیں اسی قدر یہ ہمارے لئے بہتر ہے۔ میں نے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا کہ بہترین طریقہ کار ان غیر ملکیوں کی رخصتی کو جلد از جلد ممکن بنانا ہے خواہ یہ ملک کی تقسیم کی قیمت پر ہی ہو۔ اس وقت میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ ملک کو محفوظ اور مضبوط بنانے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے باقی ماندہ ہندوستان کی باہمی وحدت"

(آخری دور از پیارے لال' جلد دوم صفحہ ۱۵۳)

اسی ضمن میں مولانا آزاد کی کتاب "ہندوستان کا حصول آزادی" کے مندرجہ ذیل اقتباسات بے حد بر محل ہیں۔

"پٹیل نے کھلے عام کہا کہ تقسیم کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ تجربے نے واضح کر دیا تھا کہ مسلم لیگ کے ساتھ کام کرنا ناممکن ہے۔ سردار پٹیل کو غالباً ایک دوسرے خیال نے بھی قائل کیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے دلیل دی کہ صرف لیگ کے اعتراضات دور کرنے کے لئے کانگریس ایک کمزور مرکز پر متفق ہو گئی ہے اور صوبوں کو مکمل صوبائی خود مختاری دینے کا اعلان کیا گیا ہے لیکن ایک ایسے ملک میں جو لاتعداد زبانوں' فرقوں اور تہذیبوں میں بٹا ہوا ہو' کمزور مرکز لازماً علیحدگی پسندانہ رجحانات ہی کو فروغ دینے کا باعث بن سکتا ہے۔ اگر مسلم لیگ نہ ہوتی تو ہم ایک مضبوط مرکزی حکومت کا منصوبہ بنا سکتے تھے اور ایک ایسا آئین تشکیل دے سکتے تھے جو ہندوستان کی وحدت کے نقطہ نظر سے بہتر ہوتا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مشورہ دیا کہ شمال مغرب اور شمال مشرق میں کچھ مختصر ٹکڑے چھوڑ دینا بہتر ہو گا تاکہ بعد میں ایک مضبوط اور مجتمع ہندوستان تعمیر کیا جا سکے۔ سردار پٹیل

اس دلیل سے قائل ہو گئے کہ مسلم لیگ کے ساتھ تعاون ہندوستان کی وحدت اور طاقت کا شیرازہ بکھیر دے گا"

(صفحات ۱۸۸۔ ۱۸۷)

حالات کے دباؤ کے تحت اپنی مرضی کے بہت برعکس جواہرلال بھی تقسیم کی حمایت پر مجبور ہو گئے۔ مولانا آزاد نے جواہرلال کے ذہن میں ہونے والے تغیر و تبدل پر بہت روشنی ڈالی ہے وہ لکھتے ہیں۔

"جواہرلال ----- نے سردار پٹیل کی طرح تقسیم کی حمایت نہیں کی۔ درحقیقت وہ تسلیم کرتے تھے کہ تقسیم اصلاً اور اساساً" غلط ہے۔ لیکن انتظامی کونسل میں لیگی ارکان کے رویے کے اپنے تجربے کے بعد وہ مشترکہ کارروائی کی ہر امید کھو چکے تھے ----- وہ کسی سوال پر متفق نہیں ہوتے تھے۔ ہر روز جھگڑا کرتے تھے۔ جواہرلال نے مایوسی کے عالم میں مجھ سے پوچھا تقسیم کو قبول کر لینے کی علاوہ اور کیا چارہ ہے؟ جواہرلال نے مجھ سے غمزدہ ہو کر بات کی لیکن میرے ذہن میں کوئی شبہہ باقی نہیں رہا کہ ان کے ذہن میں کیا وقوع پذیر ہو رہا ہے۔ یہ واضح تھا کہ تقسیم کو شدت سے ناپسند کرنے کے باوجود وہ روز بروز اس نتیجے پر پہنچ رہے تھے کہ اب اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ وہ تسلیم کرتے تھے کہ تقسیم ایک برائی ہے لیکن وہ کہتے تھے کہ حالات اسی سمت میں بڑھ رہے ہیں"

(ہندوستان کا حصول آزادی' صفحہ ۱۸۵)

جب ماؤنٹ بیٹن ہندوستان پہنچے تو گاندھی جی صوبہ بہار کے شہر پٹنہ میں تھے۔ نئے وائسرائے کی جانب سے دعوت نامہ ملنے پر گاندھی جی ۳۱ مارچ کو دہلی پہنچ گئے۔ ان کے پہنچتے ہی مولانا آزاد ان سے ملنے گے۔ گاندھی جی نے کس طرح آہستہ آہستہ تقسیم کے مسئلے پر اپنا رویہ تبدیل کیا اس کے متعلق مولانا آزاد لکھتے ہیں۔

"ہمیں توقع تھی کہ وہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملنے دہلی آئیں گے۔ اور وہ سچ مچ ۳۱

مارچ کو پہنچ گئے۔ میں فوراً ان سے ملنے پہنچا ان کا سب سے پہلا تبصرہ تھا----- "تقسیم اب ایک خطرہ بن گئی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ "ولبھ بھائی اور حتیٰ کہ جواہر لال نے بھی ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ اب آپ کیا کریں گے۔ کیا آپ میرا ساتھ دیں گے یا آپ بھی بدل گئے ہیں؟" میں نے جواب دیا----- "میں تقسیم کے خلاف رہا ہوں اور اب بھی ہوں۔ تقسیم کے متعلق میری مخالفت کبھی اتنی شدید نہ تھی جتنی آج ہے۔ لیکن میں یہ جان کر بے حد دل گرفتہ ہوا کہ جواہر لال اور سردار پٹیل نے بھی شکست تسلیم کر لی ہے اور آپ کے الفاظ میں ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ اب آپ میری واحد امید ہیں۔ اگر آپ تقسیم کے خلاف ڈٹ جائیں تو ہم اب بھی صورتحال کو سنبھال سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ بھی رضامند ہو گئے تو مجھے خطرہ ہے کہ ہندوستان برباد ہو جائے گا۔

"گاندھی جی نے کہا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ اگر کانگریس تقسیم کو قبول کرنا چاہتی ہے تو یہ میری لاش پر ہو گی۔ جب تک میں زندہ ہوں' میں کبھی ہندوستان کی تقسیم پر اتفاق نہیں کروں گا۔ اور اگر میں ایسا کر سکا تو اب بھی کانگریس کو اسے قبول کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔

"اس سے اگلے روز گاندھی جی نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کی' اس سے اگلے روز وہ ماؤنٹ بیٹن سے پھر ملے۔ ۲ اپریل کو انہوں نے ایک اور ملاقات کی۔ گاندھی جی کے ماؤنٹ بیٹن سے پہلی مرتبہ ملنے کے فوراً بعد سردار پٹیل ان کے پاس پہنچ گئے اور دو گھنٹے سے زیادہ ان کے ساتھ رہے۔ اس ملاقات کے دوران کیا ہوا' میں نہیں جانتا۔ لیکن جب میں گاندھی جی سے دوبارہ ملا تو مجھے اپنی زندگی کا شدید ترین صدمہ یہ جان کر پہنچا کہ گاندھی جی بھی بدل چکے تھے۔ وہ کھل کر تو اب بھی تقسیم کے حق میں نہیں تھے لیکن بڑھ چڑھ کر اس کی مخالفت بھی نہیں کر رہے تھے۔ جس چیز سے مجھے اس سے بھی زیادہ حیرت اور صدمہ ہوا وہ یہ کہ انہوں نے وہی دلائل دہرانے شروع کر دئے جو سردار پٹیل پہلے استعمال کر چکے تھے۔ میں دو گھنٹے تک ان سے جرح کرتا رہا لیکن ان پر کوئی اثر مرتب نہ

کر سکا۔"

"آخر کار مایوسی کے عالم میں میں نے کہا اگر آپ نے بھی یہی خیالات اپنا لئے ہیں تو مجھے ہندوستان کو بربادی سے بچانے کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔

(ہندوستان کا حصول آزادی، صفحات ۸۷-۱۸۶)

گاندھی جی اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے درمیان پہلے مذاکرات ۳۱ مارچ ۱۹۴۷ء کی سہ پہر کو ہوئے۔ گاندھی جی ملاقات کے بعد وائسرائے کے خلوص، شرافت اور کردار کی پاکیزگی سے شدید متاثر ہو کر لوٹے۔ ایک اور مکالمہ اگلے روز ہوا۔ دوسرے دن کی گفتگو کے اختتام پر گاندھی جی نے وائسرائے کو جمود ختم کرنے کے لئے اپنا فارمولا پیش کیا جس کے مطابق جناح کو وائسرائے کی جانب سے حکومت سازی کی دعوت دی جاتی۔ وائسرائے نے کہا کہ انہیں گاندھی کا مجوزہ حل بہت عمدہ معلوم ہو رہا ہے چنانچہ انہوں نے گاندھی جی کو صلاح دی کہ انہیں اس منصوبے پر ازمے سے بات چیت کرنی چاہئے۔ وائسرائے کے عملے نے جس کے سربراہ ازمے تھے اس خیال کو قطعاً پسند نہیں کیا۔ انہوں نے اسے آموزدہ را آزمودن قرار دیا۔

پنڈت نہرو اور سردار پٹیل نے بھی گاندھی جی کے خیال کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ چنانچہ اس کے بعد گاندھی جی پٹنہ لوٹ گئے اور جانے سے پہلے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ایک بے حد دلچسپ خط لکھا۔

"میں نے پنڈت نہرو اور دیگر افراد سے کئی مرتبہ مختصر گفتگو کی ہے اور صرف ان (نہرو) سے ایک گھنٹہ بات چیت کی ہے۔ اور اس کے بعد ورکنگ کمیٹی کے متعدد افراد سے مذاکرات کئے ہیں ----- مجھے افسوس ہے کہ میں ان میں سے کسی ایک کو بھی اپنا ہم خیال نہیں بنا سکا ----- سوائے بادشاہ خان کے ----- چنانچہ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے اپنی ترجیحات سے خارج کر دیں۔ عبوری حکومت میں شامل کانگریسی ارکان قوم کے ثابت قدم اور کہنہ مشق خادم ہیں اور جہاں تک کانگریس کے نقطہ نظر کا تعلق ہے وہی

مکمل مشیر ہوں گے ----- مذکورہ بالا حالات میں میرا خیال ہے کہ اگر ممکن ہو سکے تو آپ کی رضامندی سے میں کل پٹنہ روانہ ہو جاؤں"

چنانچہ تمام عملی مقاصد کے لئے گاندھی جی کو ہندوستان کی آزادی سے متعلق تمام مذاکرات سے خارج کر دیا گیا اور نہرو اور پٹیل کی متحدہ کارروائیوں کا آغاز ہو گیا۔ انہوں نے اپنا عروج زوال لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے وابستہ کر لیا۔

جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن پہنچے تو ملکی صورتحال انتشار کا شکار تھی۔ ان کے چیف آف سٹاف لارڈ ازمے نے اس صورتحال کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"انگلستان سے آنے سے پیشتر میرا خیال تھا کہ ۱۵ ماہ کا عرصہ انتقال اقتدار کے مکمل انتظامات کے لئے بہت کم ہے لیکن ہندوستان آنے کے بعد ۳ ہفتے سے بھی پہلے مجھے یقین ہو گیا کہ کم تو کجا یہ عرصہ تو بہت طویل ہے۔ خیالات کی تبدیلی کی بنیادی وجہ اس امر کا احساس تھا کہ میرے گزشتہ قیام ہندوستان نے اب تک فرقہ وارانہ کشیدگی میں کئی گنا اضافہ ہو چکا تھا۔ میرے یقین کی دوسری وجہ کہ ہم جون ۱۹۴۸ء تک حکومت جاری نہیں رکھ سکتے یہ تھی کہ ملک کی انتظامی حالت بربادی کی طرف گامزن تھی۔ ۱۹۴۶ء تک وائسرائے مشاورت کے لئے انتظامی کونسل سے رجوع کرتے تھے۔ جو دانشمند اور تجربہ کار انگریزوں اور ہندوستانیوں پر مشتمل تھی۔ لیکن اس انتظامی کونسل کا وجود اب ختم ہو چکا تھا اور اس کی جگہ مخلوط عبوری حکومت نے لے لی تھی جس کے صدر وائسرائے اور ڈپٹی وزیراعظم نہرو تھے۔ اس کے ۱۹ ارکان کانگریسی اور ۵ مسلم لیگی تھی۔ مسلم لیگی ارکان کو مسٹر جناح ہمیشہ "محافظ" کہا کرتے تھے جو مسلمانوں کے مفادات کی نگرانی کر رہے تھے۔ مجھے شبہ ہے کیا کوئی مخلوط حکومت تھی بھی (یا نہیں) کیونکہ اس کے ارکان نے آپس میں تعاون نہ کرنے کا پختہ عزم کر رکھا تھا۔ صرف ایک نکتہ جس پر ان کا اتفاق تھا وہ یہی تھا کہ انگریزوں کو جس قدر جلد ممکن ہو سکے ہندوستان سے نکل جانا چاہئے۔ اس کے علاوہ ہر مسئلہ خالصتاً فرقہ وارانہ نقطہ نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر جہاں کہیں بھی کسی

تقرری کے لئے آسامی خالی ہوتی اس محکمے کا متعلقہ وزیر بغیر کسی شرمندگی کے اسے پر کرنے کے لئے اپنے کسی ہم مذہب کو متعلقہ نوکری کے لئے اس کی اہلیت سے قطع نظر نامزد کر دیتا"

(یادداشتیں، صفحات ۱۸-۴۱۷)

مندرجہ بالا حالات کے پیش نظر، لارڈ ماؤنٹ بیٹن اسی نتیجے پر پہنچے کہ انتقال اقتدار کے اقدامات فوری طور پر کرنے چاہئیں جہاں تک کابینہ مشن کا تعلق ہے، انہوں نے محسوس کیا کہ وہ ان کے ہندوستان پہنچنے سے پہلے ہی زمین بوس ہو چکا تھا لہذا اس کے احیاء کی کوششیں بے سود تھیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنا نیا منصوبہ تیار کیا جس کے تحت اختیارات صوبوں کو یا صوبوں کے کسی ایسے مجموعے کو منتقل کیے جانے تھے جس کی تشکیل کا فیصلہ صوبوں کو خود کرنا تھا۔ ۲ مئی کو انہوں نے اپنا منصوبہ لارڈ ازمے اور جارج ایبل کے ہاتھ لندن بھیج دیا جس کے بعد وہ مختصر آرام کے لئے شملہ چلے گئے۔

اگلے ہفتے لارڈ بیٹن نے بطور مہمان شملہ میں پنڈت نہرو، کرشنا مینن اور وی پی مینن کو مدعو کیا۔ یہاں انہوں نے پنڈت نہرو کو اپنے منصوبے سے آگاہ کیا جنہوں نے اس پر شدید ناپسندیدگی کا رد عمل ظاہر کیا۔ پنڈت نہرو نے ماؤنٹ بیٹن کو نشاندہی کی کہ ان کے منصوبے سے ہندوستان بلقان کی صورت اختیار کر لے گا۔ جسے کانگریس کبھی قبول نہیں کرے گی۔ اس مرحلے پر میدان وی پی مینن نے سنبھال لیا اور وائسرائے کو مشورہ دیا کہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں ڈومینین کی حیثیت قبول کرنے پر تیار ہو جائیں گی اور اس طرح انتقال اقتدار کا مرحلہ جون ۱۹۴۸ء سے کہیں پہلے طے ہو جائے گا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ کرشنا مینن تھے جن کے ذہن میں یہ خیال سب سے پہلے آیا۔ درست حقائق خواہ کچھ بھی رہے ہوں، وی پی مینن نے نئے منصوبے کو شکل دی جس کے تحت تقسیم ہند اور دو نئی ڈومینین ریاستوں پاکستان اور ہندوستان کا قیام عمل میں آیا۔ پنڈت نہرو نے منصوبے کی فوری منظوری دے دی اور بعد ازاں جناح کی رضامندی بھی حاصل کر لی گئی۔

اس نئے منصوبے کے ہمراہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن لندن روانہ ہو گئے۔ وی پی مینن بھی ان کے ساتھ تھے لارڈ ماؤنٹ بیٹن ۱۴ مئی کو لندن پہنچے۔ جس تباہ کن تیز رفتاری سے یہ معاملہ لندن میں طے کیا گیا اس کا تذکرہ لارڈ ازمے نے اپنی یادداشتوں میں اس طرح کیا ہے۔

"ہم نے (کابینہ کی) انڈو برما کمیٹی کے اجلاس میں بھی اسی سہ پہر شرکت کی۔ کمیٹی نے منصوبے کی تازہ ترین عبارت کو منظور کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کی۔ اس میں ایک کومے (') کی بھی تبدیلی نہیں کی گئی۔ اس کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے ڈومینین کی حیثیت کا سوال اٹھایا۔ وہ نہایت پر اعتماد تھے کہ کانگریس اسے منظور کرے گی اور یقیناً مسلم لیگ بھی یہی کرے گی۔ بشرطیکہ اس کے نتیجے میں انتقال اقتدار جلدی ہو جائے۔ لیکن اصل مسئلہ اس رفتار کا تھا جس سے ضروری قوانین تحریر کئے جاتے اور پارلیمنٹ سے ان کی منظوری لی جا سکتی۔ کیا یہ چند ہفتوں میں ممکن تھا؟ یہ مسئلہ لارڈ چانسلر' لارڈ جووٹ اور تاج کے قانونی افسروں کے سامنے پیش کیا گیا۔ لارڈ جووٹ نے اگلے روز کمیٹی کو بتایا کہ سر توڑ کوششوں کے نتیجے میں ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کا ایک ترمیمی بل ۶ یا ۷ ہفتوں کے دوران تیار کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ اس امر کا حتمی فیصلہ ہو جائے کہ حقیقتاً کیا ہونا ہے ----- وزیراعظم نے قائد حزب اختلاف کو اعتماد میں لیا اور چرچل نے کنزرویٹو پارٹی (ٹوری) کے ارکان کے ایماء پر کہا کہ اگر کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کی طرف سے منصوبے کو موثر طور پر قبول کر لیا جائے تو وہ ضروری قانون سازی میں بساط بھر مدد کریں گے۔ انگلستان کی تمام جماعتوں کی مکمل حمایت کے نتیجے میں ماؤنٹ بیٹن نے وہ سب کچھ حاصل کر لیا جو انہیں درکار تھا اور انہوں نے انتقال اقتدار کے لئے ۱۵ اگست کی تاریخ تجویز کی جس پر کابینہ متفق ہو گئی"

(صفحات ۲۲۔ ۴۲۱)

برطانوی کابینہ کی اپنے منصوبے کے حق میں پوری اور مکمل حمایت حاصل کرنے' پارلیمانی اجازت کے حصول کے لئے تمام ابتدائی انتظامات پورے کرنے اور اپنے منصوبے پر عمل در آمد کے لئے ضروری قانون سازی کروانے کے بعد ماؤنٹ بیٹن محض ۱۲ دن کی قلیل مدت میں ۳۱ مئی کو ہندوستان لوٹ آئے۔ اب اس منصوبے کے متعلق کسی مزید مشاورت' بحث و تمحیص اور کانفرنس کی ضرورت نہ تھی۔ اب اسے صرف ایک ناقابل ترمیم شکل دینا اور اس کا رسمی طور پر اعلان کرنا باقی تھا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی غیر حاضری میں جناح نے ایک نہایت خیال افروز مطالبہ پیش کیا وہ یہ کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کو ملانے کے لئے ۸۰۰ میل طویل راہداری بھی فراہم کی جائے۔ اس مطالبے کا وقت نہایت احتیاط سے منتخب کیا گیا تھا اور اسے مغربی پریس نے بہت عمدگی سے مشتہر کیا اس کا مقصد برطانیہ پر پاکستان کے لئے بہتر سے بہتر سہولیات فراہم کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ دباؤ ڈالنا تھا۔ جناح کو یقین تھا کہ انگریز انہیں ایک طاقتور پاکستان دینے کے لئے کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں۔ ہندوستان میں مسلم لیگ کے سرکردہ اخبار ڈان نے لکھا۔

"اگر پاکستان کو حقیقی اور مضبوط ہونا ہے تو اس کے مشرقی اور شمالی حصوں کو ملانے والی ایک راہداری کا قیام ناگزیر ہے۔ ہمیں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اگر مسلمان پاکستان حاصل کر سکتے ہیں جیسا کہ فی الحقیقت انہوں نے پہلے ہی حاصل کر لیا ہے ----- تو وہ پاکستان کے دو حصوں کو ملانے کے لئے کہیں نہ کہیں کوئی راہداری بھی بنا سکتے ہیں" لیکن اس مطالبے نے جناح کی خواہش کے برعکس انگلستان پر بالکل الٹا اثر مرتب کیا۔ ماؤنٹ بیٹن نہ صرف محتاط ہو گئے بلکہ اپنے ساتھ جناح کے نام چرچل سے ایک خط بھی لکھوا کر لائے جس میں کہا گیا تھا کہ ایسے عظیم الشان مطالبے سے پاکستان کا قیام رک بھی سکتا ہے۔ اس کے بعد اس کے متعلق کچھ سننے میں نہیں آیا۔

ایلن کیمپ بیل۔ جانسن لکھتے ہیں۔

"عبوری حکومت میں شامل دو بڑے کانگریسی رہنماؤں نہرو اور ولبھ بھائی پٹیل نے اس خیال پر تقسیم کو قبول کیا تھا کہ جناح کو پاکستان دینے کے بعد وہ ان سے چھٹکارہ پالیں گے اور ان کی نفرت اور تعصب پھیلانے کی اہلیت ختم ہو جائے گی یا جیسا کہ نہرو نے نجی حلقوں میں کہا کہ سر کاٹنے سے ہم سردرد سے بھی نجات پالیں گے"

(مشن ود ماؤنٹ بیٹن، صفحہ ۹۸)

۲ جون کو تقسیم کا منصوبہ رسمی طور پر ہندوستانی رہنماؤں کے سامنے وائسرائے کے گھر میں منعقدہ کانفرنس میں پیش کیا گیا کانگریس اور لیگ نے منصوبے کو زیادہ رد و کد کے بغیر قبول کر لیا۔ "ایک ٹوٹے پھوٹے اور کرم خوردہ" پاکستان پر جناح کی رضامندی لغوا" جبری طور پر حاصل کی گئی۔ پھر مہاتما آئے' ماؤنٹ بیٹن اور گاندھی جی کی اس عظیم الشان ملاقات کے دوران کیا ہوا اس کا تذکرہ ایلن کیمپ بل نے مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے۔

"ساڑھے بارہ بجے مہاتما تشریف لائے ایک مفہوم میں تو وہ کانفرنس کی پوری کارروائی ہی میں موجود رہے تھے اور تقسیم کے منصوبے کی رسمی پیش کاری پر ان کے حتمی رد عمل سے متعلق بے یقینی کا بلاشبہ کانگریسی رہنماؤں پر صبح صبح کافی خوف چھایا ہوا تھا۔ وہ اندرونی آواز کی پکار پر گاندھی جی کے ناقابل پیش گوئی رد عمل سے اچھی طرح واقف تھے۔ یہ خوف عام تھا کہ وہ اپنے گنجلک ضمیر کی آواز پر منصوبے کو تباہ کرنے کے لئے انتہائی حد تک جا سکتے ہیں تا کہ ہندوستان کے بٹوارے کو روکنے کی ایک آخری کوشش کی جا سکے۔ ماؤنٹ بیٹن نے بھی صورتحال کا سامنا کافی ڈرتے ڈرتے کیا آپ ان کی حیرت اور سکھ کا اندازہ کر سکتے ہیں جب مہاتما نے نہایت شائستگی سے خطوں کے استعمال شدہ لفافوں کی پشت اور کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر لکھ کر بتایا کہ وہ یوم خاموشی منا رہے ہیں۔

"جب یہ ملاقات ختم ہو گئی تو ماؤنٹ بیٹن نے کاغذوں کی مختلف چھوٹی چھوٹی پرچیاں اٹھائیں جن کے متعلق انہوں نے کہا کہ یہ ان کی زندگی کے

بہت اہم مقدس اثاثوں میں شامل ہوں گی۔ ایک پرچی پر مہاتما نے لکھا تھا۔ "میں معافی چاہتا ہوں کہ میں بات نہیں کر سکتا۔ جب میں نے سوموار کے یوم خاموشی کا فیصلہ کیا تو میں نے اس میں دو گنجائشیں رکھیں، فوری معاملات پر اعلیٰ اہلکاروں سے بات چیت یا بیماروں کی عیادت۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ میری خاموشی کا خاتمہ نہیں چاہتے۔ کیا میں نے اپنی تقریروں میں آپ کے خلاف ایک لفظ بھی کہا؟ اگر آپ تسلیم کرتے ہیں کہ میں نے نہیں کہا تو آپ کی تنبیہ بے معنی ہے۔ ایک دو باتیں ہیں جن کے متعلق میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں لیکن آج نہیں۔ اگر ہم دوبارہ کبھی ملے تو میں کچھ کہوں گا۔"

(ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ مشن، صفحہ ۱۰۱)

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں گاندھی جی نے ۲ جون کو ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ اجلاس میں کانگریس کی طرف سے تقسیم کے منصوبے کو قبول کرنے کے خلاف کسی لفظ یا اشارے سے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ لیکن اگلے ہی روز آثار و علائم بتانے لگے کہ گاندھی جی بغاوت کے موڈ میں ہیں۔ ۳ جون کی شام کو جب وائسرائے اور رہنما منصوبے کو ریڈیو پر نشر کرنے والے تھے، گاندھی جی نے ماؤنٹ بیٹن کے منصوبۂ تقسیم پر کڑی نکتہ چینی کی اور حملے کے ہدف کے طور پر نہرو کو چن لیا۔ انہیں "ہمارا بادشاہ" کہنے کے بعد انہوں نے تبصرہ فرمایا۔

"ہمیں ہر اس چیز سے متاثر نہیں ہو جانا چاہئے جو بادشاہ سلامت کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔ اگر وہ ہماری بہتری کے لئے کچھ تجویز کرتے ہیں تو ہمیں ان کی تعریف کرنی چاہئے اگر وہ ایسا نہیں کرتے پھر ہم ایسا ہی کہیں گے۔"

(ایضاً، صفحہ ۱۱۰)

جب وائسرائے ہاؤس میں گاندھی جی کی تقریر کی رپورٹ ماؤنٹ بیٹن کو پہنچی تو وہ کافی پریشان ہوئے۔ جناح اور لیاقت علی نے بھی شکایت کی کہ گاندھی جی پریشان کن بیانات دے

کر عوام کو من مانی حرکتوں پر اکسا رہے ہیں اور انہیں تقسیم کو تسلیم کرنے والے رہنماؤں کی بجائے دوسروں کی طرف رجوع کے لئے کہہ رہے ہیں۔ ماؤنٹ بیٹن نے ٹھنڈے دل و دماغ سے معاملے پر غور کیا اور پھر انہوں نے کیا اقدامات کئے اس کا تذکرہ ایلن کیمپ بیل جانسن نے اس طرح کیا ہے۔

"ماؤنٹ بیٹن نے دانشمندی سے محسوس کیا کہ وقت آگیا ہے کہ گاندھی جی کے ساتھ فضاء صاف کی جائے اور ان کی ظاہری ناگوار کارروائیوں کو مضبوط اور مزید خطرناک شکل اختیار کرنے سے روکا جا سکے۔ چنانچہ دعائیہ اجلاس سے کچھ پہلے انہوں نے گاندھی جی کو وائسرائے ہاؤس آنے کی دعوت دی۔ گاندھی جی واضح طور پر افسردگی کی حالت میں تھے کیونکہ منصوبے کے پہلے تاثر کے تحت وہ محسوس کر رہے تھے کہ ہندو مسلمان اتحاد کے لئے ان کی عمر بھر کی مساعی زمین بوس ہو گئی ہیں۔ لیکن ماؤنٹ بیٹن نے اپنی تمام مدللانہ اہلیتوں کو مجتمع کر کے ان پر زور دیا کہ وہ اس اعلان کو ماؤنٹ بیٹن کا نہیں بلکہ گاندھی کا منصوبہ سمجھیں۔ ماؤنٹ بیٹن نے انہیں قائل کر دیا کہ انہوں نے پورے خلوص سے (اپنے منصوبے میں) گاندھی کے بنیادی تصورات عدم تشدد' حق خود ارادی' انگریزوں" کی رخصتی کی جلد از جلد ممکنہ تاریخ اور حتیٰ کہ ڈومینین کی حیثیت کے لئے ان کے ہمدردانہ خیالات کو جگہ دینے کی پوری کوشش کی ہے"

(ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ مشن صفحہ ۱۱۰)

پیارے لال نے ماؤنٹ بیٹن۔ گاندھی ملاقات کا تذکرہ مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے۔

"وائسرائے نے گاندھی جی کو ۴ جون کو مدعو کیا اور بڑی عزت سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ کہ منصوبۂ تقسیم پر گاندھی جی کے اعتراضات کیوں درست نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنا کیس اس قدر مہارت سے مدلل انداز میں سیلز مین کے سے سلیقے سے پیش کیا کہ "دوست بنانے اور لوگوں کو متاثر کرنے کا فن" کا مصنف اس پر رشک کر سکتا تھا۔

(آخری دور، جلد دوم، صفحہ ۲۱۷)

وائسرائے کے گھر سے گاندھی جی سیدھے دعائیہ اجلاس میں پہنچے۔ ماؤنٹ بیٹن کس طرح گاندھی پر مکمل طور پر فتح یاب ہونے میں کامیاب ہوئے اس کا ذکر ایلن کیمپ بیل جانسن کی زبانی سنئے۔

"ایک مرتبہ پھر ماؤنٹ بیٹن کس طرح فاتح یوم ثابت ہوئے۔ اس کا اندازہ ان الفاظ سے کیا جا سکتا ہے جو آج شب گاندھی جی نے کہے۔ "برطانوی حکومت تقسیم کی ذمہ دار نہیں ہے" گاندھی جی نے دعائیہ اجلاس سے کہا! "اس میں وائسرائے کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ در حقیقت وہ اس کے اتنے ہی خلاف ہیں جتنی کانگریس خود، لیکن اگر ہم دونوں ----- ہندو اور مسلمان ----- کسی اور چیز پر متفق نہیں ہو سکتے تو پھر وائسرائے کے پاس اور کیا چارہ رہ جاتا ہے"

(ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ مشن، صفحہ ۱۱۰)

گاندھی جی کو اب ڈوبتا ہوا سورج کہا جا سکتا تھا جو اپنی خیرہ کن روشنی سے محروم ہو چکا تھا، ایک کمزور، غیر موثر، اور مایوس نظر انداز شدہ بوڑھا آدمی جو اب ماضی کے متحرک، طاقتور اور جاندار گاندھی سے بالکل مختلف تھا۔ تنہ ولکر کے مطابق دعائیہ اجلاس میں گاندھی جی کا بیان کچھ یوں تھا۔

"جو کچھ ہوا اس کے لئے وہ ماؤنٹ بیٹن کو الزام نہیں دے سکتے۔ یہ سب کانگریس اور مسلم لیگ کا کیا دھرا ہے۔ وائسرائے نے تو کھل کر کہا تھا کہ وہ ایک متحدہ ہندوستان چاہتے ہیں لیکن کانگریس کی جانب سے مسلم پوزیشن کی قبولیت کے سامنے وہ بے بس ہیں۔

(جلد ۸، صفحہ ۴)

ایک اخباری نامہ نگار سے گاندھی جی نے کہا۔

"غالباً ہندوستان کی تقسیم پر مجھ سے زیادہ ناخوش اور کوئی نہیں۔ لیکن میں اب ایک

طے شدہ حقیقت کے خلاف کسی قسم کی جدوجہد شروع کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔۔۔۔۔ نہ میں انگریزوں پر آپ کے حملے (نکتہ چینی) کی حمایت کر سکتا ہوں۔ انہوں نے کسی طرح بھی اس اقدام کو آگے بڑھایا ہے نہ اس کی حوصلہ افزائی کی ہے۔"

(مہاتما گاندھی ۔۔۔ آخری دور، جلد دوم، صفحہ ۲۴۴)

لارڈ ویول کو جنہوں نے ہندوستان کی جغرافیائی وحدت برقرار رکھنے کے لئے اپنے طور پر ہر ممکن کوشش کی تھی سخت اہانت کا نشانہ بنایا گیا اور ان کی کوششوں کی وجہ سے انہیں فوری طور پر برطرف کر دیا گیا۔ سرکار لائل ریڈ کلف نے جنہیں پنجاب کی تقسیم کے لئے متعین کیا گیا۔ پنجاب کے عظیم نظام آبپاشی کی تقسیم میں مضمر حماقت کو محسوس کر لیا وہ اس طرح کہ پانی فراہم کرنے والے دریاؤں کے منبع مشرق میں تھے جب کہ سیراب ہونے والی زمینیں مغرب میں تھیں۔ جب سرکار لائل ریڈ کلف نے پنجاب کی تقسیم سے نظامِ آبپاشی کو لاحق ہونے والے خطرات کی نشاندہی کی تو کانگریس اور لیگ دونوں کے رہنماؤں کی جانب سے انہیں "آگاہ" کیا گیا وہ سیاست میں ملوث نہ ہوں بلکہ اپنے کام سے غرض رکھیں۔ اور پنجاب کی تقسیم کے منصوبے پر عمل درآمد کریں۔ اس وقت ہندوستانی رہنماؤں بشمول سکھ لیڈروں کے کسی میں بھی اس قدر دور اندیشی نہ تھی تقسیمِ نظامِ آبپاشی کے نتیجے میں پھیلنے والی بربادی کا قبل از وقت اندازہ کر سکتے۔ لیکن جب پنجاب کے دو حصوں میں حتمی حد فاصل ۱۷ اگست کو کھینچ دی گئی تب سکھوں کو یہ پتہ چلا کہ اس نہری نظام کا بیشتر حصہ جو سکھوں کے سرمائے سے بنا تھا اور گندم اگانے والی زرخیز زمینیں پاکستان میں شامل کی گئی ہیں۔ نتیجتاً آتشزنی، لوٹ مار، آبرو ریزی اور قتل عام کا سلسلہ اس وسیع پیمانے پر شروع ہوا جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

۱۴ جون ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس بمبئی میں ہوا۔ اس اجلاس میں گاندھی جی نے ارکان سے کہا کہ ورکنگ کمیٹی کی قراردادِ تقسیم کی مخالفت غیر مناسب ہو گی۔ انہوں نے کہا۔ "ارکان کو یاد رکھنا چاہئے کہ ورکنگ کمیٹی ان کی نمائندہ کے طور پر

اس منصوبے (ماؤنٹ بیٹن کے منصوبے) کو تسلیم کر چکی ہے اور اب ورکنگ کمیٹی کا ساتھ دینا ان کا فرض ہے۔ ان کے اپنے خیالات سب کو اچھی طرح معلوم ہیں۔"

(مہاتما گاندھی ---- آخری دور' جلد دوم' صفحہ ۲۵۱)

جو لوگ ورکنگ کمیٹی کی جانب سے تقسیم کا منصوبہ تسلیم کئے جانے پر بغاوت کے موڈ میں تھے' ان سے گاندھی جی نے کہا۔

"آج مجھ میں ہمت نہیں ہے وگرنہ میں اکیلا اعلان بغاوت کر دیتا" اس اجلاس میں پنڈت نہرو کی تقریر سے اکتاہٹ اور تھکن نمایاں تھی۔ لیکن سردار پٹیل نے بے تکلفی سے جاندار تقریر کی جس میں انہوں نے وضاحت کی کہ کیوں وہ اب مزید گاندھی جی کے خطوط کی مکمل پیروی نہیں کر سکتے۔ "سردار پٹیل کی تقریر کے اختتامی حصے نے اختلافات کی اس جڑ سے پردہ اٹھا دیا جس نے اس اہم موقعے پر کانگریس ہائی کمان کی راہ گاندھی جی سے جدا کر دی تھی۔ انہوں نے کہا کہ آزادی آ رہی ہے۔ انہیں اب صنعتیں قائم کرنی چاہئیں۔ انہیں لازماً فوج قائم کرنی چاہئے اور اسے نہایت مضبوط اور اعلیٰ کارکردگی کا حامل بنانا چاہئے۔"

(مہاتما گاندھی ---- آخری دور' جلد دوم' صفحہ ۲۵۵)

آخر میں ورکنگ کمیٹی میں گاندھی جی کا کوئی بھی دوست اور مقلد نہ رہا۔ "حتیٰ کہ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے بھی خود کو ان کا ہم قدم رہنے کے قابل نہ پایا حالانکہ گاندھی جی سے ان کی وفاداری ناقابل بیان تھی۔ انہوں نے ایک اخباری انٹرویو میں کہا کہ اگر ہندوستان کو تقسیم ہونا ہے تو اسے اس قدر مکمل طور پر تقسیم ہونا چاہئے جس قدر ممکن ہے۔ اس میں پنجاب اور بنگال کی تقسیم بھی شامل ہونی چاہئے تاکہ کسی تنازعے یا کشمکش کے لئے کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اگر مسلح افواج کی تقسیم کی ضرورت پیش آئے تو یہ بھی ہو جانی چاہئے اور یہ جس قدر جلد ہو سکے اسی قدر بہتر ہے

(مہاتما گاندھی ---- آخری دور' جلد دوم' صفحہ ۲۶۵)

اس طرح گاندھی جی کے نہایت قابل اعتماد سپاہیوں سردار پٹیل اور ڈاکٹر راجندر پرشاد نے ان کے اہنسا اور عدم تشدد کے فلسفے کو بہت ہی غیر اہم اور معمولی انداز میں دفن کر دیا۔ اس موقعے پر گاندھی جی کی پوزیشن کو پیارے لال نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"(گاندھی جی) اس بوڑھے آدمی کی طرح تھے جسے بلند مقام پر فائز کیا جائے' جسے اس کی دانشمندی اور غلطی سے مبرا فہم کے لئے سراہا جائے' جس سے مشاورت طلب کی جائے' جس کی بات مودبانہ توجہ سے سنی جائے اور پھر اسے چھوڑ کر چلا جایا جائے"

(مہاتما گاندھی ---- آخری دور' جلد دوم' صفحہ ۳۳)

در حقیقت گاندھی جی کانگریس کے رہنماؤں پر اپنا پرانا اثر و رسوخ کھو چکے تھے۔ ان کے اثر و نفوذ کے خاتمے کا آغاز "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کی المناک ناکامی سے ہوا جو انہوں نے کانگریس کے رہنماؤں کی مشاورت کے بغیر شروع کی تھی۔ پیارے لال لکھتے ہیں۔

"یہ بات سب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ کانگریس کے چند سربر آوردہ ترین رہنماؤں نے ۱۹۴۲ء میں اپنی آخری قید کے دوران حقیقتاً "آئندہ کبھی نہیں کی آواز بلند کی تھی جب ریاستی جبر اپنی پوری طاقت کے ساتھ کانگریس پر ٹوٹ پڑا تھا ----- ان کا رسوخ اس وقت مزید کم ہوا جب نہرو' پٹیل اور کانگریس کے دیگر سرکردہ رہنماؤں نے ۱۹۴۶ء میں عبوری حکومت میں شمولیت اختیار کر لی اس سے قبل گاندھی جی کا فرمان ان کے لئے قانون کی حیثیت رکھتا تھا لیکن ستمبر ۱۹۴۶ء میں مرکز میں عبوری حکومت کے قیام کے بعد سورتحال تبدیل ہو گئی۔ گاندھی جی خود بھی محسوس کرنے لگے کہ ان کے قریب ترین سپاہی جن پر وہ عرصہ دراز سے بھروسہ کرتے چلے آرہے تھے اب مکمل طور پر ان کے وفادار نہیں رہے۔ انہوں نے دکھ کا اظہار کیا کہ ----- ان کے قدیم محافظ جو اب مختلف ماحول میں کام کر رہے ہیں' مختلف افراد میں گھرے ہوئے ہیں اور مختلف ذرائع سے کام کر رہے ہیں اب سوچنے بھی مختلف انداز میں لگے ہیں۔

انہوں نے نئے روابط اور نئے ناطے قائم کر لئے ہیں، جن کے ساتھ بعض اوقات نئی وفاداریاں بھی وابستہ ہوتی ہیں ---- گاندھی جی نے اس تبدیلی کو کربناک دلچسپی سے محسوس کیا"

(مہاتما گاندھی ---- آخری دور' جلد دوم' صفحات ۴۴۳۔۴۴۲)

یہاں کوئی یہ بات پوچھ سکتا ہے کہ ملک کی تاریخ کے فیصلہ کن ترین دور میں ہندوستانی رہنماؤں نے شکست خوردگی کا رویہ کیوں اپنایا اور مادر ہند کی چیر پھاڑ کو قبول کر کے ہتھیار ڈالنے کی ذہنیت کا ثبوت کیوں دیا؟ اس کا اعتراف خود نہرو نے اپنے سوانح نویس مائیکل بریشر کے سامنے ان الفاظ میں کیا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ واقعات کے جبر اور اس احساس کا نتیجہ تھا کہ ہم اس ذریعے سے جمود اور انحطاط سے نہیں نکل سکتے جو ہم نے اب تک اپنا رکھا تھا کیونکہ اس سے صورتحال مزید خراب ہو گئی تھی۔ مزید برآں ایک احساس یہ بھی تھا کہ اگر ہم نے اس پس منظر میں آزادی ہند حاصل بھی کر لی تو یہ ایک بے حد کمزور ہندوستان ہو گا یعنی کہ ایک وفاقی ہندوستان جس کی طاقت کا بہت ہی بڑا حصہ وفاقی اکائیوں کے تسلط میں ہو گا"

حقیقت یہ ہے کہ بشمول گاندھی جی ہندوستان کے تمام رہنما سب تھکے ہوئے بوڑھے آدمی تھے جو اب لڑنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ نہرو کے اپنے الفاظ میں "ہم تھکے ہوئے انسان تھے جن کی عمریں بھی بہت زیادہ ہو چکی تھیں۔ تقسیم کے منصوبے نے ایک راستہ دکھایا جسے ہم نے اپنا لیا"

(انگریز راج کے آخری ایام از ایل موزلے صفحہ ۲۴۸)

ڈاکٹر رام منوہر لوھیا نے اپنی کتاب "تقسیم کے قصور وار افراد" کے صفحات نمبر ۵۶ اور ۵۷ پر لکھا ہے کہ اس میں معمولی سا بھی شبہ نہیں کہ فساد زدہ صورتحال میں کام کرنے والی انحطاط پذیر قیادت نے تقسیم کا عمل پیدا کیا جب کہ بامقصد' پامرد اور زیادہ نوجوان

افراد اسے روک سکتے تھے۔ حتیٰ کہ گاندھی جی نے کہا ---- "طاقت کے تصور نے ہمیں اخلاقی طور پر محروم کر دیا تھا"

(مہاتما گاندھی ---- آخری دور، جلد دوم، صفحہ ۲۰۹)

بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ ہندوستانی رہنماؤں میں کچھ صبر اور تھوڑی سی سیاسی دانشمندی تقسیم کو روکنے میں بہت زیادہ کردار ادا کر سکتی تھی۔ "انگریز راج کے آخری ایام" کا مصنف صفحہ ۲۴۷ پر اصل موضوع سے ہٹ کر کہتا ہے ----- "لیکن نہرو، پٹیل اور تمام کانگریسی افراد کے لئے جو اقتدار کا پھل کھانے کے لئے ترس رہے تھے اس مزیدار گاجر کو ٹھکرانا بے حد مشکل تھا جو ماؤنٹ بیٹن نے ان کے ناک کے سامنے لہرائی تھی۔ وہ تیزی سے اسے ہڑپ کر گئے۔" تقسیم کے دو برس بعد ۱۶ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو پنڈت نہرو نے نیویارک کے ایک اجتماع کے سامنے کہا کہ اگر وہ قتل و غارتگری کی صورت میں تقسیم کے بھیانک مضمرات سے آگاہ ہوتے تو یقیناً ہندوستان کے بٹوارے کے خلاف مزاحمت کرتے ----- جہاں تک اچاریہ کرپلانی کا تعلق ہے تو بعد میں آنے والے برسوں میں ان کے محبوب ترین خطابات کانگریس ہائی کمان کے ان افراد کے لئے مخصوص تھے جن پر وہ تقسیم کی پوری ذمہ داری عائد کرتے تھے" -----

(مہاتما گاندھی ---- آخری دور جلد دوم، صفحہ ۲۵۶)

تقسیم، ہندوستان ہی کی نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ کا نہایت اہم واقعہ ہے۔ یہ کسی قدرتی آفت کی طرح تھا جس نے تاریخ کا دھارا موڑ دیا۔ تقسیم کے نقصانات اور مضمرات کا تخمینہ لگانے میں نااہلی کی پاداش میں ہندوستانی رہنماؤں کو یقیناً تاریخ کی عدالت کے سامنے جوابدہ ہونا پڑے گا۔

شاملہ (۱)

سانحہ تقسیم بنگال

کابینہ مشن منصوبے نے ہندوستان اور ساتھ ہی بنگال کی وحدت کی ضمانت دی تھی۔ لیکن اس منصوبے کے تحت بنگال کے مشرقی حصے اور آسام کو امور خارجہ اور دفاع کے علاوہ مکمل صوبائی خود مختاری حاصل ہونا تھی۔ اگر منصوبے پر عمل درآمد ہو جاتا تو بنگال یا آسام، کسی میں بھی گاندھی جی اور کانگریس ہائی کمان کا حکم نہ چل سکتا۔ چنانچہ اس منصوبے کو تسلیم کرنا گاندھی جی کے لئے ناممکن تھا اور وہ اس کو کامیابی سے دبانے کے لئے ڈٹ گئے۔ گاندھی جی کے ان افعال کے نتیجے میں پیدا ہونے والی پیچیدگیاں لارڈ ویول کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی تقرری کا باعث بنیں۔ ہندوستانی منظر نامے پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ظاہر ہوتے ہی یہ واضح ہو گیا کہ اب ہندوستان میں انتقال اقتدار کے عمل کو تیز کر دیا جائے گا اور اگر ضرورت پڑی تو بنگال کی تقسیم سے بھی گریز نہیں کیا جائے گا۔

جب ملک کے سامنے پاکستان کے قیام اور بنگال کی تقسیم کا بھیانک منظر صاف نظر آنے لگا تو بنگالی مسلمان سخت خوفزدہ ہو گئے۔ اب انہیں احساس ہوا کہ غالباً ان پر پنجابی اور پختون حکمرانی کریں گے جن کے ساتھ مشترکہ مذہب کے علاوہ ان کا کوئی اور ناطہ نہیں۔ مشترکہ زبان ایک بہت بڑا بندھن ہے جو مشترکہ مذہب سے کہیں زیادہ موثر ہوتی ہے۔ بنگالی مسلمانوں کو بالائی اور شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کی نسبت کہیں زیادہ وابستگی بنگالی ہندوؤں سے تھی کیوں کہ مذکورہ مسلمانوں سے وہ کئی طرح سے مختلف تھے۔ بنگال کی تقریباً تمام تر مسلم آبادی، ہندو مت ہی کو ترک کر کے مسلمان ہوئی تھی۔ ہندو مسلم دونوں کو بنگالی زبان و ادب پر یکساں ناز ہے۔ وہ (ماضی میں) ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے شریک تھے اور ایک دوسرے کے مذہبی تہواروں میں بھی اکٹھے شریک ہوتے تھے۔ تقسیم کی ممکنہ آفات نے انہیں ایک مرتبہ پھر یکجا کر دیا۔

یہاں علیحدگی کے بیج بیسویں صدی کے آغاز میں دو سرکاری کارروائیوں کے ذریعے بوئے گئے۔ اول' لارڈ کرزن کی جانب سے ۱۹۰۵ء میں بنگال کی تقسیم۔ "دوم" ۱۹۰۸ء کی منٹو مارلے اصلاحات کے نتیجے میں جداگانہ طرز انتخاب کی ترویج۔ چنانچہ اس کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سیاسی و فرقہ وارانہ تعلقات پہلے کی طرح خوشگوار نہیں رہے۔ لیکن بنگال میں سیاسی رہنما کی حیثیت سے سی آر داس کے ابھرنے کے بعد معاملات میں کافی سلجھاؤ پیدا ہوا۔ جب تک سی آر داس زندہ رہے' ہندو اور مسلمان دونوں کونسل اور کلکتہ کارپوریشن میں ان کی زیر قیادت چلتے رہے۔ جب سی آر داس کلکتے کے میئر بنے تو انہوں نے ڈپٹی میئر کا عہدہ شہید سہروردی کو پیش کیا۔ اور کارپوریشن کی دیگر تقرریوں میں مسلمانوں کو ان کا جائز حق دیا۔ اس سلسلے میں' سی آر داس کی مدد سبھاش چندر بوس نے نہایت عمدگی سے کی جنہیں کارپوریشن کا چیف ایگزیکٹو آفیسر مقرر کیا گیا۔ لیکن سی آر داس کی موت کے بعد معاملات اتنے خوشگوار نہ رہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو بگاڑنے کا الزام کسی اور سے زیادہ غیر بنگالی مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے۔ ان بیرونی عناصر کے ہتھکنڈوں کے باعث کبھی کبھار بنگال میں چھوٹے موٹے فرقہ وارانہ فسادات ہو جاتے تھے۔ ۱۹۴۰ء کے قریب بنگال لیجسلیٹو اسمبلی میں ایک بنگالی مسلمان ابو حسین سرکار (جو بعد ازاں مشرقی پاکستان کے وزیر اعلیٰ بنے) نے ہندوستان کے دیگر حصوں کے مسلمان استحصالیوں کے خلاف بنگالی مسلمانوں کے جذبات کا اظہار اپنی ایک تقریر میں کیا۔ کلکتہ میونسپل (ترمیمی) بل ۱۹۳۹ء کے پیش کئے جانے پر جس میں کلکتہ میونسپل انتخابات میں جداگانہ طرز انتخاب رائج کرنے کی سفارش کی گئی تھی' ابو حسین سرکار نے کہا۔

"کلکتہ کارپوریشن میں مسلمانوں کے مفادات کی نمائندگی کی آڑ میں غیر بنگالی عناصر کلکتے میں اپنا تسلط جاری رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ لوگ بنگال کے سب سے بڑے بلدیاتی ادارے پر بھی اپنا قبضہ قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ سر' بدقسمتی سے مسلم کلکتے میں اردو

بولنے والے غیر بنگالیوں' ایرانیوں' سہروردیوں' صدیقیوں' آدم جیوں اور کریم بھائیوں کی اکثریت ہے۔"

بنگالی مسلمان تصور پاکستان کو زیادہ پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے لیکن کانگریس ہائی کمان کے حربوں نے انہیں کانگریس سے بھی دور رکھا۔ بنگالی مسلمان رہنما اب خوفزدہ ہو گئے کہ اگر جناح کے خواب پاکستان نے حقیقت کا روپ دھار لیا تو ان پر پنجابی اور پٹھان حکمرانی کریں گے۔ ان حالات میں جب زیر غور تقسیم یقینی ہو گئی تو ہندو سیاسی رہنماؤں نے سرکردہ مسلم سیاسی رہنماؤں کے ساتھ مل کر ایک محاذ قائم کیا تاکہ اس تقسیم کو روکا جا سکے۔ ان ہندو رہنماؤں کی قیادت سرت بوس اور کرن شنکر رائے کر رہے تھے۔ اس فرنٹ میں شامل سرکردہ رہنما حسین شہید سہروری (بنگال کے وزیر اعلیٰ)' محمد علی بوگرہ (جو کچھ عرصہ پاکستان کی وزیر اعظم بھی رہے)' فضل الرحمٰن اور عبدالہاشم تھے۔ موخر الذکر بنگال صوبائی مسلم لیگ کے سیکرٹری بھی تھے۔ بہت زیادہ غور و خوض کے بعد انہوں نے 'خود مختار بنگال' کا تصور پیش کیا جو پاکستان اور ہندوستان دونوں سے جداگانہ ہو۔ اس کے بعد وہ جناح اور گاندھی سے ملے۔ جناح نے کہا کہ اگر بنگال میں مسلم لیگ اور کانگریس دونوں' خود مختار بنگال کے قیام پر رضامند ہو جائیں تو وہ اس کے راستے میں نہیں آئیں گے۔ لیکن' انہوں نے مزید کہا اس صورت میں انہیں اپنے پاکستان کے لئے پورا' غیر منقسم پنجاب درکار ہو گا۔

تاہم گاندھی جی کا رویہ بے حد محتاط تھا۔ جب سرت بوس اور بنگال مسلم لیگ کے سیکرٹری عبدالہاشم نے گاندھی جی سے مشترکہ مذاکرات کئے تو عبدالہاشم نے "متحدہ خود مختار" بنگال کا منصوبہ ان کے سامنے مشترکہ زبان' مشترکہ کلچر اور مشترکہ تاریخ کی اساس پر پیش کیا جس نے بنگال کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو یکساں طور پر متحد کر رکھا تھا۔ "خواہ ہندو ہو یا مسلم" بنگالی بنگالی ہے۔ ہندو اور مسلمان بنگالیوں دونوں کو ایک ہزار میل کے فاصلے سے پاکستانیوں کے زیر حکمرانی آنے سے شدید نفرت ہے"۔

(پیارے لال ---- آخری دور' جلد دوم' صفحہ ۱۸۰)

ابو الہاشم کی دلیل سے نکتہ لے کر گاندھی جی نے کہا---- "بنگال کا وہ مشترکہ کلچر جو ٹیگور میں یکجا ہوا اور جس کی طرف لیگ کے سیکرٹری نے اشارہ کیا ہے اس کی جڑیں اپنیشدوں کے فلسفے میں ہیں جو نہ صرف بنگال بلکہ پورے ہند کا مشترکہ ورثہ ہے۔ کیا خود مختار بنگال باقی ماندہ ہندوستان کے ساتھ ایک رضاکارانہ ایسوسی ایشن (تنظیم/اتحاد) میں شمولیت پر غور کرے گا؟" ظاہر ہے کہ لیگ کے سیکرٹری کے لئے اس سوال کا جواب دینا بے حد مشکل تھا لہٰذا وہ خاموش رہے۔ تاہم اس کا جواب بنگال کے وزیر اعلیٰ حسین شہید سہروری نے ۱۵ مئی کو دہلی میں ایک پریس کانفرنس میں دیا۔ سہروردی نے کہا کہ بنگال اور انڈین یونین کے مشترکہ معاملات سے متعلق کوئی تفہیم یا بندوبست ممکن ہو سکتا ہے۔ آپ اسے معاہدہ یا جو چاہے کہہ لیں۔ بہرحال یہ سوچنا بھی غلط ہے کہ بنگالی کلچر صرف اپنیشدوں پر مبنی خالصتاً ہندو کلچر ہے۔ بلاشبہ اس کی جڑیں قدیم ہندو تہذیب میں پیوست ہیں۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس میں دیگر تہذیبوں کے اثرات بھی جذب ہو گئے۔ بنگالی کلچر ایک آفاقی کلچر ہے جس میں انسانیت پرستی کا پرتو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بنگال میں ذات پات کے کٹڑے نظام اور چھوت چھات کو زیادہ زرخیز زمین میسر نہ ہوئی۔ بنگال پر اسلام کے اثرات بھی بے حد گہرے ہیں۔

بنگال اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے رہنما کران شنکر رائے نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کی جنہوں نے خود مختار بنگال کے تصور سے ہمدردی ظاہر کیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے رائے ظاہر کی کہ اگر مسلم لیگ مشترکہ طرز انتخاب' کمپوزٹ (متحدہ) کابینہ کے قیام اور ملازمتوں میں ۵۰' ۵۰ فی صد شرکت کی پیشکش کرے تو بنگال کانگریس کو اسے مان لینا چاہئے خواہ اس کا مقصد انڈین یونین اور پاکستان سے علیحدہ خود مختار ریاست بنگال کا قیام ہو۔

سرت بوس نے س تجویز کا نہایت گرمجوشی سے خیر مقدم کیا اور بنگال کے ہندو اور مسلمان رہنماؤں کو اکٹھا کرنے میں بڑھ چڑھ کر کردار ادا کیا۔ گاندھی جی کے نام ۲۳ مئی

۱۹۴۷ء کو لکھے گئے ایک خط میں دونوں جماعتوں کے درمیان ہونے والے اتفاق رائے کی حد پر روشنی پڑتی ہے۔

"گزشتہ منگل کی شام (۲۰) مئی کو میرے گھر پر ایک کانفرنس ہوئی جس میں سہروردی' فضل الرحمٰن (وزیر)' محمد علی (وزیر)' عبدالہاشم (سیکرٹری بنگال مسلم لیگ' جو اب چھٹی پر ہیں)' عبدالمالک (رکن مجلس قانون ساز بنگال' نمائندہ محنت)' کرن شنکر اور ستیہ بابو (ستیہ رنجن بخشی) نے شرکت کی۔ ہم نے ایک عبوری معاہدہ کیا' جس کی ایک نقل آپ کے غور کے لئے لف ہذا ہے-----

"میں اب بھی محسوس کرتا ہوں کہ آپ کی مدد "مشاورت اور رہنمائی سے دونوں تنظیمیں عبوری سمجھوتے کے خطوط پر ایک حتمی معاہدہ کر سکتی ہیں۔ ہم بنگال اور ساتھ ہی آسام کے مسائل حل کر لیں گے۔ اس سے باقی ہندوستان پر بھی صحتمند اثرات مرتب ہو سکتے ہیں"

(آخری دور از پیارے لال' جلد دوم' صفحہ ۱۸۵)

گاندھی جی نے اس خط کا جواب ۸ جون ۱۹۴۷ء کو دیا جس کا متن حسب ذیل ہے۔

"میں نے آپ کے خاکے کا مطالعہ کیا ہے۔ میں نے اس کا سرسری تذکرہ پنڈت نہرو اور سردار پٹیل سے بھی کیا ہے۔ وہ اس تجویز کے سخت سے مخالف ہیں ان کی رائے میں یہ محض ہندو اور شیڈولڈ کاسٹ لیڈروں کو تقسیم کرنے کا ایک حربہ ہے۔ ان کے لئے یہ صرف شبہہ نہیں بلکہ یقین ہے۔ وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ شیڈولڈ کاسٹوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے۔ اگر یہی معاملہ ہے تو کم از کم اس مرحلے پر آپ کو یہ جدوجہد ترک کر دینی چاہئے کیونکہ بدعنوانی کے ذرائع سے خریدی گئی وحدت ایک صاف ستھری تقسیم سے بدتر ہو گی----

"آپ کو بنگال کی وحدت کے لئے جدوجہد ترک کر دینی چاہئے اور اس فضاء کو خراب نہیں کرنا چاہئے جو تقسیم بنگال کے لئے قائم کی گئی ہے"

(ایضاً صفحہ ۱۸۸)

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ گاندھی جی کے مذکورہ بالا خط میں سرت بوس کو نشاندہی کی گئی کہ پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کی رائے میں تقسیم کے خلاف بنگال کا احتجاج رشوت اور ناجائز ذرائع سے منظم کیا گیا اور گاندھی جی سرت بوس کو ایک خلل ڈالنے والے عنصر سے زیادہ کچھ تصور نہیں کرتے تھے۔ پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کے الزامات کو گاندھی جی نے دعائیہ اجلاس میں بھی دہرایا۔ گاندھی جی کے اس رویے کے خلاف سرت بوس اور سہروردی کی جانب سے نہایت شدید اور غصے سے بھرپور احتجاج کیا گیا۔ سرت بوس نے لکھا۔

"تقسیم کے حق میں جو شدومد سے مہم چلائی جارہی ہے اس کے بعد مجھے رتی بھر شبہ نہیں رہا کہ اگر کوئی ریفرنڈم منعقد کیا جائے تو بنگال کے ہندوؤں کی اکثریت تقسیم کے خلاف ووٹ دے گی۔ وقتی طور پر بنگال کی آواز دبا دی گئی ہے لیکن امید ہے کہ یہ خود کو منوا کر رہے گی" سہروردی کا خط بھی سخت ترین الفاظ میں لکھا گیا۔

"مجھے افسوس ہے کہ آپ کے بیان سے مسائل الجھ گئے ہیں صرف اخبار اس بیان کو اچھال کر بے حد مسرور ہیں کہ متحدہ بنگال کا منصوبہ بد دیانتی پر مبنی ہے۔ مجھے توقع نہیں ہے کہ ----- اس خط کا آپ پر رتی بھر اثر ہو گا لیکن معاف کیجئے گا مسٹر گاندھی میں اسے اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کے ناقابل تلافی بیان پر اپنا رد عمل ظاہر کروں ----- اور اس غلط فہمی پر جو آپ کے بیان سے پیدا ہو سکتی ہے۔ چونکہ آپ اپنے الزام کے سلسلے میں کسی ایک شخص کا نام لینے کے قابل نہیں ہیں اس لئے آپ نے ان تمام افراد پر کیچڑ اچھالا ہے جو متحدہ بنگال میں یقین رکھتے ہیں۔" تقریباً اسی وقت گاندھی جی نے سہروردی کو ایک حیرت انگیز پیشکش کی۔

"میں تقسیم کے معاملے میں بنگال کی پوزیشن کی نزاکت کو سمجھتا ہوں۔ اگر آپ اپنے اقوال و اعمال میں قطعی طور پر مخلص ہیں اور اگر آپ میرے دل میں اپنے خلاف

تمام شکوک کا ازالہ کریں' اور اگر آپ ہمیشہ بنگال کو بنگالیوں کے لئے رہنے دیں -----
ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے ----- اور اسے غیر متشدد ذرائع سے متحد رکھیں تو میں اس
وقت تک بخوشی آپ کا اعزازی پرائیویٹ سیکرٹری بن کر آپ کے گھر میں رہنے کے لئے
تیار ہوں جب تک ہندو اور مسلمان پھر اسی طرح بھائیوں کی طرح رہنا شروع نہیں کر
دیتے جیسے کہ وہ ہیں"

(آخری دور از پیارے لال' جلد دوم' صفحہ ۱۸۳)

سہروردی نے جواب دیا "کیسی پاگلوں جیسی پیشکش ہے! مجھے اس کے مضمرات کو
پوری طرح سمجھنے سے پہلے دس مرتبہ سوچنا ہو گا" سہروردی کو اس پر حیران ہونے کی کوئی
ضرورت نہ تھی' گاندھی جی کی پیش کش نئی بوتل میں پرانی شراب سے زیادہ کچھ حیثیت
نہیں رکھتی تھی۔ یہ بات بہت سے لوگوں کے لئے اچنبھے کا باعث ہو سکتی ہے کہ جب
سرت بوس اور بنگالی مسلمان رہنما باہمی معاہدے کے ذریعے اپنے فرقہ وارانہ اختلافات کو
ختم کرنے کی کوشش کر رہے تھے' گاندھی جی نے نہ صرف یہ کہ ان کی کوئی مدد نہیں کہ
بلکہ ان کی مساعی کو یہ کہہ کر نقصان پہنچایا "کہ ناجائز ذرائع سے خریدی گئی وحدت' صاف
ستھری تقسیم سے بدتر ہے" سرت بوس کے نام گاندھی جی کے خط سے صاف ظاہر ہوتا تھا
کہ اگر کوئی آفت اٹھ کھڑی ہوئی تو نہ صرف نہرو اور پٹیل بلکہ گاندھی جی بھی مشرقی بنگال
کو بھیڑیوں کے حوالے کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔ مشرقی بنگال کے تئیں نہرو کے
بے حسانہ رویے کا تذکرہ ڈاکٹر رام موہن لوھیا نے اپنی کتاب "تقسیم ہند کے قصور وار
افراد" کے صفحہ ۱۷ پر اس طرح کیا ہے۔

"مجھے اجازت دیجئے کہ میں ۱۹۴۶ء کے اختتام پر نواکھلی میں مسٹر نہرو سے ہونے
والی اپنی نجی بات چیت کا تذکرہ کر سکوں جس پر مجھے کم و بیش مہاتما گاندھی نے
مجبور کیا تھا۔ مسٹر نہرو نے مشرقی بنگال میں پانی' دلدل' جھاڑیوں اور درختوں کا
ذکر کیا جو انہوں نے ہر جگہ پائے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ وہ ہندوستان نہیں

ہے جس سے میں اور وہ واقف ہیں اور بہت شدت سے چاہتے ہیں کہ مشرقی بنگال کو ہندوستان کی مرکزی سرزمین سے کاٹ دیا جائے۔ یہ ایک غیر معمولی مشاہدہ تھا۔ وہ آدمی یقیناً کسی جذباتی دباؤ کے تحت بول رہا تھا۔ وہ کسی چیز پر اپنا دل مرکوز کر چکا تھا۔-----"

غیر بنگالی کانگریسی لیڈروں کے اس رویے کے پس پردہ وجوہات تلاش کرنا قطعاً مشکل نہیں۔ کانگریس کے ستون راجستھان اور مغربی ہندوستان کے سرمایہ دار تھے۔ یہی وہ افراد تھے جن کا رسوخ کانگریس کی پالیسی کی تشکیل میں سب سے زیادہ تھا اور ان کے مفادات کو ہمیشہ کانگریس میں بالادستی حاصل رہی۔ بنگال کی مغربی بیلٹ اور بہار کے چھوٹا ناگپور خطے میں ان افراد کی لوہے اور کوئلے کی کانیں تھیں۔ ان علاقوں اور کلکتے کی بندرگاہ پر کنٹرول ان افراد کے مفادات کے لئے بے حد ضروری تھا۔ چنانچہ کانگریسی رہنماؤں کا یہ رویہ فطری تھا جو انہی افراد کے ترجمان تھے اور انہوں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ اگر بدترین واقعہ بھی ہو اور بالآخر بنگال کو تقسیم کرنے ہی کا حتمی فیصلہ ہو جائے تو یہ تقسیم اس طرح ہونی چاہئے کہ کلکتے کی بندرگاہ اور مغربی بیلٹ لازماً یونین آف انڈیا کے علاقوں میں شامل ہو۔ مشرقی اور مغربی بنگال کی عضویاتی وحدت سے کانگریسی رہنماؤں کو کوئی سروکار نہ تھا نہ وہ بنگالیوں کے جذبات سے لین دین رکھتے تھے انہیں تو اس سوال سے بھی کوئی غرض نہ تھی کہ تقسیم بنگال سے اس کے عوام پر کیا سیاسی و اقتصادی اثرات مرتب ہوں گے۔ یہ ان کی خوش قسمتی اور بنگال کی بدقسمتی تھی کہ بنگال کی مغربی بیلٹ ہندو اکثریت کا علاقہ تھی۔ کانگریس کے شاطر غیر بنگالی سرمایہ داروں نے اب اس صورتحال کا پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے بنگال کے ہندوؤں میں شدید خوف کی فضا اور یہ عوامی احساس پیدا کرنا شروع کر دیا کہ (خصوصاً مغربی بنگال میں) کہ ان کی واحد نجات اس میں مضمر ہے کہ مغربی بنگال کے ہندو اکثریت کے علاقوں کو ایک علیحدہ صوبے میں یکجا کر دیا جائے۔ ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی اور ان کی ہندو مہاسبھا اس جال میں پھنس گئی۔ چنانچہ فوراً ہی ۱۹ مارچ ۱۹۴۷ء

کو انہوں نے ایک اخباری بیان جاری کر دیا جس میں مطالبہ کیا گیا کہ غیر منقسم ہند ہی میں بنگال کو تقسیم کر دیا جائے۔

(آخری دور از پیارے لال، جلد دوم، صفحہ ۱۸۳)

ڈاکٹر شیام پرشاد اور ان کے ہم خیالوں کی اس افسوسناک حرکت سے سریندر ناتھ بنیر جی، آنند موہن بوس، اشونی کمار دت، کرشن کمار مترا اور ان تمام عظیم افراد کی عمر بھر کی کاوشیں خاک میں مل گئیں جنہوں نے لارڈ کرزن کی ۱۹۰۵ء کی تقسیم بنگال کے خلاف بھرپور جنگ لڑی تھی۔ یہ ایک سانحہ تھا کہ یہ گمراہ افراد مشرقی بنگال میں ہندو اقلیت کی تقدیر کا قبل از وقت اندازہ نہ کر سکے۔

ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی اور ان کے پیروکاروں کے کردار سے مشرقی بنگال کی روح کو جو کرب سہنا پڑا اس کا اظہار شری اخیل چندر دت کے اس خط سے ہوتا ہے جو انہوں نے گاندھی جی کے نام لکھا۔ اخیل چندر دت لارڈ کرزن کے دور کے پرانے مجاہد آزادی تھے۔

"بنگال کی تقسیم کے لئے ایک تحریک شروع کی گئی ہے تاکہ "ہندوؤں کے لئے اپنی سرزمین محفوظ کی جا سکے" یہ ایک شکست خوردہ ذہنیت کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ فی الحقیقت یہ تحریک فرقہ وارانہ نظر آتی ہے۔ بلاشبہ فرقہ واریت کے خلاف لڑنا چاہئے لیکن ایک جوابی فرقہ ورانہ تحریک کے ذریعے نہیں جو ہندوؤں کے لئے ایک ملک کے لئے ہو۔ یہ تحریک عملاً اس اصول کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے جس پر مطالبہ پاکستان مبنی ہے۔ یہ فرقہ واریت کے مسئلے کا حل نہیں ہو گا بلکہ اسے بڑھا دے گا اور جاری رکھے گا۔ اس میں یہ بات نظرانداز کر دی گئی ہے کہ فرقہ واریت کا مرحلہ جلد گزر جائے گا اور وہ وقت دور نہیں جب سیاسی تقسیم کی بناء پر پیدا ہونے والے اقتصادی مسائل اس کی جگہ لے لیں گے ----- تقسیم کے نتیجے میں خوشحال ہندوؤں کا ایک حصہ مغربی بنگال ہجرت کر جائے گا اور چھوٹی ذات کے ہندوؤں اور شیڈولڈ کاسٹ ہندوؤں کو (جو زیادہ تر بے حد غریب ہیں) اپنی جان و مال و آبرو کے تحفظ کے لئے اسلام قبول کرنا پڑے گا۔ تقسیم سیاسی،

معاشی، سماجی، لسانی اور تہذیبی اعتبار سے ایک غلط اقدام ہو گی-----

"یہ میری تقدیر تھی کہ جوانی میں لارڈ کرزن کے ہاتھوں بنگال کی تقسیم کے خلاف لڑوں اور اب تقدیر کے مذاق کے باعث بڑھاپے میں مجھے ایک مرتبہ پھر بنگال کی تقسیم کے خلاف لڑنا پڑ رہا ہے جس کے متمنی میرے اپنے عوام ہیں-----"

(آخری دور از پیارے لال، جلد دوم، صفحہ ۱۷۸)

شاملہ (ب)

سانحہ تقسیم پنجاب

عمومی طور پر پنجاب ایک مسلم اکثریت کا صوبہ تھا لیکن یہاں مسلمانوں، سکھوں اور ہندوؤں کے باہمی فرقہ وارانہ تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے۔ ۱۹۲۰ء سے جب یہاں موشیگ، چیمسفورڈ اصلاحات متعارف کروائی گئیں، ۱۹۴۲ء تک جب سر سکندر حیات خان وزیر اعلیٰ تھے مسلم لیگ کو پنجاب کے عوام اور حکومت میں کوئی پذیرائی حاصل نہ تھی۔ پنجاب کے مسلم عوام میں اس پر عمومی اتفاق رائے پایا جاتا تھا کہ ایک متحدہ پنجاب اور ایسی حکومت جو مسلمانوں، سکھوں اور ہندوؤں کی نمائندہ ہو، صوبے کے تمام سیاسی مسائل کا درست حل ہو گا۔

آیئے پنجاب کی سیاسی تاریخ کا آغاز ۱۹۳۵ء سے کریں۔ ان ایام میں سر فضل حسین پنجاب کی سیاست کی طاقتور شخصیت تھے۔ وائسرائے کی انتظامی کونسل سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ دوبارہ پنجاب کی سیاست میں لوٹ آئے اور اپنی یونینسٹ پارٹی کو منظم کرنا شروع کر دیا جس میں مسلمان، ہندو اور سکھ شامل تھے۔ یہ ایک بہت عمدہ انتظام تھا کیونکہ پنجاب مسلم اکثریت کا صوبہ تھا۔ یونینسٹ پارٹی کے قیام سے انکا مقصد پنجاب میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی فضاء قائم کرنا تھا۔ وہ مسلم لیگ کو زیادہ پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے اور جب ۱۹۳۵ء میں جناح نے ان سے مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کی درخواست کی تو انہوں نے معذوری ظاہر کر دی۔ وہ پنجاب کی سیاست میں جناح کی مداخلت کو بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ پنجاب کی سیاست صرف پنجابیوں کے لئے ہے۔ سکندر حیات خان کی شکل میں فضل حسین کو ایک نہایت قابل مددگار بھی حاصل تھا۔ ان کے نام ایک خط میں فضل حسین نے کہا---- میں نے احمد یار (دولتانہ کے والد) سے کہہ دیا ہے کہ وہ انہیں (جناح کو) اچھی طرح سمجھا دیں کہ وہ خود کو پنجاب سے

پرے ہی رکھیں۔

(پاکستان از خالد بن سعید، صفحہ ۱۳۲)

۱۹۳۷ء کے پنجاب کے انتخابات میں نشستوں کی اکثریت یونینسٹ پارٹی نے جیت لی! اس وقت تک سر فضل حسین انتقال کر چکے تھے اور سر سکندر حیات خان پارٹی کے نئے رہنما کی حیثیت سے صوبے کے وزیر اعلیٰ بنے۔ انہوں نے وزارتوں میں ہندوؤں اور سکھوں کو ان کا جائز حصہ دیا۔ وہ ۱۹۴۲ء میں اپنی اچانک موت تک صوبے کے سربراہ رہے۔ جب تک سر سکندر حیات زندہ رہے انہوں نے پنجاب میں فرقہ واریت کے عفریت کو سر نہیں اٹھانے دیا اور جناح اور مسلم لیگ کو اپنی فرقہ وارانہ اور علیحدگی پسندانہ سرگرمیوں کو بڑھانے کا موقع نہیں مل سکا۔ وہ جناح کے دو قومی نظریے کو پسند نہیں کرتے تھے اور انہوں نے ایک علیحدہ خود مختار مسلم ریاست کی تشکیل کی کبھی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ وہ ہندوستان کے لئے ایک وفاقی دستور کے حامی تھے جس میں صوبوں کو خود مختاری حاصل ہو تاکہ ہر صوبہ مرکز کی مداخلت کے بغیر اپنے مخصوص خطوط پر بڑھ پھول سکے۔ ان کے مطابق اس طرح بنگال اور پنجاب کی مسلم اکثریت کو اپنی اپنی صوبائی انتظامیہ میں خاطر خواہ اختیارات حاصل ہوں گے اور مرکز کی جانب سے ہندوؤں کی بالادستی کا خوف بھی کم ہو جائے گا۔ اس ضمن میں اپنے خیالات کا اظہار انہوں نے ۱۱ مارچ ۱۹۴۱ء کو پنجاب کی مجلس قانون ساز میں تقریر کرتے ہوئے کیا۔

"میرے معزز دوستوں نے مجھ سے کہا ہے کہ میں ہندوستان کے مستقبل سے متعلق اپنا موقف بیان کروں میں یہ بخوشی کروں گا لیکن اپنی انفرادی حیثیت میں ----- جیسا کہ میں بارہا کہہ چکا ہوں یہ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ ہندوستان کی تقدیر برطانوی دولت مشترکہ کی اندر آزادی قبول کرنے میں مضمر ہے -----

"وہ اصول جن پر نیا آئین مبنی ہونا چاہیئے ان کے متعلق بھی میرے خیالات سب کو اچھی طرح معلوم ہیں۔ میرے منصوبے کے تحت ہر صوبہ اپنے داخلی معاملات میں آزاد

ہو گا ----- مسلمانوں کو خوف ہے کہ اگر صوبے آزاد اور خود مختار نہیں ہوئے تو انہیں ہمیشہ مرکز کی جانب سے بے جا اور غیر ضروری مداخلت کا خطرہ رہے گا جس پر ہندوؤں کی بالادستی ہو گی ----- یہ شکوک اور غلط فہمیاں بے بنیاد بھی ہو سکتی ہیں ----- لیکن حقیقت یہ ہے کہ شبہ اور بد اعتمادی موجود ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ انہیں میرے مجوزہ ذرائع کے علاوہ کسی طریقے سے دور کیا جا سکتا ہے۔

"ایک مرتبہ بالادستی اور مداخلت کا خیال دور ہو جائے تو مسئلہ بہت آسان ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد مسلمانوں کے پاس باقی ہندوستان سے مکمل علیحدگی کا کوئی جواز نہیں رہے گا ----- اگر وہ پھر بھی اس پر اصرار کریں تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ پاگل خانے بھیج دیئے جانے کے لائق ہیں -----

فرقہ وارانہ مسئلے پر ان کی سیاسی سوجھ بوجھ اور پنجاب کے تمام مذہبی گروہوں سے ان کے انصاف نے صوبے کو فرقہ وارانہ مسائل سے یکسر پاک صاف رکھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اگرچہ پنجاب میں مسلمان اکثریت میں ہیں لیکن اس پر سکھوں اور ہندوؤں کا بھی برابر حق ہے۔ محولہ بالا تقریر ہی میں انہوں نے کہا۔

"آیئے باقی ہندوستان کو دکھا دیں کہ ہم پنجاب میں متحد ہیں اور کسی بھی حصے سے ہونے والی مداخلت کی کوشش کو برداشت نہیں کریں گے۔ پھر ہم باہر سے مداخلت میں مصروف حضرات کو بتا دیں گے کہ "اپنے ہاتھ پنجاب سے دور رکھیں"

یہ ان کی جانب سے جناح کا استرداد تھا جو پنجاب کی مسلم سیاست میں داخل ہونے اور اس پر اثر انداز ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ سر سکندر حیات پنجاب کو فرقہ واریت کی لعنتوں سے بچانے کے کس شدت سے خواہشمند تھے اس کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل الفاظ سے ہوتا ہے جو مذکورہ تقریر ہی سے لئے گئے ہیں۔

"جہاں تک پنجاب میں ہم لوگوں کا تعلق ہے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم ایسی کسی تجویز کو قبول نہیں کریں گے جو سب کے لئے آزادی کی ضمانت نہ دے۔ ہم یہ نہیں

چاہتے کہ یہاں (پنجاب میں) مسلمانوں کو بالادست ہونا چاہئے اسی طرح ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ مسلم اقلیت کے علاقوں میں ہندو بالادست ہوں۔ ہم کسی فرد یا فرقے کو بھی اجازت نہیں دیں گے کہ وہ ہمیں اس لئے ایسا کرنے پر مجبور کرے کہ اس صوبے میں مسلمان اکثریت میں ہیں -----

"اگر پاکستان کا مطلب پنجاب میں بلاشرکت مسلم راج ہے تو مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ میں یہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب ایوان میں اس کا اعادہ کرتا ہوں۔ اگر آپ پنجاب کے لئے حقیقی آزادی چاہتے ہیں' یعنی کہ ایسا پنجاب جس میں ہر فرقے کا اقتصادی اور انتظامی شعبوں میں اپنا جائز حصہ طے ہو اور وہ مشترکہ معاملات میں برابر کا ساتھی ہو ' تو یہ پنجاب پاکستان نہیں ہو گا' بلکہ صرف پنجاب ہو گا' پانچ دریاؤں کی سرزمین۔ پنجاب پنجاب ہے اور ہمیشہ پنجاب رہے گا خواہ کوئی کچھ بھی کہے مختصراً یہ وہ سیاسی مستقبل ہے جو میں اپنے صوبے اور نئے دستور کے تحت اپنے ملک کے لئے دیکھتا ہوں"

مذکورہ بالا پیرا گراف میں سر سکندر حیات کے عظیم الفاظ ہندوستان کی تاریخ کے اوراق میں سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ کسی اور سیاستدان کی زبان سے اس سے زیادہ دانشمندانہ الفاظ ادا نہیں ہوئے۔ اپنے اقوال و افعال سے انہوں نے مسلمانوں' ہندوؤں اور سکھوں کو درست راستہ دکھایا۔ اگر ان کی وضع کردہ حکمت عملی پر چلا جاتا تو ہندوستان کی وحدت میں کبھی خلل نہ پڑتا۔

لیکن ۱۹۴۲ء میں سر سکندر حیات کی موت کے بعد پنجاب کی پر سکون فضا یکسر بدل گئی۔ اب میدان جناح کے لئے کھلا تھا کہ وہ پنجاب کی سیاست میں فرقہ واریت کا زہر گھول سکیں۔ جناح کے مطابق پنجاب اس پاکستان کا سنگ بنیاد (کلیدی پتھر) تھا جس کی عمارت تعمیر کرنے کا وہ خواب دیکھ رہے تھے۔ جب تک پنجاب "تصور پاکستان" سے ملحق نہ ہوتا' جناح کا پاکستان معرض وجود میں نہیں آسکتا تھا۔

جنگیں عملاً وقوع پذیر ہونے سے پہلے انسانوں کے ذہنوں میں شروع ہوتی ہیں۔ جنگ سے پہلے عسکری ذہنیت تیار کرنا ضروری ہے۔ ۴۷-۱۹۴۵ء کے دوران جناح نے خود کو پنجاب میں جنگی حالات پیدا کرنے کے لئے وقف رکھا۔ اب انہوں نے اپنی تمام مساعی یونیسنٹ پارٹی کو تباہ کرنے پر مرکوز کردیں تاکہ پنجابی مسلمانوں کو مسلم لیگ کے بینر تلے اکٹھا کیا جاسکے اور "تصور پاکستان" ان کے اندر سمویا جاسکے۔ یہاں یہ بات خصوصاً قابل توجہ ہے کہ "پاکستان" کا نام جناح کو خود ہندو، سکھ اور انگریز پریس نے عجیب و غریب انداز میں تحفتاً دیا تھا۔ "پاکستان" کا لفظ کس طرح استعمال کیا جائے گا' اس کے متعلق جناح نے کہا۔

"آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ پاکستان وہ لفظ ہے جو حقیقتاً ہم پر ہندو پریس بلکہ انگریز پریس کی جانب سے ٹھونسا اور مسلط کیا گیا ہے۔ ایک عرصے سے ہماری قرارداد' قرارداد لاہور کے نام سے جانی جاتی تھی۔ لیکن اب ہم کب تک اس لمبی چوڑی اصطلاح کو استعمال کرتے؟ اب مجھے اپنے ہندو اور انگریز دوستوں سے کہنا ہے کہ ہمیں ایک لفظ عطا کرنے پر ہم آپ کے شکر گزار ہیں"

(پاکستان از خالد بن سعید' صفحہ ۱۳۶)

سر سکندر حیات نے کہا۔

"پاکستان کا لفظ لیگ کے جلسے میں استعمال نہیں کیا گیا تھا اور اس وقت تک کسی نے اس کا اطلاق لیگ کی قرارداد پر بھی نہیں کیا تھا جب تک کہ ہندو پریس کو اس کا خیال نہیں آیا اور انہوں نے اسے پاکستان کا جامہ نہیں پہنا دیا۔ انہوں نے آندھی بوئی ہے اس لئے انہیں لازماً بگولا کاٹنا پڑے گا"

(پنجاب اسمبلی میں تقریر' ۱۱ مارچ ۱۹۴۱ء)

سر سکندر حیات نے لفظ "پاکستان" میں چھپی ہوئی خرابیوں کا اندازہ کرلیا اپنی اس تقریر میں ہندو اور سکھ پریس کو انتباہ کیا

"ناخواندہ عوام نے اب وہ نعرہ اپنا لیا ہے جو ہندو اور سکھ پریس کی کوتاہ بین انتہا پسندی نے فراہم کیا ہے۔ اگر مجھے صرف احتجاج بلند کرنے اور نصیحت کرنے کی اجازت دی جائے تو میں اس خیال کی پرورش کو ہندوؤں اور سکھوں کی فاش غلطی تصور کرتا ہوں۔ وہ غالباً ہندو اور سکھ عوام میں اس قرارداد کے خلاف فضاء پیدا کرنا چاہتے ہیں" ان کا یہ مقصد درست ہے لیکن ----- انہوں نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے کہ لفظ "پاکستان" مسلم عوام کے لئے کشش ----- بلکہ ایک شدید کشش کا حامل بن سکتا ہے۔ یہ ایک سحر انگیز لفظ ہے جس نے عوامی تخیل کو جکڑ لیا ہے اور اس طرح الجھن کو بری طرح گھمبیر کر دیا ہے ----- اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ سیاسی مہم جوؤں کو ناخواندہ عوام کا استحصال کرنے کے وسیع مواقع فراہم ہوئے ہیں جن سے ہر کوئی اپنے اپنے رجحانات اور سہولیات کے مطابق فائدہ اٹھا رہا ہے۔"

چلتے چلتے یہاں اس بات کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے کہ تصور پاکستان سب سے پہلی مرتبہ ایک نوجوان مسلم طالب علم چودھری رحمت علی کے ذہن میں ۱۹۳۳ء میں لندن میں پیدا ہوا۔ اس وقت وہ صرف شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق سوچ رہا تھا۔ پنجاب، افغانستان، کشمیر اور سندھ وغیرہ کے ابتدائی حروف نے پاکستان کا نام تشکیل دیا۔ جس وقت یہ خیال پیدا ہوا اور یہ نام پہلی مرتبہ تخلیق کیا گیا خود مسلمانوں نے اس شخص کی بات کو سنجیدہ نہیں سمجھا۔ یہ تقدیر کا ایک مذاق ہے کہ اس نام کا احیاء ہندو اور سکھ پریس نے فرقہ وارانہ تصادم کے انتہائی نازک مرحلے پر خود کر دیا۔

حقائق سر سکندر حیات خان کے خدشات کے عین مطابق ثابت ہوئے۔ لفظ "پاکستان" نے علیحدگی کے عمل کو نئی تیز رفتاری بخشی۔ اس لفظ اور اس کے پیچھے چھپے تصور نے مسلم عوام اور خواص کو ایک قابل فخر مواد فراہم کیا ----- اپنی خود مختار سرزمین کی تشکیل اور حصول، اس نئے خیال نے مسلم لیگ کو مسلم عوام کے جذبات میں بے حد

بلند بام کر دیا۔ لیگ محض ایک سیاسی پارٹی کی بجائے مذہبی و سیاسی تحریک میں بدل گئی جس میں مسلمانوں کی دبی ہوئی امیدوں اور امنگوں کو تقدیس ملی۔ یہ سمجھا جانے لگا کہ جو مسلمان مسلم لیگ کی مخالفت کرے وہ اسلام کا دشمن ہے۔ مسلمان ہندوستان میں حکمران رہے تھے اور اب انہوں نے دوبارہ ایک ایسی سرزمین کا خواب دیکھنا شروع کر دیا جہاں انہیں حاکمیت اعلیٰ حاصل ہو۔ جناح آہستہ آہستہ مسلمانوں کی حیات نو کی علامت بن گئے۔

تعلیم یافتہ مسلمان سیاسی طاقت اور ملکی حکومت میں حصے کے خواہشمند تھے۔ ان کے لئے زیادہ پراپیگنڈہ ضروری نہیں تھا۔ وہ شروع ہی سے پاکستانی ہو چکے تھے۔ لیکن جناح کے غیر دیانتدارانہ پروپیگنڈے کی بدولت مسلم عوام پاکستان کے بہت زیادہ شیدائی بن گئے کیونکہ ان کے مذہبی احساسات و جذبات کو اپیل کی گئی تھی۔ انہیں یہ یقین دلا دیا گیا تھا کہ مسلم ریاست کی تشکیل کے بعد وہ بہتر مسلمان بن سکیں گے کیونکہ وہ بت پرست ہندوؤں کے رسوم و رواج کے اثرات سے آزاد ہو جائیں گے۔ انہیں یہ یقین دہانی بھی کروائی گئی کہ پاکستان میں قران و شریعت کے قوانین پر مبنی نظام حکومت قائم کیا جائے گا۔ اس مقصد کے لئے پیروں، علماء اور مولاناؤں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ جناح نے جنہیں پہلے ہی قائداعظم کے بلند مقام پر فائز کر دیا گیا تھا اپنا مغربی لباس ترک کر دیا اور عوامی جلسوں میں شیروانی پہننے لگے اور اپنے مقلدوں کو بھی ایسا ہی کرنے کی ہدایت کی۔ وہ جانتے تھے کہ دیہات کی بھاری اکثریتی آبادی کی وفاداری کا حتمی محور اسلام ہے۔ چنانچہ مسلم عوام کے سامنے ان کی تقریروں میں اسلام اپنی علامتوں اور نعروں کی ساتھ بہت نمایاں ہو کر سامنے آنے لگا۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے مسلم طلباء بھی اس کاروائی میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ جناح نے آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کی۔ اس فیڈریشن سے تعلق رکھنے والے طلباء پنجاب میں بے حد سرگرم عمل تھے۔ وہ مسلم عوام میں پراپیگنڈہ کرنے کے لئے پنجاب کے دیہات کے دور دراز کونوں تک پھیل گئے۔ اب مسلمان پنجاب میں پاکستان کی جنگ لڑنے

کے لئے تیار تھے۔

آہستہ آہستہ سر سکندر حیات کے دور حکومت کے خوشگوار دن فراموش ہونے لگے۔ اور اب پنجاب کی مسلم لیگ نے پنجاب کے لئے بلاشرکت غیرے مسلم حکمرانی کا مطالبہ شروع کر دیا اور مسلمانوں کے درمیان سے رہنماؤں کی ایک نئی جماعت ابھری جس نے فرقہ وارانہ نفرت کو اپنی بنیاد بنایا۔ اس ناخوشگوار رجحان کو مزید مہمیز اس وقت حاصل ہوئی جب جون ۱۹۴۵ء میں لارڈ ویول نے شملہ کانفرنس میں جناح کی ہٹ دھرمی کے سامنے سر جھکا دیا۔ اس کانفرنس میں لارڈ ویول کے رویے نے مسلمانوں پر کھل کر واضح کر دیا کہ یہ جناح اور صرف جناح ہیں جنہیں ہندوستان میں مسلمانوں کا رہنما تسلیم کیا جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پنجاب میں یونینسٹ خضر حیات کی پوزیشن بے حد کمزور ہو گئی اور مسلم لیگ ناقابل تسخیر بن گئی۔ ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں مسلم لیگ نے مسلم نشستوں کی اکثریت جیت لی لیکن اسے مجلس قانون ساز میں قطعی اکثریت حاصل نہیں ہوئی۔ چنانچہ لیگ کی حکومت قائم نہ ہو سکی۔ یہ یونینسٹ پارٹی کے خضر حیات خان تھے جنہوں نے مسلمانوں، سکھوں اور ہندوؤں کی مخلوط وزارت تشکیل دی۔ حکومت کے قیام میں ناکام ہونے پر مسلم لیگ نے بے حد تلخ رویہ اختیار کر لیا اور اپنی تمام تر توانائیاں خضر حیات خان کی مخلوط حکومت کو گرانے میں صرف کر دیں۔ اپنے عسکری حربوں میں لیگ نے گاندھی جی کے عدم تعاون اور سول نافرمانی کے طریقے استعمال کیے۔ ابتدا" احتجاج مروجہ خطوط پر آگے بڑھا جس میں امتناعی احکامات کی خلاف ورزی، جلسے، جلوس اور ہجوم شامل تھے جن میں خواتین اور طلباء بھی شرکت کرتے تھے۔ وہ تمام سرکاری دفاتر اور اداروں کے سامنے مظاہرے کرتے تھے اور ان پر مسلم لیگ کا جھنڈا لہراتے تھے۔ لیکن جونہی لیگ نے راست اقدام کی قرارداد منظور کی، احتجاج نے سنگین صورت اختیار کر لی۔ مسلم لیگ نیشنل گارڈز کا قیام عمل میں لایا گیا اور انہیں فوجی ڈپوؤں سے آہنی ٹوپ خرید کر فراہم کئے گئے اور فوجی تربیت دی جانے لگی۔ مسلم خواتین کو ابتدائی طبی امداد

سکھائی گئی۔ لاہور کی سڑکوں پر مسلم نیشنل گارڈز فوجی انداز میں پریڈ کرتے ہوئے بکثرت نظر آنے لگے۔ ان اقدامات سے خضر حیات حکومت چوکنا ہو گئی اور مسلم نیشنل گارڈز کو غیر قانونی تنظیم قرار دے دیا گیا۔ اگلے روز مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری لیاقت علی خان نے اعلان کیا کہ مسلم نیشنل گارڈز مسلم لیگ کا جزو لاینفک ہے اور اس پر حملہ لیگ پر حملے کے مترادف ہے۔ اس کے بعد لیگ نے اپنی غیر قانونی کارروائیوں کو اتنا بڑھا دیا کہ حکومت کو فوج کی امداد طلب کرنی پڑی اور لیگ کے چوٹی کے رہنماؤں سمیت کچھ افراد کو گرفتار کرنا پڑا۔ لیکن یہ اقدام بھی خضر حیات خان کی پوزیشن کے لئے بہت تکلیف دہ تھا لہٰذا انہوں نے لیگ کے رہنماؤں کی رہائی کا حکم دے دیا۔ حکومت کے حامی سکھوں اور ہندوؤں نے اس اقدام کو پسند نہیں کیا جس سے خضر حیات کی پوزیشن مزید کمزور ہو گئی اور انہوں نے ۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد پنجاب کے گورنر سر ایوان جینکنز نے مسلم لیگ پارٹی کے قائد خان آف ممدوٹ کو حکومت سازی کی دعوت دی۔ لیکن وہ حکومت بنانے کے لئے ضروری اکثریت اکٹھی نہ کر سکے جس پر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی دفعہ ۹۳ کے تحت گورنر نے خود حکومت کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ یہاں یہ امر افسوس کے ساتھ تسلیم کرنا چاہئے کہ پنجاب کے سکھ اور ہندو رہنماؤں نے اس مرحلے پر خاطر خواہ صلاحیتوں کا اظہار نہیں کیا۔ خضر حیات خان کی غیر متزلزل حمایت اور مسئلے سے جرأتمندی سے عہدہ برآ ہونے کی بجائے انہوں نے محسوس کرنا شروع کر دیا کہ ان کا تحفظ ایک علیٰحدہ وطن میں پنہاں ہے۔ بزدلی اور شکست خوردگی نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ انہوں نے اس کا اعتراف کر لیا کہ وہ کل (پنجابی) آبادی کا ۴۵ فی صد ہونے کے باوجود سیاسی طاقت کی جدوجہد میں اپنا حصہ حاصل نہیں کر سکتے لہٰذا انہیں اپنے لئے مخصوص محفوظ خطے میں کنارہ کشی پر قانع ہونا ہو گا۔ گورنر کے حکومت سنبھالنے کے باوجود معاملات میں سدھار پیدا نہیں ہوا۔ ہر جگہ وسیع پیمانے پر قتل و غارت اور آتشزنی عام تھی امن و امان کی صورتحال بگڑنے کی وجہ یہ تھی کہ برطانوی افسر

اب دلجمعی سے اپنی نوکری نہیں کر رہے تھے اور عوام کے مصائب سے لاتعلق تھے۔ ۱۹ مارچ ۱۹۴۷ء کی دوپہر کو پنجاب گورنمنٹ کے چیف سیکرٹری میکڈونلڈ نے بیان جاری کیا کہ مسلم لیگ کی مہم کے دوران ۲۰۴۹ ہندو اور سکھ ہلاک اور ۱۱۰۳۰ شدید زخمی ہوئے ہیں۔

(پیارے لال' جلد دوم' صفحہ ۱۱)

سر سکندر حیات خاں کے پنجاب کو قائداعظم محمد علی جناح نے اس حال تک پہنچا دیا۔

پنڈت نہرو نے بعض فساد زدہ علاقوں کا دورہ کیا ان کے ریمارکس مندرجہ ذیل تھے۔

"میں نے ایسے ہولناک مناظر دیکھے اور انسانی رویے کی ایسی مثالیں سنیں جو درندوں کو بھی شرما دیں ----- اگر سیاست اس انداز میں کی جائے تو وہ سیاست نہیں رہتی بلکہ ایک طرح جنگل کا تصادم بن جاتی ہے -----"

پنجاب میں فرقہ وارانہ فسادات سے دلبرداشتہ ہو کر ۸ مارچ ۱۹۴۷ء کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے مندرجہ ذیل قرارداد منظور کی۔

"گزشتہ ۷ ماہ کے دوران ہندوستان میں متعدد حادثے اور سانحے ہوئے ہیں جو وحشیانہ تشدد' قتل و غارت اور جبر کے ذریعے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کے تحت کروائے گئے -----

"ان المناک واقعات سے ظاہر ہو گیا ہے کہ پنجاب کا مسئلہ تشدد اور طاقت کے ذریعے طے نہیں ہو سکتا اور زیادتی پر مبنی کوئی بھی حل دیرپا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ کوئی ایسا راستہ تلاش کیا جائے جس میں جبر کا عنصر کم سے کم ہو اس سے پنجاب کی دو صوبوں میں تقسیم لازم قرار پاتی ہے تاکہ مسلم اکثریت کا حصہ' غیر مسلم اکثریت کے حصے سے علیحدہ کیا جا سکے"

یہ کھوج لگانا بے حد دلچسپ رہے گا کہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے تصور نے کانگریس کے کیمپ میں کس طرح جڑیں استوار کیں۔ لیاقت علی کی بجٹ تجاویز نے کانگریس کے مالی سرپرستوں کو خوفزدہ کر دیا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی میں ان کے مرکزی

ترجمان سردار ولبھ بھائی پٹیل تھے' وہ پارٹی کے ڈھانچے کے آرگنائزر اور کنٹرولر بھی تھے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ایک مضبوط ہندوستان کے قیام کے لئے اس کی حکومت مکمل طور پر یک جماعتی اور کانگریس کے ارکان پر مشتمل ہونی چاہئے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ مسلم لیگ کے ساتھ مخلوط حکومت میں کام کرنا ناممکن ہے بلکہ ہندوستان کی سیاست میں مسلم لیگ کو مرکزی اپوزیشن بننے کا موقع دینا بھی مناسب نہیں کیونکہ یہ فرقہ وارانہ منافرت کو ہوا دینے کے علاوہ کانگریس کے تمام منصوبوں اور قانون سازی کو بھی تہس نہس کر دے گی۔ وہ اب ہر حال میں ہمیشہ کے لئے مسلم لیگ سے چھٹکارہ پانے کا تہیہ کر چکے تھے۔ ۸ مارچ کی ورکنگ کمیٹی کی قرارداد جس میں پنجاب اور بنگال کی تقسیم کی تجویز پیش کی گئی' سردار پٹیل کے انہی خیالات کا نتیجہ تھی۔ وہ مذکورہ قرارداد کے خالق حقیقی تھے۔ اس اہم ترین قرارداد کی منظوری کے لئے گاندھی جی سے قطعاً مشورہ نہیں لیا گیا جس میں ملک کا جغرافیہ تبدیل کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس وقت گاندھی جی بہار میں تھے اور انہوں نے پنڈت نہرو اور سردار پٹیل دونوں کو خط لکھا کہ اس قرارداد کی وضاحت کریں۔ سردار پٹیل نے جواب دیا۔

> "پنجاب کے متعلق قرارداد کی آپ کو وضاحت کرنا بہت مشکل ہے۔ اسے گہرے غور و خوض کے بعد منظور کیا گیا ہے کچھ بھی عجلت میں یا سوچ بچار کے بغیر نہیں کیا گیا۔ یہ کہ آپ نے اس کی مخالفت کی ہے' ہمیں اس کا علم صرف اخباروں سے ہوا----

پنڈت نہرو کا جواب کچھ اس طرح تھا۔

> "پنجاب کو تقسیم کرنے کی ہماری تجویز ہمارے پرانے فیصلوں ہی سے پھوٹی ہے۔ ماضی میں یہ (تجاویز) نفی میں تھیں لیکن اب فیصلے کی گھڑی آن پہنچی ہے ---- مجھے اور ورکنگ کمیٹی کے بیشتر ارکان کو یقین ہے کہ ہمیں فوری تقسیم پر اصرار کرنا چاہئے تاکہ حقیقت عملی جامہ پہن سکے درحقیقت یہ جناح

کے مطالبہ تقسیم کا واحد جواب ہے!"

اس وقت غیر منقسم پنجاب کی کل آبادی ۲ کروڑ ۸۰ لاکھ تھی ----- جس میں ایک کروڑ ۶۰ لاکھ مسلمان' ۷۵ لاکھ ہندو اور ۴۵ لاکھ سکھ شامل تھے۔ اگرچہ سکھ اقلیت میں تھے لیکن وہ آبادی کا نہایت اہم حصہ تھے۔ وہ پورے پنجاب میں پھیلے ہوئے تھے۔ وہ بڑے کاشتکاروں میں شامل تھے جو زمین کے مالک اور کاشتکار تھے۔ پانچ دریاؤں سے نکلنے والی نہروں کا نظام جس سے پورے صوبے میں آبپاشی کا عظیم جال پھیلا ہوا تھا' انہی کا تعمیر کردہ تھا۔ بیشتر نہریں مغربی پنجاب میں تھیں جنہیں سیراب کرنے والے دریاؤں کے منبع مشرقی پنجاب میں تھے۔ سکھوں کی متعدد اہم مقدس عبادت گاہیں مغربی پنجاب میں ہیں۔ ان حالات میں یہ واضح تھا کہ اگر پنجاب کی تقسیم عمل میں آگئی تو سرحدی لکیر خواہ کہیں بھی کھینچی جائے' پورے سکھ فرقے کو اس کے نقصانات سہنے پڑیں گے۔ کسی دانشمند قیادت کے بغیر سکھ تقسیم کے خطرات کا اندازہ نہ کر سکے۔ جب پنجاب کی تقسیم کا حتمی فیصلہ ہو گیا تو برطانیہ کے نامور وکیل سر سائرل ریڈ کلف (بعد ازاں لارڈ ریڈ کلف) کو اس کام کے لئے تعینات کیا گیا انہیں بعض ہندوستانی ججوں کی معاونت حاصل تھی۔

جب سر سائرل ریڈ کلف نے اس کام کا جائزہ لیا تو انہوں نے جان لیا کہ تقسیم سے پنجاب کا عظیم نظام آبپاشی بری طرح متاثر ہو گا جو کہ زیادہ تر سکھوں کے سرمائے سے تعمیر کیا گیا ہے اور جس نے ایک صحرا کو پورے ہندوستان کے کھلیان میں تبدیل کر دیا ہے۔ دریاؤں کے مرکزی مصدر جو پانی فراہم کرتے تھے مشرق میں تھے چنانچہ ان کا بھارت میں شامل ہونا لازم تھا جب کہ بیشتر نہریں اور سیراب ہونے والی زمینیں مغرب میں تھیں جن کو لازماً پاکستان میں شامل ہونا تھا۔ یہ مخصوص صورتحال شدید خطرے کی حامل تھی۔ اس صورتحال کے پیش نظر سر ریڈ کلف نے نہایت خلوص اور حسن نیت سے جناح اور نہرو کو تجویز پیش کی کہ خواہ دو پنجابوں کے درمیان حد فاصل کہیں بھی کھینچی جائے' آبپاشی کا پورا نظام مشترکہ کنٹرول میں رہنا چاہیے۔ اس تجویز پر دونوں رہنما بری طرح مشتعل ہوئے۔

اس اہانت کے بعد سر ریڈ کلف نے خود کو اپنے سونپے گئے کام تک محدود رکھا۔ یہ ایک سانحہ ہے کہ ہندوستان کے رہنماؤں' ہندو اور مسلمان دونوں نے خطرے کے اس نشان کو دیکھنے سے انکار کر دیا جس کی طرف سر سائرل ریڈ کلف نے ان کی توجہ مبذول کروائی تھی۔

(برطانوی راج کے آخری ایام از ایل موزلے' صفحات ۹۹۔ ۱۹۸)

باؤنڈری کمیشن جس کے سر سائرل ریڈ کلف سربراہ تھے اسے مندرجہ ذیل ہدایت دی گئی۔

"باؤنڈری کمیشن کو ہدایت کی گئی کہ پنجاب کے دونوں حصوں کے درمیان سرحد کھینچتے ہوئے مسلم اور غیر مسلم اکثریتی علاقوں کی تخصیص کو اولین ترجیح دی جائے۔ ایسا کرتے ہوئے یہ دوسرے عوامل کا بھی خیال رکھے گا"

لیکن اس ترکیب "دوسرے عوامل" کی تشریح کس طرح کی جائے؟ اس سلسلے میں گورنر پنجاب سر ایوان جنیکنز کا خط نہایت اہم ہے جو انہوں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو لکھا اس میں اس گفتگو کی تفصیل تھی جو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے نامور سکھ رہنما گیانی کرتار سنگھ سے کی۔ اس بات چیت سے سکھوں کی ان امیدوں اور امنگوں پر روشنی پڑتی ہے جو انہوں نے ریڈ کلف ایوارڈ سے وابستہ کر رکھی تھیں۔

"گیانی نے کہا کہ وہ تقسیم کو صرف آبادی پر مبنی نہیں سمجھتے۔ سکھوں کا بھی اپنی سرزمین پر اسی قدر حق ہے جتنا مسلمانوں اور ہندوؤں کا ہے۔ انہیں ننکانہ صاحب کا گوردوارہ اور کم از کم ایک نہری نظام ضرور ملنا چاہئے اور آخر میں سکھوں کی تین چوتھائی آبادی کو مغربی پنجاب سے مشرقی پنجاب منتقل کرنے کے لئے لازماً انتظامات کرنے چاہئیں۔ لین دین اور تبادلے میں آبادی کے ساتھ ساتھ جائیداد کو بھی مد نظر رکھنا چاہئے کیونکہ بحیثیت مجموعی سکھ مسلمانوں سے خوشحال ہیں- گیانی نے کہا کہ جب تک شاہ معظم کی حکومت' وائسرائے اور پارٹی رہنما یہ تسلیم نہیں کرتے کہ سکھوں کے مقدر کا فیصلہ ایک

نہایت اہم معاملہ ہے' تو مسئلہ پیدا ہو گا----- (پھر) وہ لڑنے پر مجبور ہوں گے-----"

(برطانوی راج کے آخری ایام از ایل موزلے' صفحہ ۲۰۶)

جب حتمی طور پر ۱۷ اگست کو ریڈ کلف ایوارڈ کا اعلان عام کیا گیا تو پتہ چلا کہ انہوں نے حد فاصل اس طرح کھینچی ہے کہ نہری نظام کا بڑا حصہ' گندم پیدا کرنے والی زرخیز زمینیں اور ننکانہ صاحب کا عظیم گوردوارہ پاکستان میں چلے گئے ہیں۔ جب کہ نہری نظام کے قیام پر سکھوں کا سرمایہ خرچ ہوا تھا۔

ریڈ کلف ایوارڈ کے شائع ہوتے ہی سکھ مسلمان جنگ کا آغاز ہو گیا۔ اس معاملے پر غور و فکر بے کار ہے کہ پہلا پتھر کس نے پھینکا تھا۔ سکھوں نے دیکھا کہ سرحدی ایوارڈ تو ان کے خدشات سے بھی بدتر ہے۔ ان کی زمینیں' ان کی نہریں' ان کے گھر اور ان کا امیر کبیر اور زرخیز مغربی پنجاب پاکستان میں شامل ہو گیا تھا۔ وہ غصے سے پاگل ہو گئے۔ دوسری جانب مسلمانوں نے جو للچائی ہوئی نظروں سے سکھوں کی ہری بھری کھیتیوں کو دیکھ رہے تھے' نہ صرف انہیں بلکہ ہندوؤں کو بھی نکالنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ انگریز افسر جو اپنے اپنے اضلاع کے انچارج تھے اب اپنے کام میں سرمو دلچسپی نہیں لے رہے تھے اور انہیں امن و امان کی صورتحال سے کوئی سروکار نہ تھا۔ سب سے بڑھ کر وہ نہایت شدت سے کانگریس کے خلاف اور مسلمانوں کے حامی تھے۔ ۵ ستمبر ۱۹۴۷ء کو جب پنجاب میں فسادات اپنے عروج پر تھے' مغربی پنجاب کے گورنر سر فرانس موڈی نے جناح کو لکھا۔

"میں ہر کسی کو بتا رہا ہوں کہ مجھے اس کی کوئی پروا نہیں کہ سکھ سرحد کس طرح عبور کرتے ہیں' سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان سے جس قدر جلد ممکن ہو سکے چھٹکارہ پایا جائے۔ ابھی تک لائل پور میں ۳ لاکھ سکھوں کے موجود ہونے کے آثار ہیں لیکن آخر کار انہیں بھی جانا ہو گا۔"

(خوفناک انتقام از جی ڈی کھوسلہ)۔

مولانا آزاد نے مجوزہ تقسیم کے خطرات کا اندازہ قبل از وقت لگا لیا تھا اور انہوں نے

اس ضمن میں انتباہ بھی کیا جسے نظر انداز کر دیا گیا۔ مولانا لکھتے ہیں۔

"میں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے بھی کہا تھا کہ وہ ملک کی تقسیم کے ممکنہ مضمرات کو نگاہ میں رکھیں۔ حتیٰ کہ ملک کی تقسیم کے بغیر بھی کلکتے' نواکھلی' بہار' بمبئی اور پنجاب میں فسادات ہو رہے تھے۔ ہندو مسلمانوں پر اور مسلمان ہندوؤں پر حملے کر رہے تھے۔ اگر ان حالات میں ملک کو تقسیم کر دیا گیا تو اس کے مختلف حصوں میں خون کے دریا بہہ جائیں گے اور اس قتل عام کے ذمہ دار انگریز ہوں گے"

"لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر کہا کہ کم از کم اس معاملے پر میں آپ کو مکمل یقین دہانی کرواتا ہوں۔ میں خود نگرانی کروں گا کہ کہیں بھی فسادات اور خونریزی نہ ہو۔ میں سویلین نہیں سپاہی ہوں۔ ایک مرتبہ تقسیم کو اصولی طور پر قبول کر لیا جائے تو میں احکامات جاری کروں گا کہ ملک کے کسی حصے میں بھی فرقہ وارانہ گڑبڑ نہیں ہونی چاہیے۔ اگر کوئی معمولی سا بھی مظاہرہ ہوا تو میں اسے ابتداء ہی میں کچل دینے کے لئے سخت ترین ذرائع اختیار کروں گا۔ میں پولیس کے مسلح دستے بھی استعمال نہیں کروں گا بلکہ بری اور فضائی فوج کو ایکشن لینے کا حکم دوں گا اور میں ایسے ہر شخص کو کچلنے کے لئے ٹینک اور ہوائی جہاز استعمال کروں گا جو گڑبڑ پیدا کرنے کی کوشش کرے گا۔

"ساری دنیا جانتی ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اس جراتمندانہ دعوے کا کیا حشر ہوا۔ جب تقسیم عملاً وقوع پذیر ہوئی تو ملک کے وسیع حصوں میں خون کے دریا بہہ گئے۔ بے گناہ مردوں' عورتوں اور بچوں کا قتل عام ہوا۔ افواج ہند کو منقسم کر دیا گیا اور بے قصور ہندوؤں اور مسلمانوں کے قتل کو روکنے کے لئے کوئی بھی موثر اقدام نہیں کیا گیا

(ہندوستان کا حصول آزادی' صفحہ ۱۹۰)

۱۷ اگست کو جب ریڈ کلف ایوارڈ کا اعلان عام ہوا تو گاندھی جی کو کلکتے میں مندرجہ ذیل تار موصول ہوا۔

"سوموار سے لاہور شہر میں ہندوؤں کا بھیانک قتل عام جاری ہے جو راولپنڈی سے بھی بڑھ گیا ہے۔ سینکڑوں لاشیں سڑکوں پر بکھری ہوئی ہیں۔ انار کلی بازار اور دوسرے کاروباری مراکز جلا دیئے گئے ہیں۔ شہر کا بیشتر حصہ شعلوں کی لپیٹ میں ہے ہندوؤں کے رہائشی علاقوں کو پانی کی فراہمی منقطع کر دی گئی ہے۔ گھرے ہوئے ہندو جو فرار ہونے کی کوشش کرتے ہیں انہیں فوج اور پولیس گولی مار دیتی ہے ---- فوراً کچھ کیجئے۔ لاہور میں آپ کی موجودگی ضروری ہے۔

(مہاتما گاندھی ---- آخری دور، جلد دوم، صفحہ ۲۸۳)

گاندھی جی نے یہ ٹیلی گرام سردار پٹیل کو بھیج دیا اور ان سے پوری اطلاعات فراہم کرنے کے لئے کہا۔ انہوں نے کہا کہ اگر یہ اطلاعات درست ہیں تو نہایت بھیانک ہیں۔ لیکن بدترین واقعات ہونے ابھی باقی تھے۔ شیخوپورہ میں ناقابل اندازہ قتل عام ہوا۔ دیگر اضلاع بھی قتل و غارت اور املاک کی تباہی سے نہ بچ سکے۔ مغربی پاکستان میں ہونے والے قتل عام کا رد عمل مشرقی پنجاب میں ظاہر ہوا۔ بچ کر پہنچنے والے مہاجروں کے انبوہ اور ان کی دردناک داستانوں نے وہاں کے لوگوں پر تباہ کن اثرات مرتب کئے۔ فضاء انتقام کے جذبے سے بھر گئی اور مسلمانوں پر بھرپور حملے بولے گئے: "فرقہ وارانہ جنون نے سرحد کے دونوں جانب عوام کو اپنے شکنجے میں لے لیا جس سے جس وسیع پیمانے پر انسانی جانوں کا ضیاع ہوا اور دونوں ریاستوں کے درمیان جس طرح آبادی کی ہجرت ہوئی اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی" دہلی میں فسادات اس وقت پھوٹ پڑے جب مغربی پاکستان سے مہاجر اپنے دردناک مصائب بشمول قتل و غارتگری، آتشزنی اور آبرو ریزی کی داستانوں کے ساتھ دہلی میں وارد ہونا شروع ہوئے۔ جو کچھ مغربی پنجاب میں ہو چکا تھا وہی کچھ دہلی اور گردو نواح کے اضلاع میں دہرایا جانے لگا۔ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو بھی نہیں بخشا گیا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کو ایک نہایت باریک لکیر درندے سے ممیز کرتی ہے۔ لاہور ریلوے سٹیشن پر پہنچنے والی ٹرینیں مسافروں کی لاشوں سے کھچا کھچ بھری

ہوتی تھیں جب کہ بوگیوں کی دیواروں پر اس طرح کے پیغام لکھے ہوتے تھے "ہندوستان کی طرف سے تحفہ" اسی طرح مسلمانوں نے بھی بے دردی سے قتل کیے گئے سکھوں اور ہندوؤں کی لاشیں ٹرینوں میں اس پیغام کے ساتھ بھر کر بھیجیں "پاکستان کی طرف سے تحفہ" وہ سرزمین جس نے گاندھی کی قیادت میں عدمِ تشدد اور اہنسا کا قومی مذہب اختیار کیا تھا وہاں قتل و غارت گری، آتشزنی، لوٹ مار اور آبرو ریزی اس طرح ہوئی جو دنیا نے چنگیز خان کے ایام کے بعد کبھی نہیں دیکھی تھی۔

(ایل موزلے، صفحہ ۲۴۳)

مجموعی طور پر پنجاب کے دونوں حصوں میں ۶ لاکھ افراد ہلاک اور ایک کروڑ ۴۰ لاکھ بے گھر ہوئے۔ ایک لاکھ لڑکیاں اغواء اور عصمت دری کا نشانہ بنیں۔ پنجاب کی تقسیم کی یہ قیمت ادا کی گئی۔

شاملہ (ج)

نیتا جی سبھاش بوس

"ہندوستان کی جدوجہد آزادی" کے موضوع پر کوئی بھی کتاب نیتا جی سبھاش بوس کے تذکرے کے بغیر نامکمل رہے گی۔ جیسا کہ یہ کتاب جناح اور گاندھی کی سرگرمیوں پر مرتکز رہی، اس میں نیتا جی کی سرگرمیوں کا ذکر نسبتاً کم کیا گیا ہے نیتا جی کی زندگی واقعات سے اس قدر بھرپور تھی کہ ان کے لئے ایک الگ کتاب درکار ہے۔ نیتا جی پیدائشی باغی تھے۔ انہوں نے نہ صرف برطانوی امپیریلزم کے خلاف بلکہ گاندھی جی کی آمریت اور ان کے مبہم نظریات کے خلاف بھی بغاوت کی انہیں اپنے باغیانہ رویے کی پوری قیمت ادا کرنی پڑی۔ برطانوی استعمار نے انہیں پابند سلاسل کر دیا اور گاندھی جی کی آمریت نے انہیں کانگریس سے نکال باہر کیا۔

سبھاش ۱۹۲۰ء میں انگلستان سے مقابلے کا امتحان پاس کرنے کے بعد انڈین سول سروس میں داخل ہو گئے۔ لیکن اپنی اندرونی آواز کی پکار پر مئی ۱۹۲۱ء میں انہوں نے سول سروس سے استعفیٰ دے دیا اور فوراً ہندوستان پہنچ کر گاندھی جی کی خدمت میں حاضر ہو گئے جس روز وہ بمبئی پہنچے اسی روز گاندھی جی سے ملنے گئے۔ تاہم وہ ان سے مل کر بے حد "دل گرفتہ اور مایوس" (سبھاش کے اپنے الفاظ میں) ہوئے کیونکہ انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے اور گاندھی جی کے درمیان کوئی نظریاتی اشتراک نہیں ہے۔ چنانچہ وہ دیش بندھو سی آر داس سے ملنے سیدھے کلکتہ پہنچے۔ دیش بندھو سے بات چیت کرنے کے بعد ان کے مضطرب دل کو قرار آگیا ---- "میں نے محسوس کیا کہ مجھے ایک رہنما مل گیا ہے اور میں اس کی پیروی کرنا چاہتا ہوں۔"

۱۹۲۲ء کی گیا کانگرس کے دوران سی آر داس کا ولبھ بھائی پٹیل، راج گوپال اچاریہ، راجندر پرشاد اور متعدد دوسرے ان ارکان سے جھگڑا ہو گیا جو گاندھی جی کے کٹر مقلدین

تھے۔ چنانچہ انہوں نے کانگریس کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا' سبھاش نے بھی اپنے رہنما کی تقلید کی۔ بعد ازاں جب سی آر داس نے گاندھی جی کی خواہشات کے خلاف پارلیمانی پروگرام کو جاری رکھنے کے لئے سوراج پارٹی قائم کی تو سبھاش نے ان کی قابل قدر حمایت کی۔ سبھاش سی آرداس کے لئے وہی حیثیت رکھتے تھے جو ولبھ بھائی کی گاندھی جی کے لئے تھی۔ سی آرداس کی تمام سرگرمیوں کے ہر مرحلے پر سبھاش ان کے قابل بھروسہ معاون رہے۔ جب سی آرداس کلکتے کے میئر بنے تو سبھاش اس کے چیف ایگزیکٹو آفیسر بنے۔ جب وہ اسی عہدے پر خدمات انجام دے رہے تھے تو انہیں اکتوبر ۱۹۲۴ء میں ۱۸۱۸ء کے ریگولیشن (ضابطہ نمبر) III کے تحت گرفتار کر لیا گیا اور برما جیل میں زیر حراست رکھا گیا۔ سی آرداس سے دوبارہ ملنا سبھاش کے مقدر میں نہیں تھا کیونکہ سی آرداس چند ماہ بعد ہی جون ۱۹۲۵ء میں انتقال کر گئے اس وقت سی آرداس کی صحت اچھی نہیں تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سبھاش کا چھن جانا دیش بندھو سی آرداس کے لئے بہت بڑا دھچکہ تھا جس نے ان کی موت کے عمل کو مہمیز کر دیا۔ سی آرداس کی موت پر سبھاش نے مندرجہ ذیل الفاظ میں غم کا اظہار کیا۔

"میں نے اپنے دل کی گہرائیوں سے انہیں جو لگاؤ اور عقیدت مندانہ محبت دی وہ خصوصاً اس لئے نہیں تھی کہ میں سیاسی میدان میں ان کا مقلد تھا بلکہ اس لئے کہ میں ----- ان کی نجی زندگی سے بھی آگاہ تھا ----- ایک مرتبہ ہم ۸ ماہ تک جیل میں اکٹھے رہے اور دو ماہ تک ایک ہی سیل میں رہے۔ ۶ ماہ تک ہم ملحقہ کوٹھڑیوں میں رہے۔ میں نے ان کے چرنوں تلے پناہ لی کیونکہ مجھے انہیں اس طرح جاننے کا موقع ملا -----" سبھاش ۱۹۲۷ء میں برما جیل کی حراست سے رہا ہوئے کم وبیش اسی اثناء میں جواہر لال نہرو اپنے دورہ روس سے' ترقی پسندانہ اشتراکی خیالات سے مملو ہو کر لوٹے دونوں نے اکٹھے ہو کر کانگریس کے اندر بایاں بازو قائم کیا جس کا نام "انڈی پینڈنس لیگ" رکھا گیا۔ سبھاش جواہر قیادت نے ملک کے نوجوانوں کے تخیل کو مسحور کر دیا اور وہ جوق در جوق ان کے

بینر تلے اکٹھے ہونے لگے۔

"انڈی پینڈنس لیگ کا قیام ----- جواہر لال نہرو کے ساتھ ان کا (سبھاش کا) گاندھی جی کو پہلا چیلنج تھا"

(اُچھلتا ہوا شیر' از ہف ٹوئے' صفحہ ۴۴)

انڈی پینڈنس لیگ بہت جلد ایک بار رسوخ اور طاقتور قوت بن گئی اور گاندھی جی کے پیروکار کانگریس کے قدیم رکھوالوں کو خوف لاحق ہو گیا کہ اگر انڈی پینڈنس لیگ کو اس کی پیدائش کے ساتھ تباہ کرنے کی فکر نہ کی گئی تو کانگریس بائیں بازو کی تنظیم میں بدل سکتی ہے۔ اس وقت تک کانگریس سرمایہ داروں کے زیر اثر آچکی تھی اس کے لئے گاندھی جی کا شکر گزار ہونا چاہئے یہ سرمایہ دار کانگریس کو اپنا ترجمان اور آلہ کار بنانے کا تہیہ کر چکے تھے۔ سبھاش نے آل انڈیا یوتھ کانفرنس کلکتہ میں گاندھی جی کے خلاف سرعام تقریر کی جس میں گاندھی جی کے فلسفے کو کڑی نکتہ چینی کا نشانہ بنایا۔

"یہ خیال اور احساس کہ جدت پسندی بری ہے' وسیع پیمانے پر پیداوار خرابی ہے' ضرورتوں میں اضافہ نہیں کرنا چاہئے اور معیار زندگی بلند نہیں ہونا چاہئے ----- یہ کہ روح اتنی اہم ہے کہ مادی کلچر اور عسکری تربیت کو نظر انداز کر دینا چاہئے"۔

(اچھلتا ہوا شیر' صفحہ ۴۴)

انہوں نے مزید کہا۔

"صوفی سنتوں کو ہمیشہ سے ہندوستان میں عزت کا مقام حاصل رہا ہے لیکن اگر ہمیں ہندوستان نو کی تعمیر کرنی ہے جو بیک وقت آزاد' خوش اور عظیم ہو تو ہمیں ان کی قیادت میں نہیں چلنا ہو گا ----- ہمیں زمانۂ حال میں رہنا ہو گا"

(اچھلتا ہوا شیر' صفحات ۴۵-۴۴)

گاندھی جی اس وقت سرگرم سیاست سے کنارہ کشی کی زندگی بسر کر رہے تھے لیکن انہوں نے سوشلزم کے اس نئے رجحان کا سنجیدگی سے نوٹس لیا۔ کانگریس کے قدیم

محافظوں اور سرمایہ داروں نے گاندھی جی سے مدد طلب کی اور انہیں علیحدگی سے باہر نکالا تاکہ کانگریس کے اندر سوشلسٹ گروپ کے قیام کو روکا جا سکے۔ سبھاش جواہر گروپ بائیں بازو کا نمائندہ تھا جب کہ اولڈ گارڈز دائیں بازو کی نمائندگی کرتے تھے۔ دونوں نے اپنی طاقت کا اندازہ ۱۹۲۸ء کے کانگریس کے سالانہ اجلاس میں لگایا۔ گاندھی نے مرکزی قرارداد ذاتی طور پر پیش کی لیکن سبھاش اور جواہرلال دونوں نے اس کی مخالفت کی۔ جب قرارداد پر رائے شماری ہوئی تو پتہ چلا کہ سبھاش، جواہرلال ترمیم کو ۴۵% ووٹ ملے ہیں۔ ووٹنگ سے ظاہر ہو گیا کہ کانگریس کا بایاں بازو کس قدر بارسوخ اور مضبوط ہو چکا تھا۔

گاندھی جی نے اب کانگریس کے اندر بائیں بازو کو کمزور کرنے کے طریقے سوچنے شروع کئے اور اس مقصد کے حصول کا بہترین طریقہ سبھاش جواہرلال جوڑی کو توڑنا تھا۔ گاندھی جی نے موتی لال نہرو کی ان خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جو انہوں نے گاندھی جی کو تحریک عدم تعاون کے ابتدائی ایام میں پیش کی تھیں۔ یہی وہ عامل تھا جس کی بنیاد پر گاندھی جی کا جھکاؤ ہمیشہ نوجوان جواہرلال کی طرف رہا۔ اب گاندھی جی نے تجویز پیش کی کہ کانگریس کے آئندہ اجلاس کا صدر جواہرلال کو منتخب کیا جائے جو لاہور میں ۱۹۲۹ء میں ہونا تھا۔ یاد رہے کہ اس وقت جواہرلال کانگریس میں بلحاظ عہدہ بہت معمولی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ محض آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سیکرٹری تھے۔ چنانچہ ان کی نامزدگی کو ورکنگ کمیٹی کے سرکردہ ارکان نے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا، لیکن چونکہ گاندھی جی اپنے انتخاب پر ڈٹے رہے لہٰذا دوسرے ارکان نے اپنے اعتراض پر مزید اصرار نہیں کیا۔

جواہرلال نہرو نہایت جوش و ولولے سے انڈین نیشنل کانگریس کے صدر بنے وہ اشتراکی اور مارکسی نظریات سے لبریز تھے۔ لیکن ان کے یہ نظریات زیادہ بارآور نہیں رہ سکتے تھے "کیونکہ دوسری جانب ورکنگ کمیٹی میں گاندھی جی اپنے دس پیروکاروں کے ہمراہ

موجود تھے جو فکر و عمل میں ٹھوس چٹان کی طرح تھے" اس طرح صدر ورکنگ کمیٹی کے ارکان کی اکثریت سے ہم آہنگ نہ تھے۔ اس مشکل صورتحال میں پر جواہرلال نے استعفیٰ پیش کیا لیکن انہیں صدر رہنے اور کام کرنے پر قائل کیا گیا۔ گاندھی جی ان کے متعلق کہا کرتے تھے ----- "حب الوطنی میں ان سے آگے کون بڑھ سکتا ہے؟ کچھ لوگوں نے کہا کہ وہ غصیلے اور عجلت پسند ہیں۔ اس گھڑی یہ صفت ایک مزید صلاحیت کی حیثیت رکھتی ہے ----- وہ بلاشبہ انتہا پسند ہیں اور اپنے گردو پیش سے کہیں آگے کی سوچ رکھتے ہیں لیکن اس قدر منکسرالمزاج اور باعمل بھی ہیں کہ رفتار کو تباہی کی حد تک نہ بڑھائیں گے"۔ کانگریس کے سرکاری تاریخ نویس لکھتے ہیں --"جب وہ (سبھاش) گاندھی سے پورے اخلاص اور پامردی سے نبرد آزما تھے' وہ (جواہرلال) ان کے (گاندھی جی کے) اس نتیجے سے متفق ہو گئے"۔

ان حالات میں یہ بات حیرت انگیز نہیں کہ دسمبر ۱۹۳۵ء میں جواہرلال کو ایک مرتبہ پھر کانگریس کا صدر بنا دیا گیا جب اس کا اجلاس لکھنؤ میں ہوا۔ اس کے بعد دسمبر ۱۹۳۶ء میں اجلاس فیض پور میں انہیں تیسری مرتبہ صدر بنایا گیا۔ وہ اپنے عہدے پر ۱۹۳۸ء تک قائم رہے جب کانگریس کے اجلاس ہری پور میں سبھاش بوس کو نامزد کیا گیا۔ غالباً گاندھی جی کا خیال تھا کہ اس طرح وہ سبھاش کو بھی اسی طرح منانے میں کامیاب ہو جائیں گے جس طرح وہ جواہرلال کے معاملے میں رہے ہیں۔

لیکن جس لمحے سبھاش نے صدر کا عہدہ سنبھالا' انہوں نے واضح کر دیا کہ وہ کانگریس کی پالیسی کی تشکیل میں موثر کردار ادا کریں گے گاندھی جی کے فلسفے سے ان کا اختلاف سب پر ظاہر تھا جس میں دیہی زندگی' بیل گاڑی اور چرخہ کاتنا شامل تھا۔ ان کے خیال میں بیل گاڑی کی سیاست کو اپنانے اور پیداوار کے سائنسی ذرائع کی نفی کرنے سے صرف عوام کی غلامی برقرار رکھنے میں مدد مل سکتی تھی۔ ۲۱ اگست ۱۹۳۸ء کو انڈین سائنس نیوز ایسوسی ایشن کلکتہ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے سبھاش بوس نے کہا کہ قومی تعمیر نو صرف سائنس اور سائنسدانوں کی مدد سے ممکن ہے اور سائنس اور سیاست کے درمیان دور

رس تعاون بے حد ضروری ہے' اگر ہندوستان کو دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں جگہ بنانی ہے۔ انہوں نے مزید کہا۔

"ہندوستان کی تحریک آزادی اب اس نہج پر پہنچ چکی ہے جہاں اب سوراج محض ایک خواب نہیں رہا ----- اقتدار ہماری نظروں کے سامنے ہے ----- ہمیں سائنس سے اولین مدد درکار ہے -----

"اگرچہ میں گھریلو صنعتوں کو صرف نظر نہیں کرتا اور میرا خیال ہے جہاں جہاں ممکن ہو سکے گھریلو صنعتوں کی برقراری اور بحالی کی ہر ممکنہ کوشش کرنی چاہئے' لیکن میں کہتا ہوں کہ ہندوستان کی معاشی منصوبہ بندی کا مفہوم اسے صنعتی ملک بنانے کی وسیع منصوبہ بندی ہونا چاہئے"

(ملاحظہ فرمایئے' کراس روڈز' صفحات ۵۲-۵۱)

یہ گاندھی جی کے فلسفے اور سیاست سے کھلا انحراف تھا۔ سائنس نیوز کانگریس کے سامنے کی گئی مذکورہ بالا تقریر کو سبھاش کی صدارتی تقریر سے ملا کر پڑھنا چاہئے جو انہوں نے فروری ۱۹۳۸ء میں ہری پور کانگریس کے اجلاس میں کی۔

"کانگریس' عوام کے من حیث المجموع سیاسی اور اقتصادی حقوق کی نمائندہ ہے۔ اگر یہ اپنے پروگرام پر عمل درآمد میں کامیاب ہوجائے تو اس سے اقلیتوں کو بھی ہندوستانی آبادی کے کسی بھی دوسرے طبقے کے برابر مفادات حاصل ہوں گے۔

"مزید برآں اقتدار حاصل کرنے کے بعد اگر قوم کی تعمیر نو اشتراکی خطوط پر کی جائے ----- جیسا کہ میرا خیال ہے کہ بلا شبہ ایسے ہی ہو گی ----- تو یہ غرباء ہوں گے جو امراء کی قیمت پر فوائد حاصل کریں گے۔ اور ہندوستانی عوام کو "غرباء" کی فہرست میں شامل کرنا چاہیے (ایضاً صفحہ ۱)

سبھاش بوس کی رائے میں سوشلزم اور دولت کی مساوی تقسیم فرقہ واریت کی روک تھام کے لئے بہترین علاج ہوں گے۔ انہوں نے مزید کہا۔

"زراعت کو سائنسی بنیادوں پر استوار کیا جائے گا تاکہ زمین کی پیداوار کو بڑھایا جا

سکے۔ اقتصادی مسئلہ حل کرنے کے لئے محض زرعی ترقی کافی نہیں ہو گی۔ ریاست کی ملکیت اور ریاست کے کنٹرول میں صنعتی ترقی کا ایک جامع منصوبہ ناگزیر ہو گا۔ آخری اہم بات یہ ہے کہ ریاست کو پیداوار اور متناسب تقسیم کے لئے بتدریج زرعی اور صنعتی دونوں شعبوں کو اشتراکی خطوط پر استوار کرنے کے لئے جامع منصوبہ اپنانا ہو گا" بلاشبہ یہ سبھاش کا جراتمندانہ بلکہ پامردانہ کارنامہ تھا کہ انہوں نے کانگریس کے کھلے اجلاس میں ایسے اشتراکی نظریات کا اعلان کیا جس کے سرکردہ رہنماؤں میں انتہائی دائیں بازو کے ارکان یعنی گاندھی جی' ولبھ بھائی پٹیل' راجندر پرشاد' راج گوپال اچاریہ اور دیگر افراد شامل تھے جو کبھی بھی ان کے گہرے دوست نہیں رہے تھے۔ سبھاش کو سرمایہ داروں سے دلچسپی نہ تھی بلکہ ان کا دل "غرباء" کے ساتھ تھا۔ وہ کانگریس کے راستے کو سرمایہ داری سے سوشلزم کی جانب بدلنے کے لئے مجاہدوں کے سے جوش و جذبے سے سرشار تھے۔ ان حالات میں یہ ناممکن تھا کہ اولڈ گارڈز انہیں برداشت کر پاتے۔ سبھاش کو "سدھانے کا کوئی امکان نہ تھا جیسا کہ جواہر لال کے معاملے میں کیا گیا کیونکہ سبھاش کسی دوسری ہی مٹی کے بنے ہوئے تھے' چنانچہ اس امر پر کوئی تعجب نہ ہونا چاہئے کہ اگلے برس کانگریس اس پر قطعاً رضامند نہ ہوئی کہ سبھاش گدی پر قائم رہیں۔ بے شک قدیم محافظوں کے پاس صدر کو تبدیل کرنے کے فیصلے کے لئے کئی دلائل تھے لیکن اصل وجہ یہی تھی کہ سبھاش نے کانگریس کو گاندھی پرست قدیم محافظوں کے شکنجے سے رہا کروانے کی کوشش کی تھی۔ وہ اسے گاندھی کے ابہام' آمریت اور سرمایہ داری سے نجات دلوا کر اس کا رخ سوشلزم کی طرف موڑنا چاہتے تھے۔ لازماً ان افراد کے لئے کانگریس کی قیادت سبھاش کے حوالے کر دینا ناممکن تھی۔

ایام گزشتہ میں کانگریس ایک جمہوری تنظیم تھی اور جس میں کوئی بالادست نگران قوت نہیں تھی اور کانگریس کا صدر جمہوری انداز میں مختلف صوبائی کانگریس کمیٹیوں کے ووٹوں کی اکثریت سے منتخب کیا جاتا تھا۔ لیکن جب سے کانگریس گاندھی جی کے آمرانہ

کنٹرول میں آئی تھی ' صورتحال بدل گئی تھی اور اب صرف گاندھی جی کی مرضی چلتی تھی۔ جب سبھاش کی صدارتی معیاد ختم ہونے والی تھی گاندھی جی کا قرعہ فال مولانا آزاد پر پڑا۔ لیکن چونکہ اس وقت ملک فرقہ وارانہ الجھنوں میں گھرا ہوا تھا اس لئے مولانا صاحب اس عہدے کو قبول کرنا دانشمندانہ خیال نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ گاندھی جی کی نگاہ انتخاب ڈاکٹر پتہ بھائی سیتا رمیہ پر پڑی جو ایک نہایت بھولے بھالے شریف انسان تھے اور کانگریس کے سرکاری تاریخ نویس کی حیثیت سے زیادہ معروف ہوئے۔ تاہم سبھاش بوس گاندھی جی کے آمرانہ احکامات کو ماننے کے لئے تیار نہ تھے اور وہ انتخاب لڑنے کے لئے اپنے جمہوری حق پر ڈٹ گئے۔ انہوں نے اپنے افعال کے جواز کے طور پر مندرجہ ذیل دلائل پیش کئے۔

اس معاملے کو زیر بحث لاتے ہوئے جھوٹے احترام کو یکسر پرے رکھ دینا چاہئے کیونکہ یہ کوئی ذاتی معاملہ نہیں ----- عوام اس رائے کا اظہار کر رہے ہیں کہ دیگر آزاد ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی صدارتی انتخاب واضح مسائل اور پروگراموں کی اساس پر لڑا جانا چاہئے تاکہ مقابلے سے مسائل کی توضیح میں مدد مل سکے اور اس سے عوامی ذہن میں وقوع پذیر ہونے والے عوامل کی درست نشاندہی ہو سکے۔ ان حالات میں ایک انتخابی مقابلہ قطعی طور پر ناپسندیدہ نہیں ہے۔

"اب تک مجھے کسی ایک مندوب سے بھی یہ مشورہ یا ہدایت موصول نہیں ہوئی کہ مجھے مقابلے سے دستبردار ہو جانا چاہئے اس کے برعکس مجھے متعدد صوبوں نے میرے علم کے بغیر امیدوار نامزد کیا ہے اور ملک کے مختلف حصوں سے مجھے اشتراکیوں اور غیر اشتراکیوں کی دلی درخواستیں موصول ہو رہی ہیں کہ مجھے ریٹائر نہیں ہونا چاہئے۔ ان سب کے علاوہ بھی ایک عمومی تاثر پایا جاتا ہے کہ مجھے ایک مرتبہ اور عہدے پر رہنے کی اجازت ملنی چاہئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میرا یہ تاثر غلط ہو اور مندوبین کی اکثریت میرے انتخاب کی خواہشمند نہ ہو۔ لیکن یہ خیال صرف اس صورتمیں جانچا جا سکتا ہے جب رائے

شماری ۲۹ جنوری کو ہو اور اس سے قبل نہ ہو"

(کراس روڈز' صفحہ ۸۷)

۲۸ جنوری کی شام کو جب کہ صدارتی انتخابات اگلے روز ہونے والے تھے سبھاش نے کانگریس میں دائیں بازو کے گروپ کے خلاف سخت احتجاجی بیان دیا جس کی قیادت سردار پٹیل کر رہے تھے۔ اور انہوں نے حتمی طور پر امیدواری سے اپنی دستبرداری سے انکار کر دیا۔

"جب متعدد صوبوں کی جانب سے میرا نام رسمی طور پر تجویز کیا گیا یہ میرے علم اور رضامندی کے بغیر ہوا۔ صحیح یا غلط' کانگریس کے اندر وسیع رائے عامہ کی خواہش ہے کہ میرا بحیثیت صدر دوبارہ انتخاب ہو اب یوں ظاہر ہوتا ہے کہ ورکنگ کمیٹی کے کچھ ارکان ایسی وجوہ کی بنیاد پر جنہیں سمجھنا مشکل ہے' اس خیال پر متفق نہیں ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر انہوں نے میرے خلاف رائے دینے کے لئے مینڈیٹ نہ بھیجا ہوتا تو میرا انتخاب عملاً متفقہ طور پر ہو جاتا۔ یوں ظاہر ہوتا ہے کہ میرے ناچیز وجود کے علاوہ یہ کسی کو بھی قبول کر لیں گے"

"انہیں مجھ پر یہی اعتراض ہے نا کہ میں ان کے ہاتھوں آلہ کار نہیں بنوں گا یا انہیں مجھ پر میرے افکار اور اصولوں کی وجہ سے اعتراض ہے۔

"کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اندر ایک گروپ کا یہ دعویٰ کرنا حد سے گزری ہوئی بات ہے کہ وہ ہر مرتبہ صدارتی انتخاب پر اپنی مرضی مسلط کریں گے۔ اگر ہمیں مندوبین کی جانب سے ایک صحیح انتخاب منعقد کروانا ہے اور ورکنگ کمیٹی کے ایک گروپ کی جانب سے نامزدگی قبول نہیں کرنی تو اس کے لئے ضروری ہے کہ مندوبین کو آزادانہ اور شفاف حق انتخاب دیا جائے۔

"اگر انہیں اسی آزادی کی ضمانت نہیں دی جاتی تو کانگریس کا منشور

جمہوری نہیں رہے گا۔ کانگریس کے لئے جمہوری دستور کی کوئی ضرورت نہیں اگر مندوبین ہی کو سوچنے اور اپنی مرضی سے ووٹ دینے کی اجازت نہ دی جائے۔"

(کراس روڈز' صفحات ۴-۱۰۳)

اگلے رز یعنی ۲۹ جنوری کو انتخابی نتائج کا اعلان کیا گیا۔ سبھاش بوس نے ڈاکٹر پٹہ بھائی ستیا رمیہ کو ۲۰۰ ووٹوں سے ہرا دیا۔ واردھا یہ خبر سن کر بھونچکا رہ گیا اور اس پر یوں تبصرہ کیا گیا ---- ۲۰ برس کا کام راتوں رات خاک میں مل گیا' دو دن بعد عظیم مہاتما نے اپنا فیصلہ ایک پیغام کے ذریعے نشر کیا جو نرم ترین الفاظ میں نہایت غیر گاندھیانہ تھا۔

"مسٹر سبھاش بوس نے اپنے مخالف ڈاکٹر پٹہ بھائی ستیا رمیا کے خلاف فیصلہ کن فتح حاصل کی ہے۔ مجھے اس بات کا ضرور اعتراف کرنا چاہئے کہ ابتداء ہی سے میں ان کے دوبارہ انتخاب کے قطعاً خلاف تھا جس کی وجوہ بتانے کی میں ضرورت نہیں سمجھتا ---- بہر کیف میں ان کی جیت پر مسرور ہوں لیکن چونکہ ڈاکٹر پٹہ بھائی کو اپنا نام بطور امیدوار واپس نہ لینے پر قائل کرنے میں ہی پیش پیش تھا اس لئے ان کی شکست ان سے زیادہ میری شکست ہے ---- کانگریس تیزی سے جعلی ارکان پر مشتمل ایک بدعنوان تنظیم بنتی جا رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ متعدد مندوبین جو جعلی ووٹوں کے بل بوتے پر منتخب ہوئے ہیں' جانچ پڑتال کرنے پر اپنی نشستوں سے محروم ہو جائیں گے۔ "بہرحال سبھاش بوس ملک کے دشمن نہیں ہیں----

(کراس روڈز' صفحات ۶-۱۰۵)

اس کے بعد انہوں نے ایک عمومی ہدایت جاری کی کہ جو ارکان سبھاش بابو کے پالیسی پروگرام کے ساتھ نہیں چل سکتے انہیں لازماً کانگریس سے نکل جانا چاہئے۔ "میں تمام کانگریسی ارکان کو یاد دہانی کروانا چاہتا ہوں کہ کانگریس ذہن رکھنے والے جو ارادی طور پر اس سے باہر ہیں' اس کی سب سے زیادہ نمائندگی کرتے ہیں"

سبھاش بوس کے صدر منتخب ہونے کے بعد کچھ سنسنی خیز تبدیلیاں رونما ہونے لگیں جو اپنے نقطہ عروج پر اس وقت پہنچیں جب ورکنگ کمیٹی کے ۱۵ میں سے ۱۲ ارکان مستعفی ہو گئے جن کی قیادت سردار پٹیل' مولانا آزاد اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کر رہے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اس پر ایک نہایت ذومعنی اور مبہم بیان جاری کیا جس میں انہوں نے خود رسمی طور پر مستعفی ہونے کا اعلان کیے بغیر مستعفی ہونے والے ارکان کی حمایت کی۔ اس کے بعد پارٹی مشینری کو پوری قوت سے متحرک کر دیا گیا۔

اور خود کانگریس کے اجلاس میں شدید اختلافات اٹھانے کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہو گئیں۔ کانگریس کا اجلاس طے شدہ معمول کے مطابق مارچ ۱۹۳۹ء میں تری پوری میں منعقد ہوا۔ گاندھی جی نے سوچ سمجھ کر خود کو اجلاس سے غیر حاضر رکھا۔ ان کے خیال میں ریاست راج کوٹ کے عوام کی مشکلات' سبھاش بوس کے زیر قیادت کانگریس کی کارروائی سے زیادہ اہم تھیں لہٰذا وہ راج کوٹ چلے گئے۔ تری پوری میں کانگریس کے قدامت پسند اپنی بالادستی کے حصول میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے لغوا" صدر کی مذمت کی اور اپنی ورکنگ کمیٹی کی تشکیل کے سلسلے میں ان پر اہانت آمیز شرائط عائد کی۔ کانگریس میں پنڈت جواہر لال نہرو کے رویے سے متعلق' سبھاش بوس نے ۱۷ اپریل ۱۹۳۹ء کو اپنے بھتیجے کے نام خط میں لکھا۔

"اس بحران میں مجھے ذاتی طور پر اور ہماری کاز کو پنڈت نہرو سے زیادہ کسی اور نے نقصان نہیں پہنچایا۔ اگر وہ ہمارے ساتھ ہوتے ----- تو ہم اکثریت حاصل کر لیتے حتیٰ کہ ان کی غیر جانبداری بھی غالباً ہمیں اکثریت دلا سکتی تھی۔ لیکن تری پوری میں انہوں نے اولڈ گارڈز کا ساتھ دیا۔ میرے خلاف ان کے کھلے پراپیگنڈے نے مجھے ۱۲ سر برآوردہ ارکان کی سرگرمیوں سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے' کتنے افسوس کی بات ہے"

(کراس روڈز' صفحہ ۱۱۳)

جو کچھ سبھاش بوس نے تری پوری میں دیکھا اور جو بے رحمانہ سلوک ان سے وہاں

کیا گیا' اس نے انہیں لرزا کر رکھ دیا اور انہوں نے اپنے کربناک جذبات کا اظہار ماڈرن ریویو (۱۹۳۹ء) کے ایک مضمون میں یوں کیا۔

تری پوری میں اخلاقی طور پر آلودہ (بیمار کرنے والی) فضاء کی وجہ سے میں وہاں سی سیاست سے اس قدر متنفر اور بیزار ہو کر لوٹا کہ ایسی کیفیت میں نے گزشتہ ۱۹ برس میں کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ جمبوڑہ میں کئی دن اور کئی راتیں جب میں اپنے بستر میں کروٹیں بدلتا رہا تو میں نے اپنے آپ سے بار بار پوچھنا شروع کیا کہ ہماری عوامی زندگی کا کیا ہو گا جب کہ ہمارے بلند ترین حلقوں میں اس قدر چھوٹا پن اور منتقم مزاجی موجود ہے۔ میرے خیالات فطری طور پر اس کی جانب پلٹ گئے جو میری زندگی کی پہلی محبت تھی ----- ہمالیہ کی ابدی پکار۔ میں نے اپنے آپ سے پوچھا ---- اگر ہماری سیاست کی تکمیل یا مقصود یہی تھا تو میں اس زندگی سے کنارہ کش کیوں ہوا جسے آربندو گھوش' الوہی حیات' کہا کرتے تھے کیا میرے لئے وہ وقت آگیا ہے کہ میں مایا جال کو نوچ ڈالوں اور پورن پریم (تمام محبت) کے سرچشمے کی طرف لوٹ جاؤں؟ میں نے شب و روز اخلاقی تشکیک اور بے یقینی کے عالم میں کاٹے۔ متعدد مرتبہ ہمالیہ کی پکار بہت پرزور ہو گئی۔ میں نے اپنے تاریک ذہن کے لئے اجالے کی دعا کی۔ آہستہ آہستہ ایک نئی روشنی' سحر بن کر مجھ پر طلوع ہوئی اور میرا ذہنی توازن بحال ہونا شروع ہوا ----- اور ساتھ ہی انسان اور اپنے ہم وطنوں پر میرا اعتماد دوبارہ قائم ہوا۔ بہر طور' تری پوری ہندوستان نہیں تھا۔"

گاندھی جی کے کٹر پیروکاروں کی کھلی دشمنی اور خود گاندھی جی کے رویے کے پیش نظر سبھاش بوس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ کانگریس کی صدارت سے مستعفی ہو جاتے۔ جب رابندر ناتھ ٹیگور نے ان کے استعفے اور ان حالات کے متعلق سنا جن کے باعث وہ اس اقدام پر مجبور ہوئے تو انہوں نے سبھاش کو مندرجہ ذیل پیغام بھیجا۔

"آپ نے اس قدر شدید دباؤ کے درمیان جس وقار اور حوصلہ مندی کا مظاہرہ کیا ہے اس نے آپ کی قیادت پر میری تحسین اور تیقن حاصل کر لیا ہے۔ ابھی اپنی عزت اور

ساکھ کے لئے بنگال کو بھی ایسا ہی مکمل رکھ رکھاؤ قائم کرنا ہے تاکہ ساتھ ہی آپ کی ظاہری شکست کو ایک دائمی فتح میں بدلا جاسکے"

(کراس روڈز، صفحہ ۱۷۳)

چنانچہ بعد ازاں سبھاش بوس نے "اپنا فارورڈ بلاک" قائم کیا جس کے متعلق انہیں امید تھی کہ وہ کانگریس میں بائیں بازو کے عناصر کا اجتماعی مرکز ثابت ہو گا' لیکن ان کی امیدیں بر نہ آئیں۔ کانگریس میں دائیں بازو کے عناصر مختار کل تھے اور منحرفین کو کبھی سر اٹھانے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ سبھاش چندر بوس کو نہ صرف کانگریس سے نکال دیا گیا بلکہ نکالے جانے کے احکامات ان کے حقیقی بڑے بھائی سرت چندر بوس کے خلاف بھی جاری کئے گئے۔ ان پر بھی ڈسپلن کی خلاف ورزی کے اقدامات کا الزام لگایا گیا۔

انگریز سرکار نے بھی سبھاش کو چین اور آرام حاصل نہ ہونے دیا' کانگریس سے نکالے جانے کے بعد جلد ہی انہیں جیل میں ڈال دیا گیا۔ جیل سے انہوں نے ایک قابل ستائش خط لکھا جو ان کے سیاسی عہد نامے کے طور پر محفوظ کیے جانے کا مستحق ہے۔

"کوئی قربانی کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ کوئی بھی کاز صرف صعوبتوں اور قربانیوں کے ذریعے ہی پھل پھول سکتی ہے۔ یہ ابدی قانون ہر زماں اور ہر مکاں پر محیط ہے -----" "شہید کا خون ہی معبد کا بیج بنتا ہے"

"اس فانی دنیا میں ہر چیز ختم ہو جاتی ہے اور ہر چیز ختم ہو جائے گی ----- لیکن افکار' اعمال اور خواب نہیں۔ ایک فرد ایک نظریے کے لئے مر سکتا ہے۔ لیکن اس کی موت کے بعد یہ نظریہ ہزاروں زندگیوں کا روپ دھار لیتا ہے۔ اس طرح ارتقاء کا پہیہ گھومتا ہے اور ایک نسل کے خواب اور آدرش اگلی نسل کو منتقل ہوتے ہیں۔ اس دنیا میں کوئی بھی نظریہ آلام اور قربانیوں کی آزمائش گاہ سے گزرے بغیر اپنی تکمیل نہیں کر سکتا۔

"اپنے ہم وطنوں سے مجھے کہنا ہے ----- یہ فراموش نہ کریں کہ ایک انسان کے لئے سب سے بڑی لعنت غلام رہنا ہے۔ یہ نہ بھولیں کہ بدترین جرم ناانصافی اور برائی سے

سمجھوتہ کرنا ہے۔ اس ابدی قانون کو یاد رکھیں ---- زندگی کو حاصل کرنے کے لئے اسے کچھ دینا ضروری ہے۔ اور یاد رکھیں کہ عظیم ترین اچھائی عدم مساوات کے خلاف لڑنا ہے خواہ اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔"

(کراس روڈز' صفحہ ۳۴۲)

جیل میں ان کی ذہنی حالت کافی نازک تھی۔ گاندھی جی اور کانگریس ہائی کمان کی حرکات سے جنہیں وہ انتقامی کاروائیاں خیال کرتے تھے شدید دل گرفتہ ہو کر انہوں نے اپنا دل کچھ خطوں کے ذریعے اپنے بڑے بھائی سرت چندر بوس کے سامنے کھولا۔ یہ خط جیل سے لکھے گئے۔ مندرجہ ذیل خط ۳۱ اکتوبر ۱۹۴۰ء کو لکھا گیا۔

"جس قدر زیادہ میں کانگریس کی سیاست کے متعلق سوچتا ہوں اسی قدر زیادہ مجھے یقین ہوتا جاتا ہے کہ مستقبل میں ہمیں زیادہ سے زیادہ توانائی اور وقت ہائی کمان کے خلاف لڑنے پر صرف کرنا ہو گا۔ اگر طاقت ایسے کمینے' منتقم اور بددیانت افراد کے ہاتھوں میں چلی جائے تو سوراج کب حاصل ہو گا' ملک کا کیا ہو گا؟ اگر ہم ابھی ان کے خلاف نہ لڑے تو ہم طاقت کو ان کے ہاتھوں میں جانے سے نہیں روک سکیں گے۔ دوسری وجہ کہ ہمیں ابھی ان کے خلاف کیوں لڑنا چاہئے یہ ہے کہ انہیں قومی تعمیر نو کا کوئی شعور نہیں۔ گاندھی ازم آزاد ہندوستان کو کھائی میں دھکیل دے گا ---- اگر آزاد ہندوستان کی تعمیر نو گاندھی کے عدم تشدد کے اصول پر کی گئی تو ہندوستان اس صورت میں حملہ آور غاصب طاقتوں کے لئے کھلا دعوت نامہ بن جائے گا ----

(کراس روڈز' صفحہ ۳۲۸)

یہاں یہ امر قابل تذکرہ ہے کہ قومی منصوبہ بندی کمیشن اور ایک قومی تحقیق کونسل کا منصوبہ سبھاش کے ذہن میں ۳۹-۱۹۳۸ء کے دوران تشکیل پا چکا تھا اور انہوں نے ۱۹۳۸ء کی ہری پور کانگریس کے خطبہ صدارت میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی تھی اور جب انہوں نے اسی سال انڈین سائنس نیوز ایسوسی ایشن کی صدارت کی تو یہ خیالات

بالتفصیل پیش کئے۔ انہیں وجدانی طور پر علم ہو گیا تھا کہ سوراج آ رہا ہے اور قومی تعمیر نو کا مسئلہ بنیادی اہمیت کا حامل بن چکا ہے۔ وہ ہندوستان کی تعمیر نو سائنسی اور عقلی انداز میں کرنا چاہتے تھے کہ گاندھی جی کے طرز فکر کے مطابق امید تھی کہ وہ قومی تعمیر نو کی آئندہ پالیسی کی تشکیل کے قابل ہوں گے۔ چنانچہ وہ دوسری مرتبہ کانگریس کی صدارت کے خواہشمند تھے۔ ایک سال ان کے خیالات کی تعمیر و تصویر کے لئے بہت کم تھا۔ گاندھی کے پیروکاروں نے سبھاش کی شکل میں گاندھی ازم اور اس سے پیدا ہونے والے مفادات کے لئے ایک بہت بڑا خطرہ دیکھا اس لئے وہ انہیں دور پھینک دینا چاہتے تھے۔ گاندھی ازم کے کٹر پیروکاروں کے مطابق کسی کو اس وقت تک کانگریس میں جگہ نہیں ملنی چاہئے تھی جب تک کہ وہ گاندھی جی کا مقلد نہ ہو۔ صرف گاندھیانہ خیالات کو اظہار کی اجازت تھی۔ کانگریس میں مسز اینی بینسٹ' محمد علی جناح اور سبھاش بوس جیسے افراد کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

۲۴ اکتوبر ۱۹۴۰ء کو جیل ہی سے ایک مزید خط میں سبھاش نے لکھا۔

گاندھی ازم کا آخری دور مع اپنی پارسائی کی منافقانہ نمائش کے ----- جمہوریت پر اس کا اشتعال اور سیاسی خرابیوں کے لئے اس کا عجیب و غریب اور ناقابل فہم فارمولا ----- آخری حد تک ناقابل برداشت ہے۔ آدمی حیران ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے لئے کون بڑا خطرہ ہے۔ ----- انگریز نوکر شاہی یا گاندھی کے مقلدوں کی تنظیم -----"

جنوری ۱۹۴۱ء کے وسط میں ہندوستان سے غائب ہو جانے سے پہلے یہ نیتاجی سبھاش چندر بوس کا گاندھی' گاندھی ازم اور کانگریس ہائی کمان کے متعلق آخری فیصلہ تھا۔ کانگریس کی سیاست کو گاندھی ازم سے لاحق ہونے والی بیماریوں کا طبی تجزیہ کرنے کے بعد سبھاش نے مندرجہ ذیل مشاہدہ کیا جسے کوئی پیمبرانہ پیشگوئی بھی کہہ سکتا ہے۔

"وہ دن دور نہیں جب گاندھی ازم کا یہ برانڈ بے نقاب ہو جائے گا۔

(کراس روڈز، صفحہ ۳۲۱)

غالباً وہ وقت آگیا ہے کہ گاندھی جی کی غیر مشروط ہیرو ورشپ ترک کر دی جائے گاندھی ازم کے ہر دور کی کڑی، غیر جانبدارانہ اور معروضی تحقیق کی جائے تاکہ مستقبل کے لئے سیدھا راستہ ڈھونڈا جا سکے۔

اختتامیہ

ہندوستان، پاکستان اور دنیا

پرانے ہندوستان سے ایک علیحدہ، خود مختار مسلم ریاست کے کٹ کر جدا ہونے سے کسی بھی ملک کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ پاکستان کے قیام سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا۔ گزشتہ ۱۸ برس سے دونوں ملک ایک دوسرے کے خلاف جنگجوانہ رویہ اپنائے ہوئے تھے۔ اور قرض لی ہوئی رقم سے گولہ بارود اور اسلحہ خرید رہے تھے۔ ----- وہ رقم جو بصورت دیگر عوام کا معیار زندگی بلند کرنے پر صرف ہو سکتی تھی بالاخر اگست ستمبر ۱۹۶۵ء میں دونوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ اس جنگ کا واحد نظر آنے والا نتیجہ دونوں طرف بھاری جانی نقصان ہے جب کہ ابھی تک کسی بھی ملک میں یہ جنگی ہسٹریا ختم ہونے کے آثار نظر نہیں آرہے۔

پاکستان اور ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کی خاطر، ملک کے تحفظ اور دفاع کی خاطر اور امن وامان کی خاطر یہ ضروری ہے کہ تقسیم میں کچھ ردوبدل کی جائے۔ اس ردو بدل کی صورت وفاقی ہو یا نیم وفاقی اس کا فیصلہ کچھ ٹھہر کر ہو سکتا ہے لیکن سب سے پہلے متحد ہونے کی خواہش لازماً پیدا کی جانی چاہئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت اور تلخی ختم کرنے کے لئے مساعی کی جانی چاہئیں۔ ایک دوسرے پر پاکستان کے قیام میں حصے کا الزام لگانے سے احتراز کرنا چاہئے۔ دونوں فریقوں کو تسلیم کرنا چاہئے کہ دونوں کم و بیش برابر مورد الزام ہیں اور دونوں کو پچھتاوے کا احساس ہونا چاہئے۔

یہ سوچنا ایک غلطی ہے کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کا ہے۔ ہندوستان ہر اس شخص کا ملک ہے جو اسے اپنی مادر وطن سمجھتا ہے۔ اور جس نے خود کو اس کی کاز کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ ہندوستان کی پوری تاریخ تہذیبوں، نسلوں اور فرقوں کے ادغام کی تاریخ ہے۔ لوگوں کے لاتعداد گروہ غیر ممالک سے یہاں آئے، ہندوستان میں بس گئے اور

ہندوستان نے انہیں جذب کر لیا۔ انہوں نے ملک پر اپنے اثرات مرتب کئے اور بالآخر اس ملک کو اپنا گھر بنا لیا۔

کثرت میں وحدت ہندوستان کی روح رہی ہے۔ ہندو مذہب خود بھی اسی نکتے کی تشریح ہے۔ اس مذہب کے اندر ویدانت میں زندگی کا ارفع اور بلند ترین پہلو بھی نظر آتا ہے اور توہم پرستی اور بت پرستی کے گھٹیا ترین مظاہر بھی ملتے ہیں۔ اس میں کسی پر اپنے مذہبی اعتقادات بدلنے کے لئے جبر نہیں کیا جاتا۔ وہ مذہبی سزائیں جو یورپی عیسائیت کے اولین ایام میں اس قدر عام تھیں اور مختلف قسم کی سرکاری مذہبی تحقیقات کا دور دورہ تھا ہندومت میں ان میں نام و نشان تک نہیں ملتا۔ ابتدائی ادوار سے ہندوستان نے مختلف مذہبی عقائد کے افراد کو اپنے ساحلوں پر خوش آمدید کہا ہے۔ چنانچہ ہمیں شامی عیسائی اور پارسی اپنے آبائی وطنوں میں مذہبی سزاؤں کے خوف سے ہندوستان میں پناہ تلاش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تنگ نظر قوم پرستی کی بجائے اخلاقاً اور جائز حق کے تحت وہ ہندوستانی ہیں اور ہندوؤں کے ساتھ ساتھ ہندوستان ان کی بھی مادر وطن ہے۔ جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر روح ہندوستان کو اولین ایام سے ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو یہ "رواداری" ہے۔ ہر مذہبی نظریے اور ہر قسم کے لوگوں کے لئے رواداری اور برداشت۔

اگر کوئی ایک کتاب ہندوستان کی روح کی مظہر ہے تو وہ بھگوت گیتا ہے۔ اس کتاب کا نچوڑ آفاقیت ہے اور یہ اس تصور پر استوار ہے کہ انسانیت ایک اور ناقابل تقسیم ہے۔ اس میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے جس سے کوئی عیسائی، مسلمان یا بدھ متنفّی ہو۔ انسان پرستی گیتا کا مذہب ہے اور یہ پیشن گوئی کرتی ہے کہ ایک دن انسانیت ایک مکمل کل ہو گی۔ انسانیت کے زندہ رہنے اور اپنی طے کردہ منزل تکمیل کی راہ پر گامزن ہونے کے لئے امن و امان کا قائم رہنا ضروری ہے۔ امن و امان صرف مضبوط ہاتھوں سے قائم رکھا جا سکتا ہے جن میں سماجی انصاف کا شعور سمویا ہو۔ مہا بھارت کے دور میں کوروؤں کا راج زوال پذیر ہو کر

ظالموں کے ایسے راج میں تبدیل ہو رہا تھا جہاں خواتین کی عصمت کا احترام بھی باقی نہیں رہا تھا۔ اس کی مثال خود راج سبھا کے اندر دروپدی کی بے حرمتی کی کوشش سے ملتی ہے۔ ہندو صحیفے کے مطابق اس وقت وشنو کے اوتار اور دنیا کو قائم رکھنے والے سری کرشن نے انسانی شکل میں جنم لیا تھا تاکہ دھرم کے مقصد یعنی قانون کی حکمرانی کا علم بلند کریں۔

کرشن نے کھشتری شہزادے ارجن کا انتخاب، غلط کاروں کی تباہی کے مقصد سے کیا لیکن یکلخت ارجن میں نرم انسانی خصوصیات پیدا ہو گئیں اور وہ خونریزی سے گریز کا خواہاں ہو گیا۔ پھر کرشن اپنے احکامات کے ساتھ وارد ہوئے، اس مقصد کے پیش نظر کہ انسانیت اپنی منزل تکمیل پر پہنچ سکے یہ ضروری ہے کہ غلط کاروں کو امن و امان، قانون اور ہم آہنگی کی بقاء کی خاطر بے رحمی سے تلف کر دیا جائے۔ اس کے بعد انہوں نے حوصلہ مندی، مضبوطی اور جرات جیسے اوصاف کی توصیف کی جو انسانیت کی ترقی کی لازمی ضرورت ہیں۔ اپنے اندر ہمت، حوصلہ اور مضبوطی پیدا کرو اور پھر انہیں راہ خداوندی میں پیش کر دو ---- یہی بھگوت گیتا کی تعلیم ہے۔

یہ قانون فطرت ہے کہ توانائی کے بہاؤ کی سمت زیادہ سے کم توانائی کی جانب ہوتی ہے۔ جب کبھی کسی ملک پر کہیں باہر سے حملہ ہوتا ہے یا جب کبھی کسی ملک پر غیر ملکی قبضہ کر لیتے ہیں تو اس سے یہی اشارہ ملتا ہے کہ کسی وجہ سے یہ ملک کمزور ہو گیا تھا یا کمزور کر دیا گیا تھا اور اسے تازہ دم توانائی کی کمک درکار ہے۔ تاریخ میں اس طرح کے شواہد ملتے ہیں کہ یہ تازہ توانائی ایک نئے رہنما کے ابھرنے سے فراہم ہوتی ہے۔ لیکن اگر ملک ایسا عظیم رہنما پیدا کرنے میں ناکام رہے تو پھر اس ملک کا کچھ عرصے کے لئے غیر ملکی حکمرانوں کے تسلط میں جانا لازمی ہوتا ہے۔ لیکن جب یہ غیر ملکی حکمران ملک کے عوام کے ساتھ یکجان ہونے میں ناکام ہو جاتے ہیں تو انہیں کچھ عرصے بعد وہ ملک چھوڑنا پڑتا ہے جیسے رومنوں کو مختصر عرصے کے لئے برطانیہ پر حکومت کرنے کے بعد یہاں سے رخصت

ہونا پڑا تھا۔ لیکن بصورت دیگر اگر حملہ آور اس سرزمین پر بس جائیں اور مقامی باشندوں کے ساتھ گھل مل جائیں تو وقت کے ساتھ ساتھ وہ فرزندان زمین بن جاتے ہیں جس طرح نارمن فاتحین مقامی برطانوی عوام کے ساتھ مل کر ایک ہو گئے۔ ہندوستان میں بھی ابتدائی آریائی حملہ آور دراوڑوں اور ہندوستان کے دیگر مقامی باشندوں کے ساتھ شیر و شکر ہو گئے۔

فطرت کی خواہش یہی ہے کہ ہندوستان ایک جغرافیائی وحدت ہونے کے ساتھ ساتھ پوری دنیا کا مختصر نمائندہ بھی رہے ----- یعنی وحدت میں کثرت پرانے ہندوستان کی جغرافیائی وحدت تمام اطراف میں اس کی قدرتی حدود سے ظاہر ہوتی ہے۔ شمال میں عظیم باپ ہمالیہ اور دیگر اطراف میں سمندر' دنیا کے کسی حصے میں فطرت نے کسی علاقے کی خود اس طرح حد بندی نہیں کی جیسی کہ ہندوستان کو ایک خطہ بنانے میں کی گئی ہے۔ دوسری جانب یہ آب و ہوا' بشریات' ارضیات' نباتات اور معدنیات کے حوالے سے پوری دنیا کا مختصر عکاس ہے۔ حتیٰ کہ مذہب کے میدان میں بھی' ہندومت کی وسیع چھتری کے تلے یہاں سماجی ارتقاء کے مختلف مراحل سے تعلق رکھنے والے افراد' نسلیں اور تہذیبیں اپنی متنوع زبانوں' اطوار' رسومات' رواجات اور ثقافتوں کے ہمراہ موجود ہیں۔ فطرت نے ہندوستان کو عظیم مقام سے نوازنا چاہا اور اس تقدیر ازل کو پورا کرنے کے لئے اسلام آیا۔ مسلمانوں کے حملے کے موقع پر ہندوستان بہت کمزور ہو چکا تھا اور متعدد چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ تاریخ طے شدہ راستہ طے کرتی ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ فطرت نے ہندوستان کو ایک وحدت بنایا تھا۔ چنانچہ ہند کی ابدی تقدیر کی پہلی ضرورت یہ تھی کہ ہندوستان کو ایک سیاسی وحدت ہونا چاہئے۔ لہٰذا یہ ایک تاریخی ضرورت تھی کہ وہ لاتعداد چھوٹی چھوٹی ریاستیں جن میں ہند بٹا ہوا تھا انہیں لازماً اکٹھا کر کے ایک طاقتور مکمل ہندوستان تشکیل دیا جائے۔ ہندو حکمرانوں میں ایسا کوئی نہیں تھا جس میں ہندوستانی وحدت کی خاطر جراتمندانہ اقدامات کرنے کی بصیرت یا ہمت ہوتی چنانچہ

ہندوستان کے مقدر کو کچھ جری غیر ملکی لوگ درکار تھے جو آتے اور ہندوستان کو ایک کرنے کا بیڑہ اٹھاتے۔کسی بھی فرد کا کسی ملک یا سرزمین پر طے شدہ حق نہیں ہوتا۔ قدرت جس نے ہندوستان کو ہر قسم کے تنوع سے نوازا تھا یہ نہیں چاہتی تھی کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کی ملکیت رہے خواہ وہ کتنا ہی کمزور' ناتواں اور نا اہل کیوں نہ ہو جب باہر سے مسلمان حکمران حملہ آور بن کر ہندوستان آئے تو وہ ہندوستان کی روح کی اندرونی پکار کا جواب بن کر آئے تاکہ ان لاتعداد ریاستوں کو اکٹھا کر کے ایک طاقتور کل بنایا جا سکے جن میں ہندوستان منقسم تھا۔ علاؤ الدین خلجی اور اس کے کچھ جانشین جو شمالی ہند کو فتح کرنے کے بعد جنوب میں داخل ہو گئے' محض ہندوستان کی تقدیر ازل کے مہرے تھے۔ یہی بات اس کردار کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے جو عظیم مغل شہنشاہ اکبر نے ادا کیا۔ اسلام پہلے ایک حملہ آور قوت بن کر آیا لیکن بعد ازاں اس ملک کا جزو لاینفک بن گیا۔ بعد میں فروغ پانے والی ہندو مسلم ثقافت نے ہندوستان کی پوری زندگی کو زرخیز بنایا۔ اس نے عوام کو بے کار تیاگی ریاضتوں اور نفی ذات کے رجحان سے ہٹا کر ایک نئی راہ حیات دکھائی۔ جس سے معیار زندگی بلند ہونے لگا۔ نئے حکمرانوں کی حوصلہ افزائی سے فروغ پانے والی معاشی فراوانی اور مسرت نے اپنا اظہار فن تعمیر' نئے شہروں' بلند و بالا عمارتوں' مقابر' مصوری' موسیقی' لذیذ غذاؤں' ملبوسات حتیٰ کہ مذہب اور فلسفے میں بھی کیا۔ اسلام پر ہندوستان کے قرض کا اس سے زائد اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ ہندوؤں میں ذات پات کی تقسیم میں نچلے طبقے کے عوام نے جو بالادست طبقات کے مفادات کے ہاتھوں ناقابل بیان مصائب جھیل رہے تھے اسلام قبول کر کے سکھ پایا جو تمام انسانوں کو اخوت اور مساوات کا درس دیتا ہے۔

سولہویں صدی سے آگے جب وہ دور شروع ہوا جسے یورپی تاریخ میں احیائے علوم کا دور کہا جاتا ہے' مغرب کے مفکرین نے خود کو فطرت کی طاقتوں کا مطالعہ کرنے کے لئے وقف کر دیا جس کے نتیجے میں سائنسی ترقی اور تکنیکی معلومات میں اضافہ ہوا۔ اس دور میں

ایشیاء اور افریقہ مذہب اور ابہام پرستی پر ہی قانع رہے اور انہوں نے سائنسی علم کی طرف کسی جھکاؤ کا اظہار نہیں کیا۔ علم طاقت ہے نئے سائنسی علوم نے یورپی اقوام کو نئی طاقت دی اور انہوں نے دنیا کو فتح کرنے کی مہم جوئی شروع کر دی پہلے اس کے لئے انہوں نے اپنی مصنوعات کی نئی منڈیاں تلاش کیں اور بعد ازاں نو آبادیاتی ایمپائرز قائم کرنے لگے۔ اس طرح پوری دنیا مختلف یورپی طاقتوں کے مغرور قدموں میں گر گئی۔ یہ سب کچھ اس قانون فطرت کے مطابق تھا کہ توانائی کے بہاؤ کی سمت زیادہ سے کم کی طرف ہوتی ہے۔ قسمت چاہتی تھی کہ افریقہ اور ایشیاء تاریک ادوار میں ہمیشہ نہ رہیں اور وہ نو آبادیاتی نظام کے درمیانی مرحلے کے ذریعے ایک بلند تر معیار زندگی سے ہمکنار ہوں۔ یہ نو آبادیاتی نظام بہرطور ایک عبوری دور تھا۔ یہ بلاشبہ ایشیائیوں اور افریقیوں کی بدنصیبی تھی لیکن یہ سب کچھ کرما کے ابدی قانون کے عین مطابق تھا جو کہتا ہے کہ جو تم بوؤ گے وہی کاٹو گے۔ تاریخ کے پیچھے فلسفہ ہوتا ہے۔ خدا نے علم کو انسانی مشکلات کے خاتمے کے لئے پیدا کیا تھا لیکن اقوام یورپ نے اسے اپنی طاقت میں اضافے کے لئے استعمال کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوٹ کے مال کے لئے چوروں کے درمیان باہمی جنگ شروع ہو گئی۔ قدرت کا مقصود تھا کہ طاقت کے پیچھے پاگل ہونے والی اقوام یورپ کی غارتگر جنگوں کے نتیجے میں افریقہ اور ایشیاء آزادی حاصل کریں۔ جس قدر انکسار کے ساتھ ہم تاریخ کا مطالعہ کریں اسی قدر ہمیں محسوس ہو گا کہ فطرت میں ہمیشہ ایک اخلاقی قوت کارفرما رہی ہے جسے ایک طاقت کے لئے دیوانی قوم صرف اپنے خطرے اور تباہی کی قیمت پر نظرانداز کر سکتی ہے۔

فطرت کے اٹل قانون کے فرمودات کے مطابق' انگریز جو یورپ کی سب سے ترقی یافتہ طاقت تھے شدید تاریخی لزوم کے تحت ہندوستان آئے۔ ان کی آمد کے دو مقاصد تھے۔ اول ہندوستان کو ایک وحدت میں یکجا کرنا۔ دوم۔ اسے جہالت اور ابہام پرستی کے جمود سے نکال کر جدید سائنسی علوم کی متحرک رو میں شامل کرنا۔ اپنی تمام خامیوں کے

باوصف انگریز راج نے ہندوستان کو ان گنت فوائد عطا کئے۔ اس نے ہمیں قانون اور قانونی کارروائیوں کا بہترین نظام فراہم کیا' عمدہ انتظامی نظام مہیا کیا اور سول سرونٹس کا شاندار نظام دیا۔ اس کا عظیم ترین تحفہ انگریزی زبان ہے جس نے ہندوستان کو وحدت میں یکجا کرنے میں طاقتور عامل کا کردار ادا کیا۔ ہندوستان کے ہر کونے سے انگریزی زبان بولنے والے افراد کی نفسیاتی وحدت نے آزادی کی اجتماعی خواہش کو جنم دیا۔ انگریز مفکرین اور انسان پرستی کے مغربی تصورات سے ہندوستان میں آزادی اور خود مختاری کا تصور پیدا ہوا۔ انگریزی کو ہندوستان کی دوسری مقدس زبان کا مرتبہ دیا جانا چاہئے کیونکہ اس نے ہم پر سائنسی اور انسانی علوم کے بھرپور خزانوں کے در وا کئے جنھوں نے تعلیم یافتہ ہندوستان کے ذہن کو بے حد زرخیز کیا۔

اسلام اور انگریز اس جدلیاتی عمل کے نتیجے میں ہندوستان آئے جو انسانی ترقی کے لئے فطرت میں رکے بغیر جاری رہتا ہے۔ فطرت کو ہندومت' اسلام یا عیسائیت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا بلکہ اس کا تعلق صحت' طاقت اور کارکردگی کی تخلیق سے ہوتا ہے جو انسانی ترقی کے لازمی اجزائے ترکیبی ہیں۔ اسلام کی طاقت اور انگریزوں کی کارکردگی دونوں ہندوستان کے لئے ضروری تھیں کیونکہ اس کے مقامی باشندے قدرت کی ان ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتے تھے۔ جو ہندوستان کی ترقی کے لئے لازمی تھیں۔ فطرت کی خواہش تھی کہ ہندوستان لازماً ترقی کرے اور اس مکمل ایک دنیا کا حصہ بنے جس کا عالمی تحریک کے نتیجے میں وجود پذیر ہونا ناگزیر ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی بلاشبہ اس تصور کی طرف اشارہ کر رہی ہیں کہ دنیا ایک اور انسانیت ناقابل تقسیم ہے لیکن وحدت کے ڈھانچے کے اندر کثرت کی گنجائش موجود ہے۔ جس قدر جلد انسان کی اخلاقی حس اس تصور کے عملی مضمرات کو سمجھ لے اسی قدر یہ انسانیت کے لئے بہتر ہے۔ انسانی ترقی کے ایک مرحلے پر قوم پرستی ایک ضرورت ہے لیکن وہ وقت جلد آنے والا ہے جب قوم پرستی کے تصور کو بین الاقوامیت میں لازماً مدغم ہونا ہو گا۔ مشرق وسطیٰ میں ہم دیکھتے ہیں کہ جنگ

عظیم اول اور خلافت کے خاتمے کے بعد اسلام کا جنون آہستہ آہستہ کم ہونے لگا۔ یہاں پر نوجوان ترکوں اور مصطفیٰ کمال پاشا نے راستہ دکھایا۔ وہ وقت بھی آنے والا ہے جب یہ معاملہ نہایت معمولی سیاسی حیثیت کا حامل ہو گا کہ آیا کوئی شخص مسلمان ہے، ہندو یا عیسائی ہے۔ حقیقی عالمی مذہب اس وقت آئے گا جب ہم سب پر یہ نزول ہو گا کہ "میں اپنے بھائی کا رکھوالا ہوں" سائنس اور ٹیکنالوجی بھی ہمیں اخلاقی حس کی طرح یہی بنیادی صداقت سکھانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اگر ہم صرف نوائے فطرت پر توجہ دیں (تو یہ ہم پر واضح ہو جائے گا) جب ایک مرتبہ ہم اس حقیقت کو جان لیں تو تلخی، نفرت، جنگ اور بدامنی ختم ہو جائے گی۔ یہ محض بے کار خواب نہیں ہے۔ ہائیڈروجن بم، میگاٹن بم اور نیوکلیر فزکس کے دیگر ہتھیار وہ عارضی برائیاں ہیں جن کے ذریعے مستقل امن وقوع پذیر ہو گا کیوں کہ فطرت میں جدلیاتی عمل کے ذریعے جدلیاتی ترقی کا یہی طریقہ ہے۔ سائنسی ترقی دنیا کو تباہ نہیں کرے گی بلکہ مشترکہ انسانیت اور انسانی اخوت کے قیام میں ممد معاون ہو گی۔ ایک وفاقی نوعیت کی عالمی حکومت قائم ہو گی کیونکہ وحدت میں کثرت، قدرت کا اساسی قانون ہے۔ قانون ایک نئی شکل اختیار کرے گا اور بین الاقوامی قانون دنیا پر حکومت کرے گا۔

اگر مستقبل کی سیاسی ترقی کا ناگزیر رجحان یہ ہو گا تو ہم ابھی سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو اور ہندوستان اور پاکستان کو قریب لانے کی کوشش کیوں نہ شروع کر دیں۔ دونوں سوال ایک دوسرے سے اس طرح ملحق اور منسلک ہیں کہ جب تک دونوں کو اکٹھے حل کرنے کی کوشش نہ کی گئی یہ حل نہیں ہوں گے۔ خود ہندوستان میں ہندو، مسلم مسئلہ اس وقت تک حل نہیں ہو گا جب تک کہ ہندوستان اور پاکستان ایک فیڈرل (وفاقی) یا کنفیڈرل (نیم وفاقی) اتحاد میں قریب نہیں آتے۔ اس کے بعد ان کی متحدہ آواز عالمی سیاست میں ایک بالادست قوت ہو گی۔ کونسل آف نیشنز میں ان کی متحدہ آواز امریکہ اور روس سے کم طاقتور نہیں ہو گی ----- نہیں بلکہ یہ زیادہ طاقتور ثابت ہو سکتی ہے کیونکہ

اگر یہ مناسب دانشمندی سے کام لیں تو یقیناً پورا جنوبی ایشیاء اِن کے پیچھے ہو گا۔ یہ پاکستان اور ہندوستان کا تابناک مستقبل ہو گا۔ یہاں پاکستان اور ہندوستان کے پاس یہ موقع موجود ہے کہ وہ ایشیاء اور دنیا کی قیادت کریں۔

فہرست مطبوعات

- کیا پاکستان بھٹو نے توڑا؟ — وسیم گوہر — 250
- پاکستان ٹوٹنے کی کہانی — لیو روز رچرڈ سیشن/وسیم گوہر — 110
- سیاست سے مکالمہ — وسیم گوہر — 150
- بھٹو اور نیا پاکستان — وسیم گوہر — زیر طبع
- جناح اور گاندھی — ایس کے موجدار/ثوبیہ طاہر — 195
- پاکستان کی سیاست اور عوام — ڈاکٹر مہدی حسن — 160
- پاکستان کی سیاسی جماعتیں — ڈاکٹر مہدی حسن — زیر طبع
- مہاجر قومی موومنٹ — احمد سلیم — 300
- اسمبلیاں، احتساب اور عدلیہ — احمد سلیم — زیر طبع
- کیہہ جاناں میں کون (کہانیاں) — پروین ملک — 100
- غزال (شاعرات کے کلام سے انتخاب) — عرفان صادق — 85
- خواب زندہ رہتے ہیں (شاعری) — عرفان صادق — زیر طبع
- استاد دامن (شاعری تے شخصیت) — کنول مشتاق — 95
- غزل ۶۹۵ (انتخاب) — قائم نقوی — 90
- فیض سے فرحت شاہ تک — اختر شمار — 100
- نسوانی آوازیں (خواتین کی شاہکار کہانیوں کا انتخاب) — ڈاکٹر مرزا حامد بیگ — 225
- پل ایمی (ناول) — مولییاں/ساجد اقبال — 95
- تتلیاں تے ٹینک (ناولٹ) — احمد سلیم — 80

○ چیخوف کی کہانیاں اور ناولٹ — انتون چیخوف / منظر سلیم — 195

○ گوریوں کا دیس (سفرنامہ انگلستان) — 300

علی سفیان آفاقی

○ نیل کنارے (قاہرہ کا سفرنامہ) — زیرِ طبع

علی سفیان آفاقی

○ رومان اور قتل — ازہر منیر — زیرِ طبع

○ چاند چہرے (فلمی ساحراؤں کی سنہری اور دلچسپ یادیں) — 225

علی سفیان آفاقی

○ فلمی الف لیلیٰ — علی سفیان آفاقی — زیرِ طبع

○ لتا منگیشکر (زندگی نامہ) — ہریش بھامانی / اظہر جعفری — 150

○ PLATO TO MARKS — عطیہ سیّد — زیرِ طبع

سارنگ پبلیکیشنز

الاکو مینشن پٹیالہ گراؤنڈ لاہور

فون 7220962

ہماری کتابیں

(سیاست و تاریخ)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
1	کیا پاکستان بھٹو نے توڑا؟	وسیم گوہر	250/
2	پاکستان ٹوٹنے کی کہانی	لیو روز رچرڈ سیشن وسیم گوہر	110/
3	سیاست سے مکالمہ	وسیم گوہر	150/
4-	بھٹو اور نیا پاکستان	وسیم گوہر	(زیر طبع)
5	جناح اور گاندھی	ایس کے مو جمدار ثوبیہ طاہر	175/
6	آزادیٔ اظہار	ڈاکٹر مہدی حسن	(زیر طبع)
7	مہاجر قومی موومنٹ		
.	(تشکیل اور جدوجہد' دستاویزی حقائق)	احمد سلیم	250/

(ادب)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
1	کیہہ جاناں میں کون (کہانیاں)	پروین ملک	100/
2	غزال (شاعرات کے کلام سے انتخاب)	عرفان صادق	85/
3	استاد دامن (شخصیت تے شاعری)	کنول مشتاق	95/
4	غزل 95ء (انتخاب)	قائم نقوی	90/
5	نسوانی آوازیں		
.	(خواتین کی شاہکار کہانیوں کا انتخاب)	ڈاکٹر حامد بیگ	190/
6	بل ایمی (ناول)	موپساں / ساجد اقبال	(زیر طبع)
7	چیخوف کی کہانیاں اور ناولٹ	انتون چیخوف / منظر سلیم	175/
8	گوریوں کا دیس (سفرنامہ انگلستان)	علی سفیان آفاقی	200/

(شخصی اور سوانحی خاکے)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
9	چاند چہرے (فلمی ساحراؤں		
.	کی سنہری اور دلچسپ یادیں)	علی سفیان آفاقی	150/
10	لتا منگیشکر	ہریش بھامانی / اظہر جعفری	(زیر طبع)

الاکو منیشن پٹیالہ گراؤنڈ ــــــ لاہور